

از قلم پلوشہ صافی

NOVEL BANK

بکھرے رشتے

بکھرے رشتے

از قلم پلوشہ صافی

مکمل ناول

ناول بینک ویب پر شائع ہونے والے تمام ناولز کے جملہ و حقوق بمعہ مصنفہ کے نام محفوظ ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔ اگر آپ اپنی تحریر ناول بینک پر شائع کروانا چاہتے ہیں تو اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں سینڈ کر دیں۔ آپ کی تحریر ناول بینک ویب پر شائع کر دی جائے گی۔

E-mail : pdfnovelbank@gmail.com

WhatsApp : 92 306 1756508

ناول بینک انتظامیہ

وہ تاریک رات میں گھنے جنگل کے بیچ تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ جنگل کے ہولناک آوازوں نے اس کے اوسان خطا کر رکھے تھے وہ بار بار پیچے دیکھتا چلا رہا تھا خوف و ہراس کی وجہ سے پسینے سے شرابور بھاگتا ہوا وہ کسی کھائی میں گرنے لگا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ حواس باختہ سا اس پاس دیکھا تو وہ کسی جنگل میں نہیں اپنے نرم بستر پر تھا۔ ہاتھ بڑھا کر نائٹ لیمپ لگایا۔ اس کے وسیع کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ ڈر کے مارے اب بھی اس کی حالت غیر ہو رہی تھی سر سے پیر تک وہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا ہاتھ پاؤں میں لرزش سی طاری ہوئی تھی۔ بے ترتیب دھڑکنوں سے اسے گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے لمبی لمبی سانس لی۔ چہرے پر سے پسینہ صاف کر کے خود کو کمپوز کیا اور ننگے پیر لکڑی سے بنے کمرے کے فرش پر چلتے ہوئے کھڑکی تک آیا اور پھٹ کھول کر تازہ ہوا لینے کھڑا ہو گیا۔

عموماً یہ خواب اسے تب آتا جب وہ بہت زیادہ پریشان ہوتا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی یہ خواب اسے کافی بے چین اور مضطرب کر گیا تھا۔ بچپن سے اب تک وہ یہ خواب کتنی مرتبہ دیکھ چکا تھا یہ گنتی سے بالاتر ہو چلا تھا۔ وہ رات کا آخری پہر تھا آسمان کی تاریکی اب بھی برقرار

تھی۔ ہر جاندار اس لمحے نیند کی آغوش میں پڑا ہوا تھا۔ صرف دور کہی سے آتی کتوں کی بھونکنے کی آواز فضاء کی خاموشی کو موثر کر رہی تھی۔ موسم بہار کی آمد تھی اور اس پہر ماحول کی خنکی کا احساس بھی زیادہ ہو رہا تھا۔ کچھ ہوش سنبھال لینے کے بعد وہ سست روی سے کھڑکی پر سے ہٹا۔

بھاری قدموں سے چلتا وہ واشروم میں گھسا اور شاور کے ٹھنڈی بو چھاڑ میں کھڑا ہو گیا۔ دس سے پندرہ منٹ بعد وہ نہا کر نکلا۔ دیوار پر لگی کلاک پر وقت دیکھا تو ابھی فجر شروع ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اس نے بلیک کلر کے ٹریک ٹراؤزر کے ساتھ بلیو کلر کی ٹی شرٹ پہنی۔ اپنے پسندیدہ سپورٹس شوز پہن کر تسمے باندھے پھر ورزش کرنے کی نیت سے گھر سے باہر نکل کر سڑک پر دوڑنے لگا۔



سردیوں کی تعطیلات کے بعد آج ان کی یونیورسٹی کا پہلا دن تھا۔ وہ بی کام کے دوسرے سال کا آغاز کرنے جا رہی تھی۔ تین مہینوں کی چھٹیاں گزار کر آج اسے یونیورسٹی کے لیے صبح سویرے اٹھنے میں دشواری پیش ہوئی تھی اس لئے پہنچتے پہنچتے اسے خاصی دیر ہو گئی۔

وہ ابھی ابھی کار سے اتر کر تقریباً بھاگتے ہوئے یونیورسٹی کے گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ گلابی رنگ کا شلوار قمیض زیب تن کئے۔ کندھوں سے نیچے تک آتے گھنے بال کیچر میں جکڑے ہوئے۔ وہ کندھے سے لٹکائیگ اور ہاتھ میں پکڑی کتاب سنبھالتے ہوئے گھڑی کو دیکھ رہی تھی کہ کسی نے تیزی سے پیچے سے آکر اس کے ہاتھ میں سے کتاب اُچک لی۔

اس نے تعجبی نظروں سے اپنے سامنے گھوم کر آکھڑے ہونے والے اس شریر لڑکے کو دیکھا جو اصولاً اس سے ایک سال سینئر تھا۔

"یہ کیا حرکت سے ذیشان۔۔۔۔۔ مجھے پہلے ہی کلاس کے لئے دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔"

بک واپس کرو میری۔" عارفہ نے غصے اور اضطراب کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

قد کاٹ میں ذیشان عارفہ سے لمبا تھا۔ عارفہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کتاب واپس لینی چاہی پر وہ پنچوں کے بل اور اونچا ہو گیا اور کتاب پکڑے ہاتھ کو ہوا میں بلند کر دیا۔ اسے عارفہ کو چھڑانے میں بہت مزا آ رہا تھا وہ ہنستا ہوا کتاب ہوا میں لہرانے لگا۔ عارفہ نے ایک دو مرتبہ ہلکے سے اچھل کر کتاب پکڑنی چاہی لیکن وہ اس کے ہاتھ تک پہنچ نہ سکی۔ منہ بھسورتے ہوئے وہ پھر سے اس سے منت کرنے لگی۔

"ذیشان۔۔۔۔۔ دے بھی دو اب۔۔۔۔۔ کلاس شروع بھی ہو گئی ہوگی۔۔۔۔۔ پہلے دن

پروفیسر سے ڈانٹ پڑاواوگے۔۔۔۔" اس نے تنگ آکر ہارمان لینے والے انداز میں کہا۔

"تم مجھے سلام کئے بغیر کیسے جا رہی تھی۔۔۔۔۔ سینئر کا احترام کرنا بھول گئی ہو کیا۔" ذیشان نے شرارتی انداز میں استخزیہ ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

ذیشان مزاحیہ مزاج کا شیر لڑکا تھا۔ ایم کام کے پہلے سال کا طالب علم تھا۔ اسے اپنے سے
جونیر سٹوڈنٹس کو تنگ کرنے؛ ان کی ٹانگ کھپائی کرنے میں بہت دلچسپی تھی۔ جب عارفہ کا
اس یونیورسٹی میں داخلہ ہوا تب بھی ذیشان نے اسے سٹور روم میں بھوتوں اور روحوں کی
موجودگی کی عجیب و غریب کہانیوں سے خوب ڈرایا تھا اور ایک دن جان بوچ کر اسے سٹور روم
میں بند بھی کر دیا تھا۔ وہ دھڑادھڑ دروازہ بجاتی رہی اور ذیشان ہنسی سے لوٹ پوٹ زمین پر پڑا
رہا۔ وہ چیختی پکارتی رہی جب تک کہ کسی راہ گزرنے والے نے عارفہ کا رونا سن کر سٹور روم کا
دروازہ کھولا۔ اس کے باہر نکلتے ہی ذیشان پیٹ پکڑ کر ہنستے ہوئے وہاں سے بھاگ گیا اور عارفہ
پیر پٹختی روتی شکل لیے کھڑی رہ گئی۔

آج بھی ذیشان اپنی اسی دلچسپی کے چلتے اسے تنگ کرنے ٹپک پڑا تھا۔

"میں نے دیکھا نہیں آپ کو حضور والا۔۔۔۔۔۔ اب جانے بھی دو۔" کلاس مس ہونے کے

تشویش سے ہنا کتاب لیئے بیزاری سے جواب دے کر وہ جانے کے لیے آگے بڑھ گئی مگر

فیشان نے اس کا راستہ روک لیا۔

وہ افف کرتی اپنا بیگ اٹھا کر ذیشان کو مارنے لگی تھی کہ اسی کے سے انداز میں ایک نوجوان

تیزی سے ان کے پاس سے گزرا۔

جب تک ٹھٹک کر ذیشان نے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا عارفہ کی کتاب اس نوجوان لڑکے کے

ہاتھ میں تھی۔ عارفہ چہکتے ہوئے فیضان کے سائیڈ سے گزر کر اس کے سامنے آئی۔ اس

نوجوان نے بغیر کسی پس و پیش کے آرام سے کتاب عارفہ کو تھما دی۔

چڑھنے لگا۔

کے ساتھ عارفہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

طیش میں ذیشان کی سامنے آگئی۔

"دیکھ لو کیا کر دیا۔۔۔۔۔ میری کلاس مس کرادی۔۔۔۔۔ اللہ کریں تم اس سال فیل ہو جاؤ۔" اس نے تپتے ہوئے اسے بددعادی اور پیر پٹختی ہوئی روانہ ہو گئی۔ اسے ذیشان کی وجہ سے اب دوسری کلاس بھی مس نہیں کرنی تھی اس لیے تیز قدموں سے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں چلی گئی۔

جس کے لیے وہ دونوں آمنے سامنے ہوئے۔ وہ وہاں سے جا چکی تھی۔ تو ان دونوں کے پاس ایک دوسرے کے ساتھ بحث و مباحثہ میں پڑنے کا کوئی جواز نہیں رہا اس لیے ذیشان اسی سرد انداز میں اسے گھورتے ہوئے جانے لگا۔

"دوبارہ میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش مت کرنا" جاتے جاتے بھی اس نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔

فیشان نے چند قدم آگے جاتے جاتے اس کی پکار سنی تو مڑ کر ایک غصیلی نظر اس پر ڈال کر ناک پھلاتے ہوئے واپس لمبے لمبے ڈگ بھرتا روانہ ہو گیا۔



"کہاں رہ گئی تھی۔۔۔۔۔ کب سے انتظار کر رہی ہوں۔۔۔۔۔" اس نے دبے لہجے میں غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس کا بازو جھنجھوڑا۔

وہ جو پہلے ہی ذیشان پر غصہ تھی سحر کی ناراضی پر اور منہ بنا گئی۔

"صبح دیر سے آنکھ کھلی۔۔۔۔۔ تیار ہو کر آتے آتے پہلے ہی کافی دیر ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ کہ

نیچے گیٹ کے پاس ذیشان مل گیا اور کتاب چھین کر تنگ کرنے لگا۔۔۔ اسی سے لڑتے

جھگڑتے کلاس مس ہو گئی۔۔۔" وہ معصومیت سے سحر کو اپنے آغازِ صبح کی روداد سنار ہی تھی

اور وہ ہاتھ باندھے ناراض نگاہوں سے اسے دیکھے جارہی تھی۔

"یہ لڑکا کبھی نہیں سدھرنے والا۔" سحر نے سرد مہری سے ذیشان پر تبصرہ کیا۔

اس کا موڈ بگرتا دیکھ کر عارفہ نے گفتگو کا موضوع تبدیل کر دیا۔

"تمہیں پتا ہے۔۔۔۔۔ ایک ہینڈ سم نے ہیر کی طرح آکر۔۔۔۔۔ میرے اور ذیشان کا پھٹا

حل کروایا۔" وہ خوشگوار انداز میں اس نوجوان کے بارے میں بتانے لگی۔

سحر نے آبرو اچکا کر مخطوط ہوتے ہوئے سرتاپیر اپنی چنچل سہیلی کو دیکھا۔

"کون تھا" دوستانہ انداز بحال کرتے ہوئے اس نے عارفہ سے سوال کیا۔

"پتا نہیں لیکن بہت چارمنگ تھا۔۔۔۔۔ میں تو بس اسے دیکھتی رہ گئی۔" عارفہ نے پھر سے

شاویز کو یاد کرتے ہوئے پُر سوچ انداز میں کہا جیسے وہ خود بھی اپنے کہے جملے کی تصدیق کرنا چاہتی ہو۔



وہ کوریڈور میں چلتا ہوا ایک کلاس روم کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک لڑکا بے دھیانی میں چلتے ہوئے اس سے ٹکرا گیا۔

"کیا بات ہے بھئی۔۔۔۔۔ کیوں دروازے پر کھمبے کی طرح کھڑے ہو۔۔۔۔۔" لاریب نے اپنے چھوٹے قد کے آگے اس کا لمبا قد دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔

وہ جو کلاس میں جھانکتے ہوئے سنجیدہ تاثرات بنائے کھڑا تھا کسی حد تک مزاج نرم بناتے ہوئے لاریب کی جانب مڑا۔

"سوری دوست----- میں نیاء آیا ہوں نا----- تو کلاس کنفرم کرنے یہی کھڑا ہو گیا۔" شاویز دفاعی انداز میں گہری براون آنکھوں میں معصومیت بھرا لایا پھر سر اٹھا کر کلاس کے باہری دیوار کو بغور مشاہدہ کرنے لگا جس پر نہ کوئی بورڈ لگا تھا نہ کسی مارکر سے مضمون کی نشاندہی کی گئی تھی۔

"کس کلاس کے ہو-----" لاریب نے دوست بلائے جانے پر غائبانہ خوشی ظاہر کرتے ہوئے اس کی مدد کرنے کو پوچھا۔ مطلوبہ مضمون اور سال کی معلومات فراہم کر کے وہ لاریب کی مدد پر جوش میں آ گیا۔

"پھر تو صحیح جگہ آئے ہو۔۔۔۔۔ یہی کلاس ہے بی کام سیکنڈ ایئر۔۔۔۔۔ آجاو۔۔۔۔۔ میں بھی اسی مچھلی بازار کا حصہ ہوں۔" لاریب نے کلاس سے آتے شور و غل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے پیچھے آنے کا کہا۔

وہ ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ سجائے خوش دلی سے اس کے پیچھے پیچھے کلاس میں داخل ہو گیا۔



ایک گھنٹے تک فلیٹ کے سامنے پارک میں ورزش کرنے کے بعد وہ گھر آیا تو فجر ہو چلی تھی۔
کچھ اذانیں ہو گئی تھی کچھ اکاد کی ہو رہی تھی۔ اس نے شوز اتارے اور وضو کرنے کے ارادے
سے واشروم چلا گیا۔ گیلے سر ہاتھ منہ پیر؛ جب وہ وضو کر کے باہر آیا تو اذانیں پوری طرح تھم
چکی تھی۔ کچھ اس فلیٹ کی بناوٹ اس ترتیب سے کی گئی تھی کہ دروازے کھڑکیاں بند کرنے

"وہ دیکھو۔۔۔۔۔ یہ وہی ہے" عارفہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سحر کے کان میں سرگوشی کے انداز میں بولی۔

سحر نے ایک نظر اس کی نگاہوں کے سمت میں سرسری سادیکھا
"کون" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ارے۔۔۔۔۔ وہی ہیرو۔۔۔۔۔ جس کا میں بتا رہی تھی۔" عارفہ نے چمکتی آنکھوں سے اسے چند منٹ پہلے بتایا قصہ یاد کروایا۔

سحر نے آبرو اٹھا کر اسے دیکھا جیسے یاد آگیا ہو اور پھر سے لڑکوں کے گروپ میں کھڑے اس نوجوان کو مشاہدہ کرنے لگی جو سب سے متعارف ہوتا ہوا مسکرا کر مصافحہ کر رہا تھا۔

لمبا قد چوڑے شانے منظبوط بازو۔ بلیو جینز کے ساتھ سفید شرٹ پہنے۔ کالے بال سائیڈ پر اوپر کی رخ میں جمائے ہوئے۔ نئی تراشی نفیس سی شیور کھے ہوئے۔ لمبی ناک ایک برابر چہرا۔

Visit For More Novels : www.urdu-novelbank.com Page 17
E-mail pdfnovelbank@gmail.com WhatsApp [03061756508](https://wa.me/03061756508)

اعتماد اور مثبت نظری بھی اس کی شخصیت کا حصہ تھی۔ اپنے ماں باپ اور ایک بھائی کے بشمول وہ اپنے ساری فیملی اور فرینڈز کی چہیتی تھی۔

عارفہ کے بہ نسبت سحر کم گوپڑھائی میں تیز۔ اپنے آپ میں رہنے والی۔ جلدی کسی سے نہ گھلتی
ملتی محتاط سی شخصیت تھی۔ قد و قامت میں وہ عارفہ جیسی ہی تھی جبکہ رنگت میں کچھ سفیدی
مانل تھی۔ اس کا خاموش اور سنجیدہ مزاج دیکھتے ہوئے اس کی بہت مختصر سی فرینڈ لسٹ تھی۔
سحر کی سب سے زیادہ صرف عارفہ سے دوستی تھی جو اس کے ہر سکھ دکھ کی سا تھی۔ اس کے
دل کی ہر گہرائیوں کی ہم شریک اور ہمراز تھی۔

عارفہ اور سحر دونوں ہی شہر کے بڑے مانوس خاندانوں میں سے تھی۔ دونوں 8 سال کی عمر سے بیسٹ فرینڈز تھی۔ پہلے سکول پھر کالج اور اب یونیورسٹی ہر میدان میں وہ ساتھ ساتھ ہوتی پھر چاہے وہ تعلیمی میدان ہو تا یا کھیل کا۔ بغیر کسی حسد اور جلن کے دونوں ایک دوسرے کو بہت پیار کرتی ساتھ دیتی حوصلہ افزائی کرتی۔ نہ عارفہ کی کوئی سگی بہن تھی اور نہ سحر کی اس لیے ان

دونوں نے ایک دوسرے کو ہی اپنی بہن بنا رکھا تھا۔ جس حد تک پیار تھا اتنا ہی کبھی کبھی تکرار بھی ہو جاتی لیکن زیادہ سے زیادہ ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ ناراض نہ رہ پاتی۔ ان کی اس نوک جو کبھی بھری پکی دوستی کے چلتے دونوں فیملیز کے بھی اچھے تعلقات تھے۔ آنا جانا زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ساتھ دینا۔ عارفہ اور سحر کے گھر بھی قریب تھے گلی کے ایک کنارے سحر کا گھر اور دوسرے کنارے عارفہ کا گھر۔ زندگی حسین اور خوشیوں بھری اپنے سفر پر رواں دواں تھی۔



وہ سب سے متعارف ہونے کے بعد کلاس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے چار و سمت نظریں گھما کر دیکھنے لگا۔ اسی طرح تسلی سے آس پاس دیکھتے ہوئے اس کی پہلی قطار میں دوسری لڑکیوں کے مجموعے کے بچ بیٹھی عارفہ پر نظر پڑی۔

چونکہ شاویز اسے خود کو دیکھتا محسوس کر چکا تھا اس لیے عارفہ نے نظریں نہیں جھکائی اور مروتی کا مظاہرہ کرتی رسائیت سے مسکرا دی۔ شاویز بھی اخلاقی طور پر جواب میں محتاط انداز میں مسکرا دیا اور جلدی سے رخ موڑ کر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ وہ پہلے ہی دن کوئی غیر مقدم تاثر دے کر کلاس میٹس پر غلط امپریشن نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر میں دوسرے ہاور کی گھنٹی بجی تو سب سیدھے ہو کر ترتیب سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پروفیسر اندر داخل ہوئے اور لیکچر کا آغاز ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹہ کلاس لے لینے کے بعد ان کی تفریح کا وقت تھا۔ سب اپنا ضروری سامان اٹھاتے ہوئے کلاس سے جانے لگے۔ شاویز کی آج پہلے دن صرف لاریب سے ہی دوستی ہو سکی تھی اور باقی سب سے برائے نام نیو ایڈمیشن کے طور پر متعارف ہوا تھا۔

---excuse me! "اسے باہر جاتا دیکھ کر عارفہ نے بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔

جو پہلی نظر میں اس کے دل میں گھر کر گیا تھا اس سے دوستی کرنے؛ بات کی شروعات کرنے سے وہ زیادہ دیر خود کو روک نہیں پائی۔

شاويز دروازے کی جانب چلتے چلتے روک کيا اور تعجبی انداز میں بچے کو مڑا جيسے معلوم کرنا چاہ رہا ہو آواز اسے ہی لگائی گئی تھی يا کسی اور کو۔

"تم بات کرو۔۔۔۔۔ میں نوٹس بورڈ جا کر چیک کرتا ہوں۔"

عارفہ نے اس کے محبت بھرے لہجے سے مسرور ہوتے ہوئے۔ اس کی مصروفیات کا خیال کرتے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اسی خوش اخلاقی سے سحر کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف عارفہ سے بائے کہتا وہاں سے روانہ ہو گیا۔



اپنے بیڈروم کی یہ دیوار اس نے اپنے ورکنگ ایریا کے طور پر مخصوص کر رکھا تھا۔ جو بالکل اس کے بیڈ کے روبہ رو تھا تا کہ وہ سوتے جاگتے اپنے مقصد کو دیکھتا اور یاد کرتا رہے۔ دیوار کے ساتھ لمبی میز لگائی گئی تھی جس پر لیپ ٹاپ، کچھ فائلز، قلم کتاہچے، ایک وائس ٹرانسمیٹر اور بھی بہت سارے ساز و سامان موجود تھے۔ میز سے اوپر کو ایک نوٹس بورڈ دیوار پر ٹنگا ہوا تھا۔ جس پر جگہ جگہ اخبارات کے کٹے آرٹیکل۔ میگزین کے کٹے صفحات اور اس انسان کی فیملی کے

ہر فرد کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جس سے وہ سب سے زیادہ نفرت کرتا ہے۔ اس میں نمایاں طور پر بڑے سائز میں نوٹس بورڈ کے بچہ بیچ اس خاندان کے سربراہ کی تصویر تھی دلاور پرویز جان کی۔

اس نے ایک غصیلی نگاہ ان سب تصویروں پر ڈالی۔ کرسی کھینچ کر بیٹھا اور ایک ڈائری نمائوٹ
بک کھولا۔ اس میں الف سے لے کر یاتک دلاور پرویز خان اور اس کی فیملی کے بارے میں وہ
تمام تر معلومات لکھی تھیں جو اس نے پچھلے چار سالوں سے جمع کر کے رکھیں تھیں۔ آج سے
اسے اپنے منصوبے کو جامعہ عملی پہنانا تھا۔

ڈائری میں پہلے ٹارگیٹ کی معلومات پڑھ کر اور بدلے کی آگ آنکھوں میں لیئے؛ اس نے نوٹس بورڈ پر اُس نام کے انسان کی تصویر کو دیکھا اور باہر کی جانب گامزن ہوا۔



یونیورسٹی کی چھٹی ہو جانے کے بعد گیٹ تک وہ دونوں ساتھ میں آئی۔ ایک دوسرے کے گال سے گال ٹکرا کر الوداع کیا۔ عارفہ اپنی کار میں جا کر سوار ہو گئی اور سحر اپنی کار میں۔ آدھے راستے تک وہ کار میں آئی۔ پھر ایک چھوٹی سی مارکیٹ کے پاس کار رکو کر وہ صرف پرس اور موبائل ہاتھ میں پکڑے اترنے لگی۔

"گل جان۔۔۔۔۔ تم گھر جاو۔۔۔۔۔ مجھے مار کیٹ میں کچھ کام ہے۔۔۔۔۔ یہاں سے میں پیدل آ جاو گی۔" اس نے خوش مزاجی سے اپنے ادھیڑ عمر ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ اس نے جی میڈم کہتے ہوئے سر اثابت میں ہلایا۔ سحر کار سے اتری تو وہ کار آگے لے گیا۔

وہ چھوٹی سی مارکیٹ کراچی کے اتوار بازار نماجگہ تھی۔ کپڑے جوتے اشیائے خورد و نوش سے لیکر کتاب فروشی اور عجائبات کی نمائش تک سب دکانیں موجود تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے وینڈو شاپنگ کرتی رہی۔ ایک کتاب فروشی سے اس نے مرزا غالب کی افسانہ کی کتاب لی۔

موپلی والے ٹھیلے سے اخبار میں بُھنی ہوئی موپلی لے کر چہل قدمی کرتے ہوئے کھانے لگی۔ عجائبات کی دکان میں نظر گردانی کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کوئی مسلسل اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس نے بنا مڑے کنکھیوں سے دیکھا بلیک شوز، بلیک پینٹ، بلیک آپر پہنے، چہرہ اپر کے ٹوپی سے ڈھکے وہ اسی کی جانب رخ کر کے کھڑا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے خطرے کا خدشہ ظاہر کیا۔ سحر نے واپس نظریں نیچے کی اور خود کو انجان رکھنے، تاثرات سنجیدہ بنائے وہاں سے جانے لگی۔

مارکیٹ کی گلی میں لوگوں کے رش سے نکلتے وہ بار بار پیچے دیکھتی تو وہ آپر والا؛ چہرہ اپر کے ٹوپی سے ڈکھا لڑکا اسی طرح سر جھکائے اس کے پیچے چل رہا تھا۔

سحر کو اس سے خوف آنے لگا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی اور سب کو دھکم پیل کرتی وہ جلدی سے سڑک پر پہنچ گئی۔

ہجوم کے بیچ کھڑی ہو کر وہ ٹریفک کے رکنے کی منتظر تھی تاکہ جلد از جلد وہ سڑک پار کر کے دوسری جانب اپنی گلی میں بھاگ پڑے۔

وہ ملا تیشی نظروں سے آس پاس دیکھنے لگی وہ اپر والا لڑکا اب اس کے پیچھے نہیں تھا۔ اس نے گلا تر کرتے لمبی سانس خارج کی۔ کچھ مطمئن ہوتے ہوئے وہ سامنے دیکھنے لگی کہ ساتھ کچھ فاصلے پر اپنے سائینڈ پر کھڑی گاڑی کے شیشے میں اسے سر جھکائے جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس پر والے کا عکس نظر آیا۔ اسے اپنے اتنا قریب محسوس کرتے وہ ہڑبڑا گئی اور بغیر ٹریفک کا دھیان کئے بے ہنگم سی سڑک پر دوڑ گئی۔

اچانک سے اس کا لے سایے سے وہ اس قدر خوفزدہ ہو گئی کہ یک دم بھاگنے پر اسے نہ اپنے پیچے ہارن سنائی دیئے نہ گاڑیوں کے آپس میں ٹکرائے کی پروا کی اور نہ خود کا ایکسیڈنٹ ہونے کی پریشانی ہوئی۔ بچتے بچاتے وہ سڑک پار کر کے دوسرے جانب پہنچی۔ بغیر مڑے وہ سہمے انداز میں اپنے گلی میں داخل ہوئی اور تیزی سے اپنے گھر کا گیٹ بجانے لگی۔ چونکیدار نے فوراً سے



اس کے کمرے کے دروازے کا پہلے ناب گھما جب لاک ملا تو دستک دی گئی۔

وہ گم سم بیٹھی تھی کہ دستک کی آواز پر اپنے حواس میں واپس لوٹی۔

"کون۔۔۔" سحر نے کچھ دیر پہلے کے حادثے کے حصار سے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔

"سحر۔۔۔۔۔ میں ہوں۔۔۔۔۔ دروازہ کھول" اس نے خود سے دو سال چھوٹے 21 سالہ بھائی کی صدا سنی۔

تاثرات خوشگوار رکھتے ہوئے وہ اٹھی اور دروازے کا لاک کھولا۔ اس کے کمرے کے چوکت پر صائم اسی کا یونیورسٹی بیگ پکڑے کھڑا تھا جو یقیناً ڈرائیور نے اسے سحر کو دینے کے لیے دیا تھا۔

وہ شرارتی انداز میں مسکرائی اور صائم کے ہاتھوں میں سے اپنا بیگ لیا۔

"تم آج یونی کیوں نہیں آئے تھے۔۔۔۔۔" سحر نے بیگ سٹیڈی ٹیبل پر رکھتے ہوئے جھڑکنے کے انداز میں اسے ٹوکا۔

سحر 23 سال کی تھی اور صائم 21 سال کا۔ عموماً ہر بہن بھائی کی طرح ان دونوں میں بھی کبھی پیار کبھی تکرار چلتی رہتی ہے۔ عارفہ کے بعد اگر سحر کو کوئی بہت پیارا تھا تو وہ صائم ہی تھا۔ عمر میں دو سال چھوٹا ہونے کے باوجود بھی وہ لاغر جان لمبا سا ٹین اٹیج لڑکا تھا۔ چھوٹی آنکھیں لمبی گردن تھیکے نکوش کا حامل وہ بھی اپنی بہن جیسی معزز شخصیت کا مالک تھا۔ صائم کی لڑکیوں سے کچھ خاص بنتی نہیں تھی اس لیے اس کی فرینڈ لسٹ میں کوئی زنانہ کردار شامل نہ تھا جبکہ سحر اور عارفہ کے ساتھ وہ بہت مستی مذاق کرتا۔ ویسے تو عارفہ سحر کی بیسٹ فرینڈ تھی لیکن صائم سے بھی اس کی برابر جتنی دوستی تھی۔

صائم آگے آیا اور سحر کے بیڈ پر نیم دراز ہو کر بیٹھا۔ اپنی طرف سحر کی پشت پا کر وہ بے آواز ہاتھ بڑھا کر سحر کا پرس ٹٹولنے لگا۔

"آج میری کلاس نہیں تھی۔۔۔۔۔ اگلے monday سے شروع ہوگی۔" صائم نے احتیاطی تدابیر اختیار کرتے؛ نظریں سحر کے پرس پر جمائے آرام سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

صائم کا اسی سال سحر اور عارفہ کے یونیورسٹی میں ہی داخلہ ہوا تھا۔ وہ کمپیوٹر سائنس کے فرسٹ ایئر کاسٹوڈنٹ تھا۔

سحر جانتی تھی صائم ہمیشہ کی طرح اس کے پرس میں جھانک رہا ہے اور وہ ہر بار کی طرح انجان بننے کی اداکاری کرتی میز پر ادھر ادھر ہاتھ مارتی خود کو کام میں مگن دکھا رہی تھی۔

جب شروع شروع میں اسے صائم کی اس شرارت کا پتا چلا وہ بہت چڑ گئی تھی۔ پایا سے شکایت بھی کر دی تھی۔ حالانکہ صائم کو بھی برابر کی پوکٹ منی ملتی پھر بھی پتا نہیں کیوں اسے سحر کے

پرس سے چوری چپے پیسے نکالنے میں مزا آتا۔ صائم سمجھدار اور ذہین لڑکا تھا۔ یہ شرارت وہ صرف اپنی بہن کے ساتھ ہی کرتا۔ جیسے جیسے دونوں بڑے ہوتے گئے۔ سحر نے صائم کی اس حرکت پر چڑنا چھوڑ دیا۔ اب وہ خود جان بوجھ کر دیکھ کر اُن دیکھا کر دیتی۔ اسے اپنے چھوٹے بھائی کی اس ناچیز سی شرارت پر غصہ نہیں آتا بلکہ پیار محسوس ہوتا۔ حالانکہ تھی تو یہ ایک بد تہذیب حرکت پھر بھی۔ صائم کو بھی اندازہ تھا کہ سحر کو اس کی شرارت کا علم ہے پھر بھی وہ خاموشی سے اسے اپنے پیسے لینے دیتی ہے۔ بہن کا یہ والہانہ پیار دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوتی۔ اس وقت سحر کے پرس میں 500 چھوڑ کر باقی پیسے نکال کر اپنے جیب میں اڑ سھتا وہ ممی بلار ہی ہے کا بہانہ کر کے اس کے کمرے سے نکل گیا۔ سحر اس کے باہر جاتے ہی پلٹی اور دبی دبی سی ہنستی ہوئی ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ صائم کی آمد نے اس کا موڈ اچھا کر دیا تھا۔ وہ مارکیٹ میں ہوئے اس حادثے کو بھول بھال گئی تھی۔



گھپ اندھیرے میں اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ تیز ہواؤں سے جنگل کی فضاء میں غضب ناک دل دہلا دینے والی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ آج ان ہواؤں کے ساتھ ساتھ کوئی بری طرح اس پر ہنس رہا تھا۔ وہ بے بس ساروتا؛ درختوں کو چیرتا بھاگ رہا تھا۔ کہی دور اسے روشنی کی کرن نظر آئی۔ اس کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اس روشنی تک پہنچنے والا ہوتا ہے کہ ایک زوردار جھٹکے سے منہ کے بل گر جاتا ہے۔ اس نے ہاتھ اوپر کر کے دیکھیں۔ اسے جگہ جگہ زخم لگ گئے تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ وہ اٹھنا چاہتا ہے پر ایسا لگتا ہے کوئی بھاری وزنی چیز اس کے پیٹھ پر آگری ہے۔ اس نے پیچے مڑ کر دیکھا وہ بھاری بھر کم چیز وہی اس پر ہنسنے والا آدم خور جانور ہے جس کا آدھا حصہ انسان کا اور آدھا جانور کا ہے۔ اس آدم خور کی سرخ آنکھوں اور لمبے بھیڑیے جیسے دانتوں سے اسے وحشت ہونے

لگی۔ رخ سامنے کر کے وہ اپنی پوری قوت سے چلانے لگا۔ آدم خور جانور نے اس کے دونوں ہاتھ جکڑ لیے اور پیچے کی طرف کھینچنے لگا۔ کھیچاواتنا شدید تھا کہ اسے لگا اس کے بازو دھڑ سے الگ ہو جائے گے۔ اس آدم خور کی آنکھوں میں خون سوار تھا۔ وہ چلا چلا کر؛ درد کی شدت سے نڈھال ہونے لگا۔ وہ روشنی کی کرن دھندلی پڑنے لگی اس کی جان جانے لگی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ پورا پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی جیسے وہ خواب کے ساتھ ساتھ حقیقت میں بھی چیتا چلاتا رہا ہو۔ کچھ لمحے اسی طرح دم سادھے پھٹی آنکھوں سے پڑا رہا۔ وہ پلکیں جھپکانے سے بھی خوف زدہ تھا۔ مانو اس نے پلکیں جھپکائی تو وہ جانور شکل کا آدمی پھر اس کی اوپر آ جائے گا؛ اتنا سوچتے ہی اس کی سانس رکنے لگی دھڑکن تیز ہو گئی وہ پھرتی سے اٹھ بیٹھا۔ سائینڈ ٹیبل پر پڑے نائٹ لیمپ کو جلایا لیکن آج اس کا خوف کم کرنے اتنی روشنی کافی نہ تھی۔ بیڈ سے چھلانگ لگانے کی صورت وہ اٹھا اور بورڈ پر ہاتھ مار کر سارے بلب لگا دیئے۔ وہ اپنے لرزتے ہاتھوں کو دیکھنے لگا وہاں کوئی زخم کوئی خون نہیں تھا۔ اس نے سر پکڑ لیا اور تیز تیز

چند سانس لے کر خود کو سنبھالا۔ آج مسلسل کئی راتوں سے اسے یہ ڈراؤنے خواب آرہے تھے اور وہ اسی طرح غیر حالت میں اٹھ بیٹھتا۔ جب کئی راتوں کی شب بیداری اور مسلسل ان خوابوں کا حملہ ہوتا تو انجام اس کے مانگنرین (آدھے سر کا درد) پر ہوتا۔ اس وقت اسے اپنے سر کے پیچے گردن کے پاس اٹھتی ٹیسیں سچ میں نڈھال کر رہی تھی۔ اس میں گردن ہلانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ نہانے کے بجائے آہستہ آہستہ اپنے راکنگ چیئر کے پاس آیا اور چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تصاویر لگے دیوار پر نظریں گاڑے وہ چیئر جھلانے لگا۔

"آج تو وہ اپنے پہلے ٹارگٹ کو موت کے منہ تک پہنچا آیا تھا۔۔۔۔۔ سحر بنت دلاور پرویز خان کو اس نے اپنی وحشت سے اتنا ہیبت زدہ کر دیا تھا کہ وہ بنا جان کی پروا کئے چلتے ٹریفک میں گُود پڑی تھی۔۔۔۔۔ پھر آج تو اسے سکون کی نیند آ جانی چاہیے تھی۔۔۔۔۔ سالوں بعد کچھ پل کے لیے ہی صحیح؛ ان خوابوں کو اس کا دامن چھوڑ دینا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ پھر کیوں؛۔۔۔۔۔ کیوں

اسے آج بھی سکون نہیں تھا۔۔۔۔۔ کیوں وہ آج بھی سو نہیں سکا تھا۔۔۔۔۔ کیا اتنا کافی نہیں تھا۔۔۔۔۔ "اس نے سوچتے ہوئے سحر کی تصویر سے نظریں گھما کر اس بڑے سائز تصویر کو دیکھا۔

"ہاں اتنا کافی نہیں تھا۔۔۔۔۔ دلاور پرویز خان۔۔۔۔۔ جب تک میں اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین برباد نہ کر دوں۔۔۔۔۔ جب تک میں اسے تباہ نہ کر دوں۔۔۔۔۔ تب تک مجھے سکون نہیں ملے گا۔۔۔" اس نے نفرت بھری نگاہوں سے اس تصویر کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ اخذ کیا۔

گردن اور کندھوں میں درد کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ اس نے لب کاٹتے ہوئے آنکھیں بند کی کہ شاید کچھ آرام آ سکے۔

پانچ سال پہلے جب راتوں کو جاگتے رہنے اور سو جائے تو خوفناک خواب دیکھنے کی وجہ سے اسے یہ بیماری لاحق ہوئی تھی تو ڈاکٹر نے pain killer اور antidepressant ادویات تجویز کی تھی۔ ان دوائیوں کے استعمال سے اسے درد سے نجات تو مل جاتا لیکن ان کی نشہ آور side effect سے وہ دن بھر سویا رہتا۔ جاگنا چاہتا تو بھی اٹھ نہ پاتا۔ ایک سال تک ان ادویات کا عادی ہو جانے کے بعد اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ اس کی معمولات زندگی بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ رات برے خواب یا مانگرین کے درد کی وجہ سے تکلیف میں اور دن ادویات کے زیر اثر سوتے رہتے گزر جاتے ہیں۔ تب اس نے دوائیاں لینا کم کر دی اور اپنی برداشت کی حد بڑھا دی۔ اس کے چلتے پچھلے چار سالوں سے جب تک درد کی وجہ سے اس کا رونا نہ نکل جاتا وہ برداشت کرتا رہتا اور دوائی لینے سے گریز کرتا۔

وہ اسی طرح راکنگ چیئر پر بیٹھ کر دلاور پرویز اور اس کی فیملی کے تصاویر دیکھتا رہتا۔ ہر ٹیس کے ساتھ اسے پہلے سے زیادہ اس فیملی سے نفرت ہونے لگتی۔ دل میں بدلے کی آگ بھڑک اٹھتی۔ اسے اپنا بدلہ اور انتقام یاد رہتا۔

"تم نے اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں ہے۔۔۔۔۔ اب تو ہم اچھے دوست بن گئے ہیں۔۔۔۔۔ اپنے بارے میں کچھ بتاؤ" عارفہ نے چپس کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں بہت امیر ہوں۔۔۔۔۔ میرے ڈیڈ بہت امیر بزنس مین ہے۔۔۔۔۔ میں اپنے فیملی کا
اکلوتا چشم و چراغ ہوں۔۔۔۔۔ ہمارے پانچ چھ کارخانے ہیں۔۔۔۔۔ ایسا سب کہنے کے لیے
میرے پاس کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔" شاویز نرم لہجے میں محتاط انداز میں جواب دینے لگا۔
اتنے سارے وسائل کے بارے میں سنتے سنتے عارفہ کے چہرے پر جو چمک آئی تھی وہ آخری
جملہ سنتے ہی غائب ہو گئی

"میں نے آدھی سے زیادہ عمر غربت میں گزاری ہے۔۔۔۔ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا ہوں۔۔۔۔۔ یہاں تک دن رات محنت مشقت کر کے پہنچا ہوں۔۔۔۔۔ ایک

عارفہ ویسے تو اس کے میریٹل سٹیٹس کے بارے میں جاننا چاہتی تھی کہ وہ سنگل ہے یا کوئی گرل فرینڈ یا منگیتریا شادی شدہ لیکن شاویز اپنی سادگی میں اسے اپنی اکنا مکمل سٹیٹس بتا گیا۔ اس ساری گفتگو کے دوران عارفہ صرف شاویز کو دیکھتی رہی۔ اس نے آج خاکی پینٹ کے ساتھ مہرون کلر شرٹ پہنی تھی۔ آنکھوں پر گلاس لگائے۔ بال سائیڈ پر اوپر کی رخ میں جمائے وہ بہت دل کش لگ رہا تھا۔ مگر شاویز رخ موڑے لان میں بیٹھے سٹوڈنٹس کو دیکھتا رہا۔ کچھ لمحے خاموشی کے گزرنے کے بعد اس نے تاثرات خوشگوار بنائے اور عارفہ کو دیکھنے لگا۔ عارفہ آج جینز کے ساتھ رائل بلیو کلر کی لانگ شرٹ میں ملبوس؛ ٹانگ پر ٹانگ رکھے آگے کھڑی ہو کر بیٹھی تھی۔

E-mail pdfnovelbank@gmail.com WhatsApp **03061756508**

شاویز میز پر کہنیاں ٹکائے آبرو اٹھا کر غور سے شرماتی ہوئی عارفہ کو دیکھ رہا تھا۔

"میرے پاپا اصغر ساجد۔۔۔۔۔ وزارت تعلیم کے دفتر میں لیگل ایڈوائزر کے طور پر اپنا پیشہ

سرا انجام دے رہے ہے۔۔۔۔۔ مئی ہاوس وائف ہے۔۔۔۔۔ مجھ سے بڑے ایک بھائی ہے

حماد بھائی۔۔۔۔۔ وہ ملیشیا میں مقیم ہے۔۔۔۔۔ وہی اپنے ایم بی بی ایس کی ڈگری کر رہے

ہے۔ "عارفہ نے مستحکم بھرے انداز میں اپنی فیملی کے بارے بتایا۔

شاویز اسی خوش دلی سے اس کی طرف متوجہ تھا۔

باتیں کرتے کرتے جب کھاپی چکے تھے اور جانے کے لیے اٹھے تو شاویز کا ونٹر کے پاس گیا اور

بل کی ادائیگی کی۔ عارفہ کے دل میں تو پہلے دن ہی شاويز کے لیے جگہ بن گئی تھی اور اب دن

بہ دن اس کے مردانہ پر سنیلٹی سے مزید متاثر ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں شاویز کے لیے

پسندیدگی اور جذبات شدت اختیار کر رہی تھی۔



کلاس شروع ہونے والی تھی۔



پینٹنگ سکھنے جایا کرتی۔

پچھلی دفعہ جب وہ سحر کا تعاقب کرتا اس کے پیچھے گیا تھا تب اس نے سوچا نہیں تھا کہ سحر جتنا مضبوط بنتی ہے اتنی ہے نہیں۔ اس کے زرا سے فالو کرنے پر وہ اس قدر ڈر جائے گی۔ جس وقت وہ خوف و ہراس میں بھاگ رہی تھی اسے بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا لیکن جب وہ بے دھڑک سڑک پر بھاگنے لگی تو وہ اضطرابی کیفیت میں اسی جگہ ساکت کھڑا ہو گیا۔ وہ دلاور پرویز خان اور اس کی فیملی کو تباہ و برباد ضرور کرنا چاہتا تھا لیکن کسی کو جان سے مار کر نہیں۔ صرف نفسیاتی اذیت دے کر اور مالی نقصان پہنچا کر۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر کے۔

آج سحر کو شام میں کوچنگ سینٹر جانا تھا۔ وہ پھر اس کے پیچھے جانے کا منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اتنی آسانی سے وہ سحر کو خود کو بھولنے نہیں دے گا؛ یہ اس نے طے کر لیا تھا۔

کل رات وحشتناک خواب آنے کے خوف سے وہ سویا ہی نہیں۔ نیند کو دور رکھنے کے لیے وہ مگ پہ مگ کڑوی کافی اندر انڈیلتا رہا تھا۔ صبح کا آغاز معمول کی طرح فجر کی نماز ادا کر کے؛

ورزش کر کے کیا۔ ناشتہ میں صرف ایک مگ کافی پی اور اپنے کام میں جٹ گیا۔ دوپہر ہونے

لگی تو اسے بھوک کا احساس ہونے لگا

وہ اپنے کمرے میں موجود دور کنگ ایریا میں تھا۔ کرسی پر بیٹھے ڈائری پر کچھ لکھ کر بند کی۔ پیشانی مسلتے ہوئے وہ اٹھا اور فریش ہونے واشروم چلا گیا۔

اس کافلیٹ اپارٹمنٹ کے تیسرے منزل پر تھا۔ ایک بیڈروم پر مشتمل اس کافلیٹ بیرون ممالک کے فلیٹ کے ڈیزائن سے بنایا گیا تھا۔ مین دروازے سے اندر آئے تو لاؤنج تھا جس میں بائیں دیوار پر ٹی وی لگایا گیا تھا۔ دائیں طرف صوفہ سیٹ رکھا تھا اور بیچ میں سینٹرل ٹیبل۔ گھر کا سارا فرش لکڑی کا بنا تھا اور دیواروں پر بھی اسی سے میچنگ وال پیپر چسپاں تھا۔ صوفہ سیٹ کے سمت میں اس کے وسیع بیڈروم کا دروازہ تھا جو پورے لاؤنج کے برابر جتنا بڑا تھا۔ بیڈروم کے اندر؛ دروازے کے ساتھ الماری تھی اور انسان قد جتنا آئینہ جہاں وہ تیار ہوا کرتا۔ بیڈروم

لاونج کے ساتھ ہی اوپن کچن تھا اور چھوٹا سا ڈائننگ ایریا۔

وہ فریش ہو کر باہر آیا اور اوپن کچن میں آکر کچھ کھانے کے لیے بنانے لگا۔ کچھ منٹ بعد وہ اپنے لیے پیکٹ والے کٹلس فرائی کر کے لے آیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کے بجائے صوفے پر بیٹھا۔ ٹی وی آن کیا۔ نیوز چینل دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ کیچپ لگا لگا کر کٹلس کھانے لگا۔

آدھ گھنٹہ تک کھانے سے فارغ ہو کر اس نے ٹی وی واپس بند کیا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے اپنا مخصوص لباس پہنا اور چابیاں اٹھا کر گھر سے باہر نکل آیا۔



سحر لنچ کے بعد کچھ دیر سستانے صوفے پر لیٹی تھی اور اسی طرح صوفے پر ہی سو گئی تھی۔

عابدہ اپنی نگرانی میں ملازمہ سے کچن صاف کروا کر نکلی تو سحر کو صوفے پر سویا ہوا پایا۔ گھڑی کو دیکھا تو اس کے پینٹنگ کلاس جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ سر جھٹکتی اس کے پاس آئی اور سحر کا کندھا جھنجوڑ کر جگانے لگی۔

"سحر۔۔۔۔۔ اٹھ جاو۔۔۔۔۔ 4 بج گئے ہے۔۔۔۔۔ کو چنگ سینٹر نہیں جانا کیا۔" انہوں نے بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔

وہ جو بے زاری سے ماں کی پکار سن کر ان سنا کر رہی تھی 4 بجنے کا سن کر عنودگی سے باہر آئی۔ میں سو کیسے گئی تھی؛ سوچتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی اور ہاتھوں کی انگلیوں سے بالوں کا جوڑا بنانے لگی۔

"اتنا لیٹ جگایا ہے آپ نے ممّا۔۔۔ کلاس کے لیے دیر ہو جائے گی۔" بال باندھ کر سلیپر پہنتی وہ اٹھی اور اپنے کمرے کے جانب بھاگ گئی۔

"مجھے تھوڑی پتا تھا۔۔۔ تم یہاں سو رہی ہو۔۔۔" عابدہ بیگم نے صوفے کے کشن درست رکھتے ہوئے اسے آواز لگائی پر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی کمرے میں جا چکی تھی۔

مسزز عابدہ دلاور 45 سالہ باوقار خاتون۔ نقش و نگار سے لیکر قد کاٹ تک ہر زاویے سے بے مثال۔ عالی ظرف کی مالکن اپنے گھر کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ایک چیرٹی رائزننگ ادارے کی سربراہی بھی کرتی تھی۔ اگر دلاور پرویز خان کا بزنس کی دنیا میں اپنا نام تھا تو مسزز عابدہ دلاور کا کار خیر کی دنیا میں اپنا۔

25 سال کی شادی شدہ زندگی میں انہوں نے ہر قدم پر دلاور پرویز خان کا ساتھ دیا تھا۔ ان کے سرکاتاج دلاور تھے اور دلاور کے لیے اس پر رونق زندگی کا مشعل عابدہ تھی۔



کلاس میں اس نے اپنا ایزل اس کھڑکی کے پاس سیٹ کیا جو باہر سڑک پر کھلتی تھی۔

ایزل میں پیپر لگا کر وہ ٹیچر کے بتائے انداز میں پینسل سے سکیچ کرنے لگی۔

ایک آدھ دفعہ کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو ایک بلیک کلر کی لینڈ کروزر کار کھڑی دیکھی۔ کچھ

لمحے کے لیے اس حادثے کی یاد اس کے ذہن پر لہرائی لیکن پھر ٹیچر کی آواز نے اسے یادوں

کے جال سے نکال لیا۔ وہ سر جھٹکتی کلاس کی جانب متوجہ ہوئی اور اپنا سکیچ بنانے لگی۔

دو گھنٹے کی کلاس کے بعد وہ بیگ کندھے پر لٹکائے باہر آئی تو اب وہ بلیک کار وہاں موجود نہیں

تھی۔ اس نے یہ سب ایک اتفاقہ مماثلت قرار دیا اور اپنی کار میں آکر بیٹھ گئی۔ واپسی پر وقت

کی کوئی پابندی نہیں تھی تو ڈرائیور مین روڈ سے لے آیا تھا۔ وہ کھڑکی کا شیشہ نیچے کئے باہر دیکھ

رہی تھی کہ اسے وہ بلیک کار ساتھ ساتھ چلتی ملی۔ وہ چونک کر سیدھی ہو کر بیٹھی۔ چونکہ

ٹریفک بہت تھا اس لیے کبھی ان کی کار آگے بڑھ جاتی کبھی وہ پیچے رہ جاتی۔ سحر نے کوئی خاص

دھیان دیئے بغیر یہ اغذ کیا کہ وہ ویسے ہی عام کار ہے جو ٹریفک کی وجہ سے اس کے سامنے آ جا رہی ہے۔

اوسان وہاں خطا ہوئے جب ایک سگنل پر سحر نے وہ گاڑی ساتھ آکر رکتی دیکھی۔ اس شخص نے اپنی طرف کا بلیک شیشہ نیچے کیا۔ اندر بیٹھے وہی بلیک آپر پہنے مرد کو دیکھ کر سحر سہم گئی۔ آج اپر کی ٹوپی اس کے چہرے پر نہیں تھی لیکن ماسک پہننے اور آنکھوں پر گلاس لگانے کے باعث وہ اس کا چہرہ واضح دیکھ نہیں پائی۔ وہ ابھی سہمے انداز میں اسے مشاہدہ کر رہی تھی کہ سحر نے اس کے ہاتھ میں گن دیکھی جو وہ اسی کی طرف ہاتھ اٹھا کر نشانہ باندھ رہا تھا۔

"ڈرائیور گاڑی چلاؤ۔۔۔" اس نے گھبرا کر ڈرائیور کی سیٹ ہلائی۔

وہ جو یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اچانک کیا ہو گیا کبھی پریشانی کے عالم میں سامنے سگنل کو دیکھتا جو ابھی بھی سرخ تھا اور کبھی بیک ویو مرر میں سحر کو جس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گاڑی کو ہوائی جہاز بنا کر اڑادیں۔

وہ اسی طرح اس ماسک پہنے مرد کو اور اس کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھ کر حالت غیر میں حواس باختہ ہو رہی تھی۔ وہ دوبارہ ڈرائیور کو جھڑکنے لب کھولنے لگی تھی کہ سگنل گرین ہو گیا اور ڈرائیور نے پوری رفتار سے کار چلا دی۔

وہ کانپتے ہانپتے تھوک نکل کر گلاتر کرتی آس پاس دیکھنے لگی۔

"میڈم آپ ٹھیک تو ہے۔۔۔۔" ڈرائیور نے موودب انداز میں ہلکے لہجے میں پوچھا۔

ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ پا کر وہ چھنپ سی گئی۔ تاثرات نارمل کرتے ہوئے اس نے سر
اثابت میں ہلایا۔

"صہم۔۔۔۔۔ جلدی گھر چلو۔" اس نے نظریں نیچی رکھے ہوئے کہا۔ ڈرائیور مناسب رفتار سے کار چلاتا موڑ مڑا تو وہ بلیک کار ان کے گلی کے سامنے اس زاویے میں کھڑی تھی کہ دائیں بائیں کہی سے بھی کسی دوسری گاڑی کے گزرنے کے امکانات نہ تھے۔

ڈرائیور نے غصیلے انداز میں زور سے ہارن دینا شروع کیا۔ سحر جانتی تھی کس کی گاڑی ہے اندر کون ہے پر وہ ڈرائیور کو نہیں بتا سکتی تھی۔

"ارے ارے اووو بلیک لینڈ کروزر والے۔۔۔۔۔ بہرے ہو۔۔۔۔۔ اتنے ہارن سنائی نہیں دے رہے۔" ڈرائیور گل خان نے کھڑکی سے سر نکال کر بلند آواز میں صدا لگائی۔ وہ سفید پوش علاقہ تھا۔ وہاں لوگوں کی آمد و رفت کم ہی پائی جاتی۔ اس وقت بھی ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

جب لگاتار ہارن دینے کے بعد بھی وہ گاڑی نہ ہٹی تو ڈرائیور نے خود اتر کر اس کے پاس جا کر ڈانٹنے کا سوچا۔

گلی کے آخر میں اس کی کار او جھل ہوتے دیکھ کر گل خان نے بھی کار پھر سے سامنے کی جانب بڑھادی۔



"کیسی ہے میری گڑیا۔۔۔۔ کیا چل رہا ہے آج کل۔۔۔" اس کا مزاج خوشگوار کرنے باتوں میں پہل انہوں نے ہی کی۔

"ٹھیک ہوں پایا۔۔۔۔۔ آپ کیسے ہے۔۔۔۔۔ جاپان کی ٹرپ کیسی رہی۔" پایا کے خوش دلی کو دیکھ کر سحر کا موڈ بھی اچھا ہو گیا۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔ بس ٹرپ بہت تھکا دینے والا رہا۔۔۔۔ لیکن جب محنت کر کے اس کا پھل اچھا ملے تو وہ تھکاوٹ ضائع نہیں جاتی۔۔۔" انہوں نے مسرت بھرے لہجے میں سمجھایا۔

"ہمیں تو پہلے ہی یقین تھا۔۔۔۔۔ جاپانی کمپنی کا یہ پروجیکٹ آپ کو ہی ملے گا۔" عابدہ بیگم نے شوہر کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے۔

وہ ملازمہ کے ہمراہ چائے اور اسنیکس بنا کر لے آئی تھی اور اب دلا اور صاحب کو کپ پیش کر رہی تھی۔

سحر کو وہ پینٹنگ بہت پسند آئی۔ وہ ایک دیہاتی زندگی کو سراہتی رنگوں سے بھری پینٹنگ تھی۔ ایک طرف جنگل؛ ساتھ میں بہتی ندی؛ افق میں روشن سورج اور پہاڑوں کے درمیان مٹی کے بنے گھر؛ اور ندی کے کنارے مٹکے میں پانی بھرتی دیہاتی عورتیں؛ قدرت کے کرشمے اور سکون کا ملا جلا تاثر بخشنا نظر آ رہا تھا۔



وہ گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی آفتاب غروب ہو چکا تھا۔

ماسک اور گلاس اتار کر وہی سینٹرل ٹیبل پر رکھے۔ بیڈروم میں آکر الماری کھولی اور تیجوری
نماسیف خانہ کھول کر اپنی گن واپس رکھنے لگا تو نظر سامنے پڑے ایک بوسیدہ سی تصویر پر
پڑی۔ اس نے گن رکھ کر ہاتھ بڑھا کر وہ تصویر اٹھائی۔

ایک 26 سے 25 سالہ جوان خوبصورت لڑکی؛ کمر سے نیچے تک آتے لمبے بال؛ گہری آنکھیں؛
دل کو بہکا دینے والی حسین مسکان لیئے ایک 4 سالہ چھوٹے سے بچے کو کود میں بیٹھائے ہوئے
تھی۔

"یہاں آو۔۔۔۔۔ پکڑو مجھے پکڑو۔" وہ حسین لڑکی اس ننھے بچے کے آگے بھاگتے اس کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

وہ بچہ دنیا جہان کے غم سے بے خبر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہنستا کھکھلاتا ہوا اس کو پکڑنے بھاگ رہا تھا۔

"آہ۔۔۔۔ اوو ہوو۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔ میرا شاہ سوار بیٹا گر گیا۔" وہ واپس پلٹی اور اس بچے کے گر جانے پر بلکتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

وہ معصوم بچہ کسی بھی چھوٹ؛ کسی بھی درد تکلیف سے انجان بھیگی آنکھوں سے ماں کی آغوش میں آکر چھپ گیا۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ میرا بیٹا بہت بہادر ہے۔۔۔۔۔ اسے اتنی سی چھوٹ سے درد نہیں ہو گا۔۔۔۔۔ اس کی ماں ابھی دوا لگا دے گی۔" وہ پیار کی مورت اپنے آنسو چھپاتے ہوئے 5 سالہ بیٹے کو دلا سہ دے رہی تھی۔ اس کی ننھی گول گول آنکھوں سے گرتے آنسو صاف کر رہی تھی۔

اس کے آگے منظر دھندلا گیا۔ یادیں دھواں بن کر اڑ گئی۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر اس ماں بیٹے کی ہنستی تصویر پر جا گرے۔

اس کے بیٹے کو کہاں کہاں کس نوعیت کی چھوٹیں لگی تھیں اب وہ ماں نہیں جانتی تھی۔ اس کے آنکھوں سے کتنے آنسو گرے تھے اب وہ ماں انجان تھی۔ اسے کسی بھی حد تک تکلیف ہوتی اب وہ ماں دوا لگانے پاس نہ تھی۔

اس کے وجود کا سبب؛ اس کی جنت؛ اس کی زندگی کا سرچشمہ؛ اس کی ماں اس کے 8 سال کی عمر میں ہی اسے تنہا چھوڑ کر اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔

اس نے خود ہاتھ اٹھا کر رخسار پر گرے آنسو صاف کئے۔ گیلی سانس اندر کھینچ کر خود کو سنبھالا۔ آنکھ بند کر کے بہت سے باقی ماندہ آنسو اپنے اندر اتارے اور وہ تصویر سیف کے اندر رکھ کر تجوری لاک کر دی۔

اپنے جذبات قابو کرنے لمبی سانس لی اور نوٹس بورڈ کے جانب رخ کیا۔ کتا بچے سے ایک خالی صفحہ پھاڑ کر آج کی تاریخ لکھی اور پین کے ساتھ وہ صفحہ نوٹس بورڈ پر آویزاں کیا۔

اس کی ماں کو اس سے چھیننے والے درندے؛ دلاور پرویز خان کی خوشیاں چھیننے کا وقت آ گیا تھا۔



دلاور پرویز خان نے ملک کے بڑے بڑے صنعتی پید اواری کرنے والوں اپنا خاصا مقبول نام بنالیا تھا۔

پچھلے 19 سالوں سے وہ نیشنل اور انٹرنیشنل صنعتی اداروں کے نامور شخصیات میں شامل تھے۔

موجودہ دور میں ان کی دو بڑی بڑی فیبر کس اور ٹیکسٹائل کی کمپنیاں تھیں۔ فیبر کس کی کمپنی انہوں نے سحر کے نام کی تھی اور ٹیکسٹائل کی صائم کے نام۔ دلا اور صاحب نے اپنے اولاد کو ہمیشہ اتحاد اور اتفاق سے رہنے کی نصیحت بہت واضح کر رکھی تھی۔ سحر اور ضائم دونوں ہی صوبر بچیں ثابت ہوئے تھے۔ دونوں نے باپ کی ہر نصیحت پر عمل کر رکھا تھا اور ماں کی بھی فرمانبرداری کرتے۔ سحر بہت سلیجی ہوئی تھی جبکہ صائم نٹ کٹ مزاج تھا۔

اب تیسری کمپنی وہ ہارڈوڈ کی بنانے جا رہے تھے۔ یہ کمپنی انہوں نے اپنی دل عزیز بیوی عابدہ بیگم کے نام کھولنے کا سوچا تھا۔

"میرا سب کچھ تو آپ۔۔۔۔ اور ہمارے بچے ہیں دلاور۔۔۔۔ مجھے کوئی کمپنی نہیں چاہیے۔"

عابدہ بیگم نے کمپنی ان کے نام بنانے کا جان کر دلاور صاحب سے کہا۔

"میں نے سوچا۔۔۔ کہی تم یہ نہ سمجھو۔۔۔ کہ میں صرف اپنے بچوں سے محبت کرتا ہوں
اس لیے ان کے نام کمپنیاں بنا دی ہے اور تمہارے نام نہیں۔" دلاور صاحب نے شیر لہجے
میں بیوی کو تنگ کرتے ہوئے کہا۔

"میں ایسا کبھی نہیں سوچتی۔۔۔۔۔ آپ کا ساتھ۔۔۔۔۔ اور اپنے بچوں کی سلامتی میرے لیے سب سے قیمتی ہے۔۔۔۔۔ یہ کمپنی آپ کا خواب ہے۔۔۔۔۔ اسے آپ اپنے نام سے بنائے۔" عابدہ بیگم نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دباؤ دیا۔ ان کا یہ والہانہ پیار دیکھ کر دلاور صاحب کو بہت تسکین ملی انہوں نے خوشی سے مسکراتے ہوئے ہامی بھری۔

دلاور پر ویز خان اپنے وقت کے بہت ہینڈ سم نوجوان تھے۔ لمبا قد؛ گھنے بال؛ لمبی ناک؛ کے مالک وہ پہلی ملاقات میں دل کو بھا جانے والے باوقار شخصیت تھے۔ اب 50 سال کی عمر میں بھی وہ دل کش اور توانا مرد ہے۔ صحت مند اور تندرست ہونے سے وہ کافی جوان لگتے ہیں۔



دلاور پرویز خان کے دادا اور والد اپنے دور میں قبیلے کے سردار رہ چکے تھے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ ہر سرما کی چھٹیوں میں گاؤں جایا کرتے۔

سحر کو گاؤں جا کر بہت مزا آتا۔ اسے بچپن سے کچی آبادی؛ سرسبز و شاداب باغات؛ نہر اور ندی؛ گائے بھینس بھیڑ بکریوں کے بیچ دیہاتی زندگی تجربہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ جب تک وہ

اور صائم چھوٹے تھے۔ وہ صرف مزے کرنے گاؤں جایا کرتی۔ وہ 16 سال کی تھی جب وہ آخری مرتبہ گاؤں گئی تھی تب اسے اپنے پاپا کا سرداروں کے خاندان سے ہونے کا سمجھ آیا۔ ان کے خاندان میں بھی سرداری وراثت میں خاندان کے موجود بڑے مرد کو ملتی اس لئے اب اس کے تایا یعنی دلا اور کے تایا زاد بھائی کو ملی تھی۔ 16 سال کی عمر میں جب سحر اپنے آبائی گاؤں گئی تو وہاں کے رسم و رواج دیکھ کر اس کے دل میں کئی سوالات پیدا ہوئے۔ وہاں اب بھی لڑکوں کو بالا تر رکھا جاتا ہے اور لڑکیوں کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ وہاں عورتیں صرف میاں کی خدمت اور اولاد پالنے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ لڑکیوں کے لئے پانچویں جماعت تک سکول ہے جبکہ لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے شہر اور ملک سے باہر بھی بھیجا جاتا ہے۔

یہ سب کو دیکھتے سحر نے اپنے پاپا کے ماڈرن اور براڈ مائنڈ ہونے پر صد شکر ادا کئے تھے۔

آخری دفعہ جب دلاور صاحب اپنے بیوی بچوں سمیت گاؤں گئے تھے تو سحر کو اپنی طرف کئی تنقیدی نظریں اٹھتی محسوس ہوئی تھی اس کے سلیقہ اور پوشاک پر کئی سوالات اٹھائے گئے تھے حالانکہ اس کی ڈریسنگ میں اعتراض برتنے جیسا کچھ ہوتا بھی نہیں تھا۔ وہ وہی شلوار قمیض زیب تن کرتی اور ڈوپٹہ گلے میں لیتی۔ عابدہ بیگم بھی گاؤں جا کر ان کے وہاں جیسے طور طریقوں سے رہتی اور سحر کو بھی ویسا رہنے کی ہدایت دیتی۔

اُس چھٹیوں کے بعد اس کے دادا کی زندگی تک دلاور اور عابدہ صائم اور سحر کو اپنی کیئر ٹیکر کے پاس چھوڑ جاتے۔ اسے وہاں کا ماحول تو بہت پسند تھا لیکن بڑی ہونے کے ساتھ ساتھ اسے وہاں کے لوگوں کا رہن سہن بالکل پسند نہیں آیا اس لیے وہ خود بھی جانے کی ضد نہ کرتی۔



شاویز اور عارفہ کی دوستی اب یونیورسٹی میں کسی سے چھپی نہ رہی تھی۔ وہ کلاس میں کیفیٹریا میں ہر جگہ اس کے ساتھ ہوتی۔ اس سلسلے کے چلتے کسی اور لڑکی کو شاویز کے ساتھ دوستی کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ شاویز بہر حال بے تاثر تھا۔ اس نے نہ عارفہ کو ٹھکرایا تھا نہ اب تک پسندیدگی ظاہر کی تھی۔

اس دن عارفہ اور سحر باتیں کرتی روش پر چل رہی تھی کہ سحر نے صائم کو شاویز کے ساتھ ہنستے تالی مارتے اور فاسٹ فوڈ کھاتے دیکھا۔

"صائم۔۔۔۔۔ تم یہاں اپنے سے عمر میں بڑے اور سینئر لڑکے کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔" سحر ہاتھ باندھتے ایک نظر صائم کو پھر دوسری نظر شاویز کو دیکھنے لگی۔

"اور وہ بھی تم سے مختلف مضامین والا" سحر اس جملے کا اضافہ کرنا نہ بھولی۔

صائم اپنے دوست کے سامنے بہن کے اس ٹون پر شرمسار ہو کر رہ گیا۔ وہی دوسری جانب عارفہ؛ شاویز کے لیے سحر کا یہ رویہ دیکھ کر مضطرب ہو گئی۔

"شاویز کمپیوٹر میں بہت اچھا ہے۔۔۔۔۔ وہ مجھے کچھ سوالات سمجھا رہا تھا یار۔" صائم نے آنکھیں دکھا کر سحر کو کچھ لحاظ کرنے کا اشارہ کیا۔

"صائم۔۔۔ تم ان کی پریکٹس کرو۔۔۔ پھر بھی مشکل ہو رہی تھی تو۔۔۔ مجھے کال کر دینا۔" اس سے پہلے کہ سحر کچھ اور کہتی شاویز بیچ پر سے اٹھا اور سپاٹ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ طنزیہ لہجے میں کال کے لفظ پر زور دیتے ہوئے صائم کو ہدایت دے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

عارفہ منہ بھسورتے ہوئے صائم کے ساتھ آکر بیٹھی۔

"اس میں اتنا اور ایکنگ کرنے والی کیا بات تھی۔۔۔۔ اگر شاویز نے اس کی کچھ مدد کر دی تو کیا گناہ کر دیا۔۔۔" اس نے شاویز کی دفاع میں حمایتی انداز میں کہا۔

"اور نہیں تو کیا۔۔۔۔۔ بے کار میرے دوست کی بے حرمتی کر دی" صائم نے بھی چڑ کر عارفہ کا ساتھ دیا۔

سحر پیر پٹختی ہوئی آئی اور ان کے سامنے میز کے پار والے بیچ پر بیٹھی۔

"دیکھ رہی ہوں صائم۔۔۔۔۔ تم یونیورسٹی میں آکر خاصے بگڑتے جا رہے ہو۔۔۔۔۔" سحر حوض تیکھے نگاہوں سے ان دونوں کو گھورتی صائم پر غصہ کر رہی تھی۔

"اب تم پینٹنگ میں اچھی ہو۔۔۔۔۔ تو اگر کوئی آرٹس کے سٹوڈنٹ آکر تم سے سکیچ بنوائے تو کیا وہ بگڑنا ہو گیا۔۔۔" عارفہ ناک چڑائے ہنہ کرتی رہی۔

"سیکھو۔۔۔۔۔ کچھ سیکھو اس سے۔۔۔۔۔ کہاں تم میری بہن بن گئی۔۔۔۔۔ بہن تو اسے ہونا چاہیے تھا میرا۔۔۔۔۔ کتنی اچھی بات کی ہے۔" صائم نے عارفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سحر کو مزید تنگ کرتے ہوئے کہا۔

سحر اب بھی منہ پھلائے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"عارفہ۔۔۔۔۔ تم آج میرے ساتھ۔۔۔۔۔ میرے سپورٹس بانک پر آنا۔" صائم نے چمکتے ہوئے پیشکش کی۔

عارفہ اس کی پیشکش پر فوری طور پر راضی ہو گئی۔

"ہاں ہاں۔۔۔۔۔ چلی جاو۔۔۔۔۔ ساتھ میں دھوم 5 فلم بھی بنالینا اس ہیلی کاپٹر سائز کے بانک کے ساتھ۔" سحر نے استخزیہ ہنستے ہوئے کہا۔

"دیکھو سحر۔۔۔۔۔ میری بانک کا مذاق نہیں اڑانا۔" صائم کو اس کا اپنے بانک کے خلاف بولنا برا لگا۔

"اس کی بات مت سنو صائم۔۔۔۔۔ یہ بس ہم سے جیلز ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ لیکن سنو۔۔۔۔۔ آرام سے چلانا۔۔۔۔۔ کہی گرا نہ دینا" عارفہ نے ترکی بہ ترکی سحر کا جواب دیتے ہوئے صائم کو ہدایت دی۔

"فلرناٹ عارفہ ڈیر۔۔۔۔۔ ہوا میں اڑا کر چلاو گا۔" صائم نے اپنے منہ میاں مٹھو بنے اپنی تعریف کی۔

"اوپر ہی نہ پہنچا دینا۔۔۔۔۔ پتا چلے اگلے دن فاتحہ خوانی پر بلایا جا رہا ہو۔" سحر اب کی بار کھکھلا کر ہنسی تھی۔

صائم کو اب تپ چڑنے لگی وہ اٹھ کر سحر کو مارنے لگا تھا کہ عارفہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"جانے دے صائم۔۔۔ ابھی تم اپنی کلاس میں جاو۔۔۔۔ میں تم سے چھٹی ٹائم ملتی ہوں۔"

عارفہ نے سمجھاتے ہوئے اسے وہاں سے بھیج دیا۔

Visit For More Novels : www.urdu-novelbank.com Page 78
E-mail pdfnovelbank@gmail.com WhatsApp [03061756508](https://www.whatsapp.com/channel/00291a3061756508)

دوا لینے کے بعد وہ گردن اور کندھوں کو سہلانا بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔ اسے معلوم تھا ادویات کے زیر اثر وہ کل پورا دن سوتا رہے گا۔ چاہتا تو نہیں تھا لیکن آگے کئی دنوں تک بنا کسی رکاوٹ اسے کام کرنا تھا اس وجہ سے اس نے کل کا دن اپنے آرام کے لیے آذادانہ مخصوص چھوڑ دیا۔

آج کی رات اور کل کا دن اسے پُر سکون نیند سونا تھا۔ بنا کسی برے خواب کے؛ بنا کسی ڈر کے۔ اس لیے وہ اپنی زندگی کے اچھے لمحات یاد کرنے لگا۔ چت لیٹے چھت کو تکتے وہ اپنی ماں کو یاد کرنے لگا۔ اپنے بچپن کے وہ دن جو اس نے اپنی ماں کے آنچل تلے گزارے تھے وہی تو تھے اس کے زندگی کے حسین لمحات۔

وہ 6 سالہ بچہ اپنی پلیٹ ہاتھ میں پکڑے ٹھنڈی تخی زمین پر چوکڑی کر کے بیٹھا تھا۔

"کیا ہو امیرے شہزادے۔۔۔۔۔ کھانا کیوں نہیں کھا رہے۔" اس کی ماں تھوڑے فاصلے سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تندور میں روٹی لگاتے ہوئے پوچھا تھا۔

وہ چھوٹا بچہ سرخ گال پھلائے اداس آنکھوں سے اپنی ماں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

"تم کھلا دو۔" اس معصوم بچے نے التجائی انداز میں تو تلی زبان سے ریکویسٹ کی۔

"میرے ہاتھ سے کھانا چاہتا ہے۔" ماں نے بچے کی فرمائش پر چمکتی آنکھوں سے کہا۔ اس نے پورے جذبے سے اپنا سر اثابت میں ہلایا۔

"ہائے ماں صدقے" وہ ماں پیار کی برسات کرتی اٹھی

آٹے سے لتھڑے ہاتھ ڈوپٹے کے پلو سے صاف کئے اور اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

اس کی اداس آنکھیں یک دم ہی روشن ہو گئی خوشی سے چمکتے وہ ماں کے زانو پر آکر بیٹھا۔

ماں اپنے ہاتھوں کے بنے نرم گرم روٹی کے ساتھ آلو کی سبزی کا نوالہ بنا کر اسے کھلانے لگی۔

کھانا کیسا بنا ہے اسے مزے کالگ رہا ہے اسے پسند ہے بھی کہ نہیں اس سب کو بالائے طاق رکھ کر وہ صرف اس خوشی سے کھاتے جا رہا تھا کہ اس کی ماں اپنے ہاتھوں سے کھلا رہی تھی۔

آلو کی سبزی کے بعد جب پالک کی سبزی کا نمبر آیا تو وہ منہ بنانے لگا اور اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن ماں نے مضبوطی سے اسے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا۔

"نخرے نہیں شاہ سوار۔۔۔ چلو کھاو۔۔۔ زرق کی بے حرمتی نہیں کرتے" ماں نے کچھ سختی سے کہا تو وہ بد مزہ ہو کر زبردستی پالک کی سبزی کھانے لگا۔

"ماں۔۔۔ میرا نام تو کچھ اور ہے۔۔۔۔ پھر تم مجھے شاہ شواز کیوں کہتی ہو۔" اس ننھے سے شہزادے سے تو وہ نام ٹھیک سے بولا بھی نہیں گیا جس سے اس کی ماں اسے مخاطب کیا کرتی تھی۔

"تمہیں پتا ہے۔۔۔ شاہ سوار کون ہوتے ہے۔" ماں نے گہری آنکھیں بڑی کر کے پوچھا۔

ننھے شہزادے نے سردائیں سے بائیں نفی میں سر ہلایا۔

ماں اس کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں پکڑ کر اسے شاہ سوار کی خوبیاں گنوانے لگی۔

"شاہ سوار بہت بہادر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔۔۔۔۔ ہر مشکل کا۔۔۔۔۔

ہر مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ انہیں جنگجو بھی کہا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ دلیری

اور غیرت میں سب سے اوپر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ برائی کے خلاف لڑتے ہیں۔۔۔۔۔

اچھائی کا درس دیتے ہیں۔۔۔۔۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔۔۔۔۔ حق کی راہ پر چلتے

ہیں۔۔۔۔۔" ماں نے یہ ساری خصوصیات بتا کر مسکراتے ہوئے خاموش بیٹے کو دیکھا۔ اس نادان

کو ماں کی باتیں تو سر کے اوپر سے گزر گئی لیکن ماں کی آنکھوں میں اعتماد اور امید کی ملی جلی

جھلک دیکھ کر وہ بھی ہنسنے لگا۔

اسے کھانا کھلا کر وہ اٹھی اور پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔

ایک دن وہ ماں بیٹا کا چھپی کھیل رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں جالی والے پردے کے پیچھے کھڑکی کے جانب آنکھیں بند کر کے کھڑا تھا۔

"کہاں گیا میرا دل آرا۔۔۔۔۔ میں اسے ڈھونڈنے آرہی ہوں۔۔۔۔۔" وہ ماں اپنے معصوم بیٹے کو واضح طور پر دیکھ رہی تھی پھر بھی اس کے ساتھ کھیل کھیل میں انجان بن کر بلند آواز صدائے دے رہی تھی۔

دبے پاؤں چلتی وہ چارپائی کے کنارے جھک کر نیچے جھانکنے لگی۔ اپنی ماں کی اس حرکت پر اسے ہنسی آرہی تھی وہ منہ پر ننھے ہاتھ رکھے چہک رہا تھا کہ کھڑکی کے درتچے پر اس نے چھوٹا سا چوہا بھاگتے دیکھا۔

"ماں۔۔۔۔۔" وہ پردے سے نکل کر ماں کے دامن سے لپٹ گیا۔

"ارے ارے یہ کیا۔۔۔۔۔ میرا بہادر بیٹا۔۔۔۔۔ چوہے سے ڈر گیا۔۔۔۔۔" ماں نے اس کو اٹھا کر چارپائی پر بیٹھایا اور خود گھٹنوں کے بل زمین پر اس کے لمبائی کے برابر ٹک گئی۔

وہ ڈرا سہا تیز دھڑکتے دل کے ساتھ ماں کے دل کش چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں میرے بچے۔۔۔۔۔ تمہیں بہت مضبوط۔۔۔۔۔ بہت بہادر بننا ہے۔۔۔۔۔ میرا شاہ سوار بننا ہے۔۔۔۔۔ ابھی تو تمہیں بہت ہمت سے کام لینا ہے۔۔۔۔۔ سب مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے۔۔۔۔۔ ابھی تو تمہیں زندگی کے ہر موڑ پر انسان کے ہی روپ میں سانپ اور بھیڑیے ملے گے۔۔۔۔۔ تمہیں ان سب سے لڑنا ہے۔۔۔۔۔ اپنی ماں کی بھی حفاظت کرنی ہے۔۔۔۔۔ تم کمزور نہیں ہو۔۔۔۔۔ میرا بیٹا بہت بہادر ہے۔" کہتے کہتے اس کی ماں کی آنکھیں بھر آگئی۔ نا جانے وہ کونسے درد کونسے غم اندر چھپائے ہوئے تھی۔

ماں کو افسردہ ہوتا دیکھ کر وہ چھلانگ لگا کر چارپائی سے اتر اور ماں کے چہرے کے گرد اپنے ننھے ہاتھوں کا پیالہ بنایا۔

"تم رو ومت ماں۔۔۔۔۔ میں بنوں گا بہادر۔۔۔۔۔ میں سب سے لڑوں گا۔۔۔۔۔ میں بنوں گا شاہ نواز۔۔۔۔۔" اس 6 سالہ بچے نے اونچی آواز میں ماں کو یقین دلایا۔

عارفہ نے اس کے پیچھے جانے سے زیادہ ضروری شاویز سے ملنا سمجھا اور لاہور کے بحری کے جانب بڑھ گئی۔



شاویز لا سیریری میں بیٹھا کوئی اسائنمنٹ تحریر کر رہا تھا۔ عارفہ خاموشی سے اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی۔

"ہائے شاویز۔۔۔۔" اس نے ہلکی آواز میں کہا۔

"ہائے۔۔" شاویز نے ایک نظر اسے دیکھا پھر واپس اپنا اساتمنٹ لکھنے لگا۔

"ناراض ہو۔۔۔۔" اس کی بے رخی پر عارفہ کا دل کٹنے لگا۔ اس نے شاویز کے دائیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دباؤ دیا۔ وہ جو تیز تیز لکھ رہا تھا اس کا لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کر کے رک گیا۔ پین نیچے رکھا اور رخ دائیں جانب کر کے عارفہ کو دیکھنے لگا۔

عارفہ کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ پر تھا۔

"تم سحر کی باتوں کا برا مت منایا کرو۔۔۔۔ وہ ایسی ہے۔۔۔۔ آج کل تو کچھ زیادہ ہی کنفیوز ہے۔۔۔۔ تو کل اس کا غصہ تم پر نکل گیا۔

عارفہ نے سوچا وہ سحر کے کل کے برتاؤ پر خفا ہے تو فوراً سے افسوس کے ساتھ اس کی حمایت کرنے لگی۔

"میں نے برا نہیں منایا۔۔۔۔ اور میں اس کے behaviour پر تم سے کیوں خفا ہونے لگا۔۔۔۔ بس یہ اسائنمنٹ بنانے میں مصروف تھا۔۔۔۔ کل جمع کروانے کی آخری تاریخ

ہے نا۔ "شاویز نے ہمدردانہ انداز میں اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے وضاحت دی۔

اپنے لئے اس کی فکر مندی دیکھ کر عارفہ کے جذبات بڑھنے لگے۔

"تو شام کو کبھی باہر چلے۔" عارفہ نے آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے اس سے التجا کی۔

"آج شام۔" شاویز نے تعجبی انداز میں اسے کے چمکتے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھا۔

"اگر آج شام بڑی ہو تو کل شام کو چلتے ہیں۔۔۔۔ میں تو ہر شام فارغ ہوتی ہوں۔۔۔

ہا ہا ہا۔۔۔" دوستانہ مزاج بناتے ہوئے اس نے آفر کی اور پھر خود ہی اپنی بات پر ہنسنے لگی۔

شاویز کچھ سوچنے لگا اور پھر مسکرا دیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ آج شام چلتے ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے واپس پین اٹھایا۔

"جگہ اور وقت میں تمہیں میسج کر دوں گا۔۔۔" شاویز نے خوشگوار مزاجی سے کہا اور اسائنمنٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

عارفہ خوشی سے چہک اٹھی تھی۔ اب تک وہ یونیورسٹی پر ہی ملتے رہے تھے۔ آج پہلی بار کہی باہر ملنے جا رہے تھے۔ عارفہ تو سوچ سوچ کر ہی مسرور ہو رہی تھی۔ اس کی مصروفیات میں مزید خلل ڈالے بغیر وہ فلحال کے لیے اس سے رخصت لیتی وہاں سے چلی گئی۔



سحر اپنے کمرے میں بیٹھی یونیورسٹی کا کام کر رہی تھی جب اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ کال عارفہ کی تھی۔

"ہاں عارفہ۔۔۔" سلام دعا کے بعد اس نے بنا وقت ضائع کئے اصل بات پوچھی۔

"مجھے تمہارے مدد کی سخت ضرورت ہے۔۔۔ ابھی کے ابھی میرے گھر آؤ۔" عارفہ نے عجلت میں اسے حاکمیت جتانے کے انداز میں کہا۔

"ابھی۔۔۔۔" سحر نے حیرانگی سے اس کا کہا لفظ دوہرایا۔

"تم کال پر بولو کیا مدد چاہیے۔" سحر نے گھڑی پر وقت دیکھا جو سہ پہر کے تین بجے بتا رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ابھی کے ابھی۔۔۔ جلدی سے۔۔۔ فوراً سے پہلے۔" عارفہ نے کام بتائے بغیر دو ٹوک انداز میں جواب دیا اور سحر کا جواب سننے بغیر کال بند کر دی۔

وہ موبائل ہاتھ میں لیئے کچھ دیر اسی طرح بیٹھی رہی پھر جانے کے لیے اٹھ گئی۔ کمرے سے باہر آئی تو دن کے اس پہر لاؤنج میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پاپا آفس سے آکر کچھ دیر آرام کرنے سوئے ہوئے تھے۔ صائم اپنے فٹبال میچ کے لیے گیا ہوا تھا۔

"کلثوم۔۔۔۔۔مما کہاں ہے۔۔۔۔۔" اس نے کچن میں بنا آواز کئے ہلکے ہاتھوں سے کام کرتی

ملازمہ کو مخاطب کیا۔

"میڈم کسی چیرٹی کے تقریب میں گئی ہے۔۔۔۔۔ بے بی جی "ملازمہ نے موودب انداز میں

جواب دیا۔

اس کی بات سن کر سحر سرد آہ بھرتے ہوئے باہر جانے لگی۔ پاپا سوراہے تھے۔ ماما اور صائم گھر

پر نہیں تھے اور عارفہ نے لازمی طور پر بلایا تھا۔ وہ کیا کرے۔

"پاپا اٹھے تو بتانا میں عارفہ کے گھر گئی ہوں۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر میں واپس آؤ گی۔" کچن سے باہر

جاتے جاتے اس نے ملازمہ کو پکارا تھا۔ وہ جی ٹھیک ہے کہتی اس کی ہدایت کی تکمیل کرنے لگی۔

سحر پورج میں آئی تو اس کی کار نہیں تھی۔ وہ دنگ رہ گئی۔

"کمال انکل۔۔۔۔ میری گاڑی کہاں ہے۔" اس نے چوکیدار کے کواٹر پر دستک دے کر اسے متوجہ کیا۔

پہلے اسے لگا صائم لے کر گیا ہے۔ اس نے تیزی سے پیچے مڑ کر دیکھا لیکن پورچ میں صائم کی بانک نہیں تھی اس کا مطلب وہ اپنی بانک پر ہی گیا تھا۔ تو پھر اس کی کار کہاں گئی؛ اس نے پریشان ہوتے ہوئے سوچا۔

"جی وہ۔۔۔۔ بیگم صاحبہ کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔۔۔۔ اس لیے اپنے ڈرائیور کو گاڑی مینک کے پاس لے جانے کا کہہ کر وہ خود گل خان کے ساتھ آپ کی گاڑی میں چلی گئی۔" چوکیدار نے اسے عابدہ بیگم کو درپیش مسائل سے آگاہ کرتے ہوئے ان کی صورتحال بتائی۔

سحر نے سر پر ہاتھ پٹخا۔ لوجی ہو گیا کام؛ سوچتی وہ مایوس ہو گئی۔ ایک طرف وہ اس کشمکش میں مبتلا تھی دوسری جانب عارفہ مسلسل اسے کالز پر کالز کیئے جا رہی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تم میرے ساتھ عارفہ کے گھر تک چلو" اس نے اپنا ڈوپٹہ سر پر پہنا۔
 ویسے تو دلا اور صاحب کی طرف سے پردے کی کوئی پابندی نہیں تھی صرف حیا اور عاجزی کی
 تاکید کرتے۔ سحر کی ڈریسنگ ہمیشہ با حیا ہی ہوتی۔

"بے بی جی۔۔۔۔ میں ساتھ آجاتا لیکن آج غلام مصطفیٰ چھٹی پر ہے۔۔۔۔ میں ڈیوٹی پر اکیلا ہوں۔۔۔۔ بڑے صاحب سے اجازت لیئے بغیر ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں جاسکتا" چوکیدار نے اپنے ساتھی چوکیدار کی غیر حاضری کا بتاتے ہوئے معذرت خواہاں انداز میں کہا۔

سحر تپ کر رہ گئی تھی۔ آج ہر طرف سے اس کو منفی جواب مل رہا تھا۔ وہ منہ بھسورتی پیر پٹختی اکیلے گھر سے نکل گئی۔

آس پاس ملا تشی نظریں دوڑاتی وہ محتاط انداز میں تیز تیز چل رہی تھی۔ اسے متواتر یہ خوف لگ رہا تھا کہ کہی سے وہ خفیہ تعاقب کار اس کے سامنے نہ آجائے۔

سہ پہر کے وقت سب اپنے گھروں میں آرام کر رہے ہوتے ہے۔ ان کے طویل سڑک پر اس وقت برائے نام کوئی پرندہ بھی نہیں تھا۔ وہ خوف و ہراس میں تیزی سے چلتی عارفہ کے گھر پہنچی اور زور سے دروازہ بجانے لگی۔



گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو اس کے سانس میں سانس آئی۔ لاؤنج میں عارفہ کی امی بیٹھی تھی۔ وہ سلام کرتی ان کے پاس آئی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کسی ہو سحر۔۔۔ تم تو اب آتی ہی نہیں ہو۔" طاہرہ آنٹی نے نرمی سے اسے پیار کرتے ہوئے حال احوال پوچھا۔

سحر نے لمبی سانس لیتے ہوئے سر جھٹکا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ڈریس دیکھنے لگی۔

"ان دونوں میں سے تو کوئی بھی اچھا نہیں ہے۔۔۔۔۔ ایک بار ات کا ڈریس لگا رہا ہے تو دوسرا ولیمے کا۔" سحر نے اس کے ہاتھ میں پکڑے بھاری بھر کم کام والے ڈریس پر تبصرہ کیا۔ پھر خود اٹھ کر اس کے کھلے اور بکھرے الماری تک گئی۔

"اسی لیے تو تجھے بلایا یا۔۔۔۔۔ مجھ سے تو ڈریس کا انتخاب ہی نہیں ہو پاتا۔" عارفہ تھک کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ سحر نے کچھ دیر غور سے اس کے الماری کا جائزہ لیا پھر ہاتھ بڑھا کر ایک ڈریس نکالا۔

"یہ ٹھیک رہے گا" وہ ایک نفیس سے ہلکے زری کے کام والا گلابی رنگ قمیض اور چوڑی دار پجامہ تھا۔ سحر نے ڈریس اس کے آگے کیا تو وہ خوشی سے اس کے گلے مل لی۔

"مجھے پتا تھا۔۔۔۔۔ تم ضرور میرا سب سے اچھا ڈریس پسند کر کے دو گی" عارفہ نے اس کے ہاتھ سے ڈریس لیا اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر ڈریس خود سے لگا کر دیکھنے لگی۔



دوائیوں کے بعد اسے کافی اچھی نیند آئی تھی۔ وہ اتنے راتوں کے درد تکلیف سہہ کر سویا تھا۔
اب اٹھا تو بہت فریش محسوس کر رہا تھا۔

اسے آج دلاور پرویز خان کی نئی کمپنی کا معائنہ کرنے جانا تھا جو آدھے سے زیادہ بن چکی تھی
اور ایک دو ماہ میں افتتاح کرنے والی تھی۔ سحر کو اتنا خوفزدہ کرنے کے بعد بھی وہ
خاموش تھی۔ گھر پر اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی بیسٹ فرینڈ سے بھی شہر
نہیں کیا تھا۔ اب اسے دلاور کو اذیت دینے کوئی بڑا قدم اٹھانا تھا۔

اپنا بلیک لباس پہن کر وہ آئینہ کے سامنے آیا۔ بال بنائے اور ماسک پہننے لگا کہ اس کی نظر اپنے
ناک پر ٹھہر گئی۔ اپنے عکس میں بچپن کی یاد نظر آنے لگی۔

وہ 7 سال کا بچہ شکلیں بناتے سی سی کرتا ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا۔ گول گول گہری آنکھیں پر نم تھی۔ اپنے عمر کے باقی بچوں کے بہ نسبت اس کا قد قدرے لمبا سا تھا۔

قاری صاحب اسے کلمے ٹھیک سے یاد نہ کرنے پر سزا دے رہے تھے۔ زور سے اپنی دو انگلیوں کے بیچ اس کی لمبی ناک دبائے ہوئے تھے۔

"دوبارہ پڑھو" موٹے جسامت؛ لمبی داڑھی والے قاری صاحب نے سخت لہجے میں رعب دار آواز میں اسے تنبیہ کیا۔

وہ آنکھیں چھوٹی بڑی کرتا پھر سے پہلا کلمہ دوہرانے لگا۔ ناک اب بھی قاری صاحب کے انگلیوں میں تھی جس سے اس کی آواز تو تلی اور زکام زدہ لگ رہی تھی وہ بے چینی سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگتا پھر قاری صاحب کی غصیلی نظروں سے ڈر جاتا؛ یقیناً اسے تکلیف ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھو۔۔۔۔۔ میں کیا لائی ہوں۔۔۔۔۔ جلدی سے لے لو۔۔۔۔۔ خالہ سے چھپا کر دو اٹھا کر لائی ہوں اپنے شاہ سوار کے لیے۔" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

وہ ماں سے ناراض تھا۔ اسی طرح منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ چاکلیٹ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"تم مجھ سے بالکل پیار نہیں کرتی۔۔۔۔۔ قاری صاحب سے بچانے کے بجائے تم نے انہیں

ناک چھوڑ کر کان پکڑنے کا کہا۔۔۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے ناک پکڑے یا کان۔۔۔۔۔ درد تو مجھے

ہی ہو گا۔" اس کی نادان زبان سے نکلے ان الفاظ نے زرتاج کا دل جلا دیا۔ اس کا دل آ رہا اس کا شاہ

سوار بڑا ہورہا تھا۔ وہ بہت ذہین بچہ تھا۔ اس کی اکثر باتیں اور سوالات ایسے ہوتے جو زرتاج کا

منہ بند کروا دیتے۔ اس کے پاس اپنے نور چشم کے سوالات کا جواب نہ ہوتا۔

"ہاں تو کیوں بچاؤں میں تمہیں قاری صاحب کی سزا سے۔۔۔۔۔ اسکول کے سبق تو اتنے

اچھے سے یاد کر لیتے ہو۔۔۔۔۔ اور اپنے دین کو یاد کرنے میں جان نکلتی ہے۔۔۔۔۔ جب میں

کلے یاد کروارہی ہوتی ہوں تب ٹھیک سے کیوں نہیں سنتے۔۔۔۔۔" زرتاج نے دے دے غصے سے اسے جھڑکا۔

اس کی ناک سرخ پڑ گئی تھی۔ زرتاج چاکلیٹ اس کے ننھے گود میں رکھتی چارپائی پر سے اٹھی۔ ٹوٹی ہوئی الماری کا دراز کھولا اور کریم لا کر اس کے سامنے گھٹنوں کے بل زمین پر ٹک گئی۔

"اور ناک چھوڑ کر کان پکڑنے کا اس لیے کہا۔۔۔۔۔ کیونکہ ناک کے بہ نسبت کان کی چمڑی سخت ہوتی ہے درد کم لگتا ہے۔" وہ اب ہلکے ہاتھوں سے اس کی ناک پر کریم لگا رہی تھی۔ وہ بے بسی سے ماں کے مڑجھائے چہرے کو دیکھنے لگا۔ پچھلے کئی سالوں سے اس کی ماں کافی بدل چکی تھی۔ خوبصورتی ڈھلنے لگی تھی۔ رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں انجان سی ویرانی تھی جو اس بچے کے سمجھ سے باہر تھی۔

"اور۔۔۔۔۔ سبق تو تم یاد کرتے نہیں ہو۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ قاری صاحب تمہاری ناک کھینچ کھینچ کر اس کا زاویہ خراب کر دے۔۔۔۔۔ کیونکہ تمہاری ناک بالکل

تمہارے پایا جیسی ہے۔۔۔۔" آخری جملہ کہتے ہوئے اس کی ماں کے چہرے پر سنگین مایوسی در آئی تھی۔

زر تاج نے اس کے ناک کے ساتھ ساتھ پورے چہرے اور ہاتھوں کو بھی کریم سے لت پت کر دیا اور خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

وہ اسی طرح افسردگی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ یہ اس کی ماں بھی جانتی تھی انجانے میں کہے اس جملے نے اسے بھی کافی مایوس کر دیا تھا اور خود زرتاج کو بھی۔ ان ماں بیٹے کے درمیاں ہونے والی گفتگو میں باپ کا ذکر ہمیشہ کم ہی آیا کرتا۔ وہ اور اس کی ماں یتیم خانے میں رہا کرتے تھے اس لیے اس نے کبھی اپنے باپ کے متعلق پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہاں اس جیسے کافی بچیں بچیاں تھیں جو بن ماں باپ کے رہتے تھے۔ اس نے از خود یہ اغذ کر لیا تھا کہ چونکہ وہ یتیم خانے میں رہتا ہے اس کا مطلب اس کا بھی کوئی باپ نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے یہ شکر ضرور ادا کیا تھا کم از کم اس کے پاس اس کی ماں تو ہے۔

اچانک اس تو انا مرد کا فون بجنے لگا۔ اس کے یادوں کی کڑی ٹوٹ گئی۔ وہ بچپن سے نکل کر جوانی کے دور میں لوٹ آیا۔ استخز یہ ہنستے ہوئے اس نے سر جھٹکا اور چہرے پر ماسک لگایا۔ سیٹرل ٹیبل پر پڑا اس کا فون بج بج کے اب بند ہو چکا تھا۔ کال راشد ہاشمی صاحب کے دفتر سے آرہی تھی جہاں وہ اتنے دنوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے فون جیب میں ڈالا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اس وقت راشد ہاشمی سے بات کرنے سے ضروری اس کے لیے دلا اور صاحب کے زیر تعمیر کمپنی جانا تھا۔



سحر واپسی پر اپنے گھر تک عارفہ کے ساتھ کار میں آئی۔ اپنے گھر کے سامنے اسے all the best دوش کرتی وہ کار سے اتر گئی۔

عارفہ شاویز کے میسج کئے وقت اور ایڈریس پر پہنچی تو شاویز پہلے سے وہاں موجود تھا۔ بلیک کلر کے ٹوپس سوٹ میں ملبوس سفید شرٹ کے پہلے دو بٹن کھلے رکھے تھے۔ بال تراشے ہوئے؛ شیور کھی ہوئی۔ چمکتے بوٹ پہنے وہ نفاست سے تیار عارفہ کا منتظر تھا۔

عارفہ لمبی ہیل والے سینڈل میں کار سے اتری۔ پرس کا چین کندھے پر ڈالا اور ڈوپٹہ گلے میں سیٹ کیا۔ گلابی رنگ قمیض اور چوڑی دار پجامہ کے ساتھ ہلکا میک اپ کئے۔ بال رول کئے۔ سلور کلر کی میچنگ باریک جیولری پہنے وہ قدم قدم چلتی اس کے پاس آئی۔

"ہائے شاویز۔۔۔۔ زیادہ ویٹ تو نہیں کیا" اس نے شرماتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

شاویز نے سر تا پیر اسے دیکھا۔

"اگر انتظار کا پھل اتنا خوبصورت ملتا ہے۔۔۔۔۔ پھر تو یہ انتظار بہت اچھی چیز ہے۔۔۔" اس

نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"I must say۔۔۔۔۔ تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔" شاویز نے اسے سراہتے ہوئے تعریفی

انداز میں کہا۔

"تھینکس۔۔۔۔۔ تم بھی ہینڈ سم لگ رہے ہو" عارفہ نے بلش کرتے ہوئے اس کی جوابی تعریف

کر دی۔

شاویز نے تعریف سمیٹتے ہوئے سر کو خم دیا اور ہلکے سے جھک کر اپنا دایاں ہاتھ اس کے آگے

کیا۔

عارفہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کے پیچھے اس وسیع و عریض فائف سٹار ریسٹورانٹ کی عالی شان عمارت پر نظر دوڑائی۔

شاویز۔۔۔۔۔ میں تو صرف تمہارے ساتھ وقت گزارنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اس کے لیے اتنی مہنگی جگہ آنے کی کیا ضرورت تھی۔" عارفہ نے متفکر انداز میں کہا۔

"پہلی مرتبہ تمہارے ساتھ ڈیٹ پر جا رہا تھا۔۔۔۔۔ کسی عام سی جگہ تھوڑی ہی بلاتا تمہیں۔" شاویز نے ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈال رکھا تھا اور دوسرے سے عارفہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

اس ملاقات کو ڈیٹ کا نام دینے پر عارفہ چھنپ سی گئی۔ اس نے شرم سے نظریں جھکا دی۔

ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال میں داخل ہو کر اس نے دیکھا کچھ کچھ فاصلے سے میز پر کپلز اور فیملیز بیٹھے کھانے پینے میں مصروف تھے۔

شیشے کے ساتھ ایک میز پر شاویز آگے ہوا اور کرسی کھینچ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ پہلی دفعہ کسی لڑکے کے ہمراہ ریسٹورنٹ آئی تھی۔ شرم، مسرت، پیار، سب کے ملے جلے تاثرات سے وہ مشکور ہوتی کرسی پر بیٹھی۔ شاویز اس کے آوٹ سے گھوم کر آیا۔ کوٹ کے بٹن کھولتا اس نے سامنے کی نشست سنبھال لی۔

ویٹران کے پاس آیا اور آرڈر نوٹ کرنے لگا۔ جب تک شاویز اسے آرڈر نوٹ کروا رہا تھا عارفہ شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

باہر سوئمنگ پول کے ساتھ بھی کچھ میز اور کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ آسمان میں پھلتے نیلاہٹ کے لیے پلر سے جڑے لائٹس روشن کر دی گئی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اس نظارے کو دیکھ

رہی تھی۔ ویٹر واپس مڑا تو وہ شاویز کے جانب متوجہ ہوئی۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں خود پر محسوس کرتے وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"ویسے تم اس دن کیفیٹر یا سے نکل کر مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی تھی۔" باتوں باتوں میں اس نے شرارتی انداز میں عارفہ کو یاد دلایا۔

"اسے اب تک وہ بات یاد ہے" سوچتے ہوئے عارفہ کے رخسار سرخ پڑنے لگے۔

"بنا پوچھے ہی مجھے اس سوال کا جواب مل گیا ہے" عارفہ نے سرشار ہوتے ہوئے چمکتی آنکھوں سے شاویز کو دیکھا۔

اس کے جواب سے محفوظ ہوتے ہوئے شاویز آگے کو ہوا۔ کہنیاں میز پر ٹکائی۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بنا کر چہرہ اس پر ٹکایا۔

"اور وہ کیسے" اس نے تعجبی نظروں سے عارفہ کا بلش کر تا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔

عارفہ مسکراہٹ دبائے ہوئے اسی کے سے انداز میں کہنیاں میز پر ٹکا کر بیٹھی۔

"وہ ایسے۔۔۔۔۔ کہ اگر تم کہی اور committed سپرد؛ مرتکب) ہوتے تو۔۔۔۔۔ آج ایسے سوٹ بوٹ میں تیار ہو کر میرے ساتھ ڈیٹ پر تھوڑی آتے۔" اس نے آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے کہا۔

اس کی بات پر شاویز کھکھلا کر ہنسا۔ اسے اس طرح ہنستادیکھ کر عارفہ بھی ہلکے سے ہنسی تھی۔ آرڈر بن کر آیا تو وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے کھانے میں مصروف ہو گئے۔ شام ڈھل چکی تھی۔ کھانے کے بعد میٹھے میں آئس کریم سے لطف اندوز ہو کر اب شاویز بل کی ادائیگی کر رہا تھا۔

پچھلی دفعہ جب عارفہ نے اس سے پرسنل سوالات پوچھے تھے تو وہ متفکر ہو گیا تھا۔ چہرے پر انجان سی مایوسی در آئی تھی۔ بہت محتاط انداز اختیار کئے ہوئے تھا۔

وہ پڑھائی کے علاوہ کیا کام کرتا ہے؛ کہاں سے کماتا ہے؛ کہاں رہتا ہے؛ فیملی میں کون کون ہے۔ ایسے سوالات کر کے عارفہ پھر سے اسے مضطرب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ اچھا لڑکا ہے۔ سب کے ساتھ عزت و احترام سے رہتا ہے۔ غلط کاموں میں ملوث نہیں ہے۔ استعمال منشیات جیسی کوئی بری عادتیں نہیں ہے؛ عارفہ کے فلحال اس کی شخصیت سے متعلق اتنی معلومات کافی تھی۔

ریسٹورنٹ کے چمکتے روش پر چلتے وہ دونوں باہر آئے۔ عارفہ کا ڈرائیور تب تک کارلے کر گیٹ کے سامنے آچکا تھا۔

"میرے ساتھ چلو شاویز۔۔۔۔۔ پہلے تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔" عارفہ نے پیار سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر آفر کیا۔ شاویز نے ہلکے سے سر کو نفی میں جنبش دیا۔

"مجھے ابھی ایک اور جگہ جانا ہے۔۔۔ تمہارے ساتھ کسی اور دن آ جاؤ گا" اس نے معصومیت سے مسکرا کر کہا۔

اتنے عرصے سے اس کے ساتھ چلتے پھرتے عارفہ شاویز کا مزاج کسی حد تک سمجھ گئی تھی۔ وہ اپنی پرسنل زندگی کسی پر عیاں نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی عارفہ جانتی تھی اسے سیدھے سادے منع کرنے کے بجائے وہ بہانہ کر رہا ہے۔ اسے مزید پریشانی میں ڈالنے کے بجائے عارفہ نے اس سے رخصت لی اور اپنی کار میں جا کر بیٹھ گئی۔ کار کے روانہ ہوتے ہی وہ دوسری سمت پیدل چلنے لگا۔

عارفہ رخ موڑے شیشے میں تب تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ پوری طرح آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

پھر سیدھے ہو کر وہ اپنے آپ میں مسکرانے لگی۔

"تمہیں کیسے بتاؤں شاویز۔۔۔۔۔ تمہارے اسی مردانگی اور غیرت مند انداز پر تو میں دل ہار بیٹھی ہوں۔۔۔۔۔ آج کے ملاقات کے بعد اب میرے دل میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ میں دل و جان سے تمہیں چاہنے لگی ہوں۔۔۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔۔۔" ونڈ

اسکرین کے باہر دیکھتی عارفہ دل ہی دل میں شاویز کے لیے اپنی محبت کا اعتراف کر چکی تھی۔
اب اسے اس موقع کا انتظار ہونے لگا تھا جب وہ شاویز سے اپنی محبت کا اظہار کرے گی۔



وہ آپر کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ تیز نظروں سے آس پاس دیکھ رہا تھا۔ کمپنی کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا صرف سامان لاد کر آغاز کرنے کی دیر تھی۔ شام کا وقت تھا سب کار ایگر اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ ہر ایک کونے میں سیکیورٹی کیمروں سے خود کو محفوظ رکھتا وہ تیز رفتار سے چلتا سب تعمیری کام کو ملاحظہ کرتا رہا۔ اس عمارت سے نکل کر وہ کچھ فاصلے پر ایک گھنے درخت کی آڑ میں چھپ کر بیٹھا۔ موبائل سے باہری سمت کی کچھ تصاویر کھینچی۔ جیب سے پین اور

چھوٹی سی نوٹ پیڈ نکال کر کچھ نقشہ بنایا۔ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اٹھا اور اپنے کار کارخ کیا۔

گھر پہنچ کر اس نے پہلا کام دماغ میں بنائے نقشے اور موبائل کے تصاویروں کے ذریعے سارا پلان کتاچے میں اتارا۔

اپنے ورکنگ ایریا کے کرسی پر بیٹھ کر وائس ٹرانسمیٹر سے اپنا موبائل جوڑا اور ایک نمبر ملا یا۔ وائس ٹرانسمیٹر سے اس کی آواز کچھ بھاری اور دب دبی سی ہو جاتی ہے۔ ساتھ ساتھ اگر کبھی کال ٹریس ہو تو وہ آواز پہچان میں نہیں آسکتی تھی۔ وہ کسی بھی صورت کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔

کال اٹھانے پر اس نے راشد ہاشمی سے بات کرنے کا کہا۔

"سنا ہے۔۔۔۔۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس لحاظ سے ہم دوست

ہوئے۔۔۔۔۔ کیونکہ میرا اور تمہارا دشمن ایک ہی ہے۔۔۔۔۔ راشد ہاشمی صاحب۔۔۔" اس نے

کال پر راشد صاحب کی ہیلو سنتے ساتھ ہی کہا۔ ان کی سیکرٹری کو وہ پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا کہ وہ

ان سے کس موضوع پر تبادلہ خیال کرنا چاہتا ہے۔

بات کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے دلاور پرویز خان کی تصویر کو

دیکھا۔ لہجاسپاٹ اور بے تاثر تھا۔

"کس دشمن کی بات کر رہے ہو۔۔۔۔۔" اس کے سماعتوں میں راشد صاحب کی آواز گونجی۔

راشد ہاشمی بزنس کے دنیا کا دوسرا معمر نام تھا۔ دلاور پرویز خان جتنا نیک؛ ایماندار؛ پر خلوص؛

ذہین؛ رحم دل؛ دیانت دار؛ بارعب؛ با اعتماد؛ اور اعلیٰ ظرف شخص تھے۔ راشد ہاشمی اتنا ہی

حاسد؛ کم ظرف؛ ظالم؛ بے حس؛ بے ایمان؛ کم عقل؛ دو غلے پن سے بھرپور شخص تھا۔ اگر

دلاور صاحب نے ایمانداری؛ لگن اور محنت سے یہ مقام حاصل کیا تھا تو راشد ہاشمی نے مظلوم کا

حق چھین کر زبردستی زمینداروں کی زمینوں پر قبضہ کر کے کرپشن کر کے بزنس بنایا تھا۔ اسے دلاور صاحب کی کامیابیوں سے خاصی جلن اور حسد ہوتی۔ وہ اپنے اس کم ظرفی کے چلتے دلاور صاحب کے بزنس کو پس پشت ڈالنا چاہتا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ پہلے بھی کوشش کی تھی لیکن دلاور صاحب نے اس کے کسی بھی غلط منصوبے کو رسائی حاصل نہیں ہونے دی۔

اپنے غنڈہ گردی اور بے ایمانی کے کاموں کے لیے راشد ہاشمی نے الگ سے 5 سے 6 بندے تعینات کر رکھے تھے۔

"تمہارا تو نہیں پتا۔۔۔۔۔ پر میرا فلحال ایک ہی ہے۔۔۔۔۔ جو اتفاق سے ہمارا مشترکہ ہے۔۔۔۔۔ وہ دلاور پرویز خان ہے۔۔۔" اس نے استخزیہ ہنستے ہوئے کہا۔

راشد صاحب کچھ لمحے خاموش ہو گئے جیسے سوچ میں پڑ گئے ہو۔ جتنی دیر وہ خاموش تھے۔ اس نے اپنے بڑے کمپیوٹر پر تیز تیز انگلیاں چلا کر ان کے گھر کے سٹڈی روم کا سیکورٹی کیمرہ ایک

وہ 55 سالہ درمیانہ شکل آدمی اپنی سیٹ پر بیٹھا غور سے فون کان سے لگائے ہوئے تھے۔

"اتنا مت سوچیے مجھے راشد صاحب۔۔۔۔۔ میں تیری سمجھ سے باہر کی چیز ہوں۔۔۔۔۔"

اپنی تیز نظریں اس نے کمپیوٹر اسکرین پر نظر آتے راشد صاحب پر مرکوز کر لی تھی۔

"تو یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو" راشد صاحب سرد مہری سے بولے تھے۔

"میرے پاس ایک ڈیل ہے۔" بنامزید وقت ضائع کئے وہ مدد پر آیا۔

"کیسی ڈیل" راشد صاحب نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا

وہ بہت مہارت سے اپنے اندر اٹھتے جذبات قابو کئے ہوئے تھا۔ راشد ہاشمی صاحب کا یہ ٹون اسے شدید غصہ دلایا تھا۔

"تم دلاور پرویز خان کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ اور میں اسے برباد کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ ہم دونوں کا دشمن اور اسے تباہ کرنے کا مقصد ایک ہی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے تیز آواز میں کہا۔

اب کی بار اس نے اسکرین پر راشد صاحب کے لبوں پر مسکراہٹ پھلتے دیکھی۔ وہ اس کی بات سے متاثر نظر آرہے تھے۔

"ڈیل کیا ہے" راشد صاحب نے اس مرتبہ قدرے نرمی سے کہا۔ ان کی آواز سے خوشی صاف چھلک رہی تھی۔

"ڈیل یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ نہ تم اکیلے اسے گرا سکتے ہو۔۔۔۔۔ نہ میں اکیلے اتنا سب manage کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔ تو ہم ہاتھ ملا لیتے ہے۔۔۔۔۔ دونوں مل کر دلاور کی خوشیاں اور کامیا بیاں مٹھی میں ملا تے ہیں۔۔۔۔۔" اس نے خوشگوار مزاجی سے اپنا مطالبہ بیان کیا۔

راشد صاحب محفوظ ہوتے ہوئے کرسی پر آگے کو ہوئے اور سگار کے ڈبی سے سگار نکال کر منہ میں دبایا۔ وہ دلاور کی بربادی کا سوچ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"کرنا کیا ہو گا" اس نے راشد صاحب کا اگلا سوال سنا۔

اسے اپنا مار گٹ پھنستا ہوا لگا۔

"اس کی خوشیاں شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیں گے۔۔۔۔۔ اس کی نئی کمپنی کو آگ لگا دیں گے۔" اس نے شعلہ برساتی زبان سے راشد صاحب کو جواب دیا۔

راشد صاحب کی آنکھیں کھل گئی آبرو حیرانگی سے پھیل گئے۔

"اس کام کی کیا قیمت چاہیے تمہیں۔" راشد ہاشمی صاحب نے اسے اپنے ٹیم میں شامل کرنے کی پیشکش کی۔

"ہاہاہا۔۔۔۔۔راشد صاحب میں وہ انمول رتن ہوں۔۔۔۔۔جیسے دنیا کا کوئی خزانہ نہیں خرید سکتا۔۔۔۔۔" وہ راشد صاحب کی پیشکش پر کھلکھلا کر ہنسا۔

"ڈیل یہ ہے کہ۔۔۔۔ میں تمہیں پلان فراہم کروں گا۔۔۔۔ اور اپنے آدمیوں کے ذریعے وہاں آگ تم لگوا کر دوں گے۔" اس نے تھکی نظریں گھما کر دلاور کی تصویر کو دیکھا۔

"منظور ہے۔۔۔۔۔ لیکن میں تمہارا یقین کیسے کروں۔۔۔۔۔ اگر تم دلاور کے ہی آدمی تھے تو۔۔۔۔۔ یا پولیس کے خفیہ جاسوس" راشد صاحب نے سخت لہجے میں رعب دار آواز میں کہا۔

اس نے سر جھٹکا اور اپنے لیپ ٹاپ پر سے وہ پلان راشد ہاشمی کو ای میل کر دیا جو وہ کچھ دیر پہلے تیار کر چکا تھا۔

"پلان بھیج دیا ہے۔۔۔۔۔ اپنے پاس محفوظ کر لو۔۔۔۔۔ اگر مجھ پر یقین نہیں ہے تو۔۔۔۔۔"

اس نے سر دمہری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

راشد صاحب نے تعجبی کیفیت میں ای میل کھولا۔ وہاں لکھے عبارت اور نقشہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ شاک کی حالت میں ان کے ہاتھ میں پکڑا جلتا سگار سرک کر ان کے کپڑوں پر گر گیا۔ وہ فون کار سیور چھوڑتے؛ ہڑبڑا کر اٹھے اور اپنی قمیض جھاڑی۔

"ارے ارے آرام سے راشد صاحب۔۔۔۔۔ کہی دلاور کے کمپنی سے پہلے تمہیں نہ آگ لگ جائے۔۔۔۔۔" اس نے اپنی شرارتی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

کپڑے چھاڑتے؛ سگار واپس اٹھا کر انہوں نے فون کان سے لگایا تو طنزیہ انداز میں اس لڑکے کی آواز سنی۔

انہوں نے محتاط انداز میں آس پاس دیکھا۔

"اسے کیسے پتا چلا" دل میں سوچتے ہوئے راشد ہاشمی کے آبرو تن گئے۔

"کون ہو تم" وہ کھا جانے والے انداز میں آگ بگولا ہوتے ہوئے فون پر غرائے۔

"یقین جانور اشد ہاشمی۔۔۔۔۔ میں بہت کمینی چیز ہوں۔۔۔۔۔" اس نے سخت لہجے میں بھاری آواز بنائی۔

"آگ کس دن اور کس وقت لگانی ہے۔۔۔۔۔ یہ میں تمہیں اگلے کال پر بتاؤں گا۔۔۔۔۔"

میرے کال کا انتظار کرنا "اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور موبائل پٹخ کر کال کاٹ دی۔

ضبط کرتے ہوئے وہ اٹھا اور بیڈ پر نیم دراز بیٹھ گیا۔ پھر آگے کالائچہ عمل طے کرنے لگا۔



شاویز اس رات کافی دیر گئے تک گھر نہیں گیا۔ وہ ریسٹورنٹ سے اسی سوٹ بوٹ میں ملبوس سی ویو پر آگیا تھا۔ بوٹ اور کوٹ اتار کر اس وقت وہ ننگے پیر سمندر کے کنارے گیلی ریت پر چل رہا تھا۔ وہ یہاں دوستیاں کرنے یا رشتے بنانے کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔ اس لیے اب اسے عارفہ کے بڑھتے جذبات سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسے اپنے لیے عارفہ کی دلچسپی کا پہلے دن سے ہی اندازہ تھا۔ وہ ہر دفعہ اسے سمجھانے کی نیت سے ملتا لیکن ہر بار عارفہ کی معصومیت اور خوش دلی؛ اسے کچھ کہنے نہیں دیتی۔ آج کی ملاقات میں اسے عارفہ کی آنکھوں میں اپنے لیے والہانہ پن صاف نظر آرہا تھا۔ وہ جہاں سے آیا تھا جس طرح کی زندگی وہ جی رہا تھا۔ وہاں عارفہ کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور نہ ہی وہ بنانا چاہتا تھا۔ اب اسے یہ تشویش تھی کہ کسی طرح کسی بھی وجہ سے عارفہ اس سے بدگمان ہو جائے اور دور چلی جائے۔



ان دو واقعات کے بعد سحر محتاط ہو گئی تھی۔ وہ کہی اکیلے آتی جاتی نہیں تھی۔ عارفہ کے گھر تک بھی گاڑی میں جاتی یا کسی چوکیدار کو اپنے ہمراہ لے کر جاتی۔

اس کے سارے پسندیدہ مشاغل جیسے مارکیٹ جانا؛ پارک میں چہل قدمی کرنا؛ پینٹنگ کلاس سے کسی کافی شاپ میں چلے جانا؛ سب اس نے ترک کر دیئے تھے۔ یونیورسٹی میں بھی پہلے سے زیادہ سنجیدہ رہنے لگی تھی۔

اس دن بریک ٹائم میں بھی سب کلاس میں ہی رہے۔ ان کے کلاس کاجون کے گرمیوں کے ان دنوں کو کچھ خوشگوار بنانے کے لیے کسی دیدہ زیب علاقے میں سیر و تفریح کرنے پکنک پر جانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

کلاس کے سی آر نے سب کو کوئی نہ کوئی ذمہ داری سونپی ہوئی تھی۔ عارفہ اور شاوینز کو پیسے جمع کر کے سب کی لسٹ بنانے کا کام کرنا تھا۔

وہ تقریباً پوری کلاس سے پیمنٹ وصول کرنے کے بعد سحر کے پاس آئے جو کونے کی سیٹ پر خاموشی سے بیٹھی تھی۔

"چل سحر اپنی بھی دے اور میری بھی پیمنٹ کروا۔" عارفہ اس کے سامنے میز پر چڑھ کر بیٹھی اور اس کا پرس اٹھا کر پیسے نکالنے لگی۔

شاویز مسکراتے ہوئے ان دونوں کی کاروائی دیکھ رہا تھا۔

اس کی تقریباً سب سے کافی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ سحر سے اس کی دوستی تو نہیں ہوئی تھی پر اس کا وہ سخت اور پیچیدہ لہجہ ہموار ہو گیا تھا۔ اب وہ دونوں کہی مل جاتے تو رک کر سلام دعا کر لیتے۔ پڑھائی کے متعلق کوئی مشکل ہوتی تو ایک دوسرے کی مدد بھی کر دیتے۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا جانے کا۔۔۔" سحر نے بے تاثر سے انداز میں کہا۔

اس کا یہ جواب سن کر عارفہ ٹھٹک گئی اور میز پر سے اتر کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ میرے ہوتے ہوئے تم جانے سے انکار کیسے کر سکتی ہو۔" عارفہ نے دبے دبے غصے سے اسے جھڑکا۔

enjoy۔۔۔۔ تم نہیں آئی تو ہمارا بھی دل نہیں لگے گا۔ "شاویز نے اپنے طرف سے اسے
قابل کرنے کی کوشش کی۔

"کم آن سحر۔۔۔۔ دیکھو اب تو شاویز نے بھی کہہ دیا۔" عارفہ نے آنکھ مار کر سحر کو اشارہ کیا۔

وہ سر جھٹکتی ہوئی مسکرا نے لگی۔ ایک نظر چمکتی ہوئی عارفہ کو دیکھا پھر دوسری نظر خوش مزاج سے شاویز کو۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ چلوں گی" اس نے عارفہ کے رخسار پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ آہ کرتی اپنا گال سہلانے لگی۔ شاویز نے اس کا نام لسٹ میں شامل کیا اور آگے بڑھ گیا جبکہ عارفہ وہی بیٹھی رہی۔

"سحر کوئی پر اہلم ہے کیا۔۔۔۔۔ تم بہت اداس رہنے لگی ہو۔۔۔۔۔" عارفہ نے متفکر انداز میں اس کے ہاتھ کو تھام کر اندیشہ ظاہر کیا۔

سحر خود نہیں سمجھ پارہی تھی کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے تو وہ عارفہ کو کیا بتاتی۔

"نہیں میری جان۔۔۔ کوئی پر اہلم نہیں ہے۔۔۔ سب ٹھیک ہے" سحر نے زبردستی مسکرا نے کی کوشش کی۔

"پکانا" عارفہ نے سختی سے تنے ہوئے اعصاب سے اس سے تصدیق مانگی۔

"بلکل پکا۔۔۔ تم سے کبھی کچھ چپایا ہے کیا۔" سحر نے ہنہ کرتے ہوئے مضبوطی سے اس کے گلے کے گرد بازو مائل کئے۔ منہ بھسورتے ہوئے عارفہ نے خود کو اس کے بازوؤں سے آزاد کیا اور دونوں ہی ہنسنے لگی۔



ہفتے کی صبح 7 بجے ان کے بس کو پکنک پوائنٹ کے لیے نکلنا تھا۔ ہر سٹوڈنٹ کو ہدایت تھی اپنے ساتھ سفری بیگ میں ایک جوڑا کپڑے؛ جوتے؛ اشیائے خورد و نوش؛ اوڑھنے کے لیے چادر اور فرسٹ ایڈ کا باکس بھی لے کر آئے۔

جہاں وہ لوگ جا رہے تھے وہ بالکل سحر کے من پسند قدرتی مناظر سے سرشار جگہ تھی۔ چشمے سے بہتا پانی؛ سبزہ زار؛ ندی؛ اس کے آگے جنگل اور پھر پہاڑ۔ سحر اپنے ساتھ کچھ پیٹنگ کا سامان بھی لے کر گئی تاکہ اس جگہ کی خوبصورتی کو کینوس پر بنا سکے۔

بس اس وقت لوڈ کی جارہی تھی۔ لاریب شہزاد نبیل صمد اور باقی لڑکوں کے بشمول شاویز بھی سامان رکھنے کے کام میں مصروف رہا۔ عارفہ سحر منال علشبہ اور دو تین اور کلاس میٹس لڑکیاں بس میں چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ صبح سویرے اس پہر موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہوا کے چلنے سے گرمی کافی کم محسوس ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے کے محنت کے بعد سب لڑکے بھی بس میں

سوار ہوئے۔ آہستہ آہستہ بس اپنے منزل کے جانب روانہ ہو گئی۔ 3 گھنٹے کا وہ راستہ مستی مذاق
ناچتے گاتے گزارا۔

اپنے مطلوبہ جگہ پر پہنچ کر ایک جگہ بس رک گئی جہاں سے آگے کچا راستہ شروع ہوتا تھا اور بس
کے آگے جانے کے امکانات نہیں تھے۔ سب اپنا اپنا بیگ اٹھائے بس سے اتر گئے۔ یہاں سے
آگے کا سفر ان کو پیدل چل کر طے کرنا تھا۔ وہ ایک پتھر یلا غیر موازنہ راستہ تھا۔ پہاڑیوں کے
پار گزرتے ہوئے ان کو اپنے جائے وقوعہ پر پہنچنا تھا۔ سب اپنے جوتے کس کر بیگ کندھے پر
ڈال کر قدم قدم چلنے لگے۔

ان کو پتھر یلے چوٹی پر اوپر کی جانب چڑھ کر جانا تھا کیونکہ نیچے سے ندی نکل رہی تھی وہاں سے
گزرنے کا مناسب راستہ نہیں تھا۔ سی آر سب سے آگے چلتے بلند آواز میں ان کو گائیڈ کرتا رہا۔

عارفہ اور سحر اپنا بیگ کندھے پر ڈالے؛ ہاتھ پکڑے احتیاط سے چلتی رہی۔ ایک جگہ پر ان کو ایک چوٹی سے دوسری چوٹی پر چھلانگ لگا کر جانا تھا۔ اس جگہ شاویز پہلے جمپ کر کے گیا پھر ہاتھ بڑھا کر عارفہ کو کھائی پار کروائی۔ اس کے حرکات کو مشاہدہ کرتے شہزاد بھی اسی طرح پہلے خود گیا پھر سحر کے جانب ہاتھ بڑھایا۔

شہزاد اور سحر فرسٹ ایئر سے کلاس میٹ تھے۔ شہزاد دل ہی دل میں سحر کو پسند بھی کرتا تھا لیکن سحر نے کبھی کسی لڑکے سے حد سے زیادہ بات کرنا بھی گوارا نہ کیا تھا تو شہزاد سے دوستی بہت دور کی بات تھی۔

جب شہزاد نے سحر کی مدد کرنے ہاتھ بڑھایا تو شاویز نے مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اور عارفہ اسی طرح ان کو دیکھنے لگے۔ سحر کو شہزاد سے مدد لینے میں کوفت محسوس ہونے لگی تھی اور خود بنا سہارے کے کھائی پار کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس نے ایک پھیکی مسکراہٹ

کے ساتھ شہزاد کو دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑنے کے بجائے خود ہی شاویز کی جانب ہاتھ بڑھایا جو شاویز نے پھرتی سے آگے ہو کر تھام لیا اور اسے کھائی پیار کروانے میں مدد کی۔

سحر کو مضبوطی سے پکڑے اسے اپنے جانب کر کے شاوینز سیدھا ہوا تھا کہ اس نے لاریب کی
پکار سنی۔

"ارے کمینو۔۔۔۔۔ کہاں پھنسا دیا۔۔۔۔۔ نیچے اتارو۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔" وہ ان سے اوپری سطح پر ایک جگہ ساکت بیٹھا اپنی پوری قوت سے پتھر کو جکڑے ہوئے تھا۔

"لاریب۔۔۔۔ تم وہاں کیا کر رہے ہو۔" شاویز نے منہ کے آگے ہاتھ کا گولہ بنا کر اسے آواز لگائی۔

"ارے ان کمینوں نے کہا۔۔۔۔ ادھر سے شارٹ کٹ ہے" اس نے نبیل اور باقی ساتھیوں کے جانب اشارہ کر کے کہا۔ ڈر کے مارے وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

شاویز بہت مہارت سے ایک چٹان سے دوسرے پھر تیسرے پر چڑھنے لگا۔

عارفہ اور سحر ناخن چباتے اس کے لیے دل میں دعائیں پڑھنے لگی۔ باقی سب وہاں سے جا چکے تھے۔ صرف عارفہ اور سحر ان کی منتظر کھڑی رہی۔

ایک چٹان پر کافی پھسلن تھا۔ شاویز ڈگمگا گیا۔ عارفہ چیخ مارتی سحر کے کندھے سے لگ گئی اور آنکھیں مینچھ لی۔ وہاں کا ڈھلان اتنا نیچے تھا کہ ایک پل کے لیے سحر کا دل بھی دہل گیا۔ شاویز کو جیسے لاریب تک رسائی ملی وہ ہاتھ بڑھا کر اس سے لپک گیا اور بچوں کی طرح اس کی گود میں چڑھ گیا۔

خوشی سے وہ شاویز کو پیار کرنے لگا اس کے پیشانی پر بوسہ دیا۔ شاویز اسی طرح اسے گود میں اٹھائے احتیاط سے نیچے آیا۔ کھائی پار کر کے عارفہ اور سحر تک پہنچنے تک لاریب شاویز کے بازوؤں میں رہا۔ پھر جا کر اسے نیچے اتارا۔ عارفہ تو جھٹ سے شاویز کے قریب ہوئی۔

"تم ٹھیک ہو" اس نے خوف اور محبت کے ملے جلے تاثرات سے شاویز کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
شاویز نے محض سر کو خم دے کر اپنی سلامتی کی تصدیق دی۔

سحر بچوں کی طرح مایوس لاریب کو دیکھنے لگی۔

"کوئی کہہ دے۔۔۔۔۔ کنویں میں چھلانگ لگا دے۔۔۔۔۔ تو تم لگا دو گے۔۔۔۔۔" سحر نے جعلی
خفگی سے اسے جھڑکا۔ وہ شرم سے سرخ پڑنے لگا۔

"کچھ ہو جاتا تو۔۔۔۔۔" اب کی بار سحر کا لہجہ ہمدردانہ اور متفکر تھا۔ لاریب اسی خاموشی سے
لب کاٹنے لگا۔

"چلو۔۔۔۔۔ اب میرے ساتھ ہی رہنا۔۔۔۔۔ ادھر ادھر مت نکلنا" سحر نے مسکراتے
ہوئے بڑی بہن جیسے اس کا ہاتھ تھاما اور ساتھ لے جانے لگی۔ لاریب اس کے نرمی پر پوری بتی
سی دکھا کر مسکرایا تھا اور مطمئن ہو کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔
"بندر کہی کا۔۔۔" عارفہ نے شاویز کی آوٹ سے بلند آواز لگائی۔

"چڑیل کہی کی۔۔۔۔" لاریب نے منہ بھسورتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو چڑیل بندر سے تو اچھی ہی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ بے وقوف۔۔۔۔" عارفہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ لاریب سحر کی آوٹ سے بات کر رہا تھا تو عارفہ شاویز کے آوٹ سے۔

"تو چمڑ جا۔۔۔۔۔ اندر ہی گھس جا اس کے۔۔۔" لاریب نے ہاتھ اٹھا کر ہلاتے ہوئے اشارہ کیا۔ وہ جو پہلے ہی شاویز کا بازو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ اس طنزیہ بات پر تپ کے رہ گئی۔

"مارو گی اب تمہیں" عارفہ ہاتھ اٹھا کر اس پر جھڑپنے لگی۔

"اووو ہیلو guys۔۔۔۔۔ یہ کوئی جگہ ہے لڑنے کی۔۔۔۔۔ دیکھو سب کتنا آگے نکل گئے ہیں۔۔۔۔۔ جلدی جلدی چلو پلیز۔۔۔۔" شاویز ان دونوں کے مابین آیا۔ ہاتھ اٹھا کر ان کی لڑائی روکی اور تیز چلنے کی تردید کی۔

پیر لمبے پھیلائے وہ سینے پر ہاتھ باندھے بیڈ پہ بیٹھا تھا۔

"کیا دلاور پرویز خان اپنے خواب کو چکنا چور ہوتے دیکھ کر روئے گا۔۔۔۔ یا اپنا گریبان پکڑ لے گا۔۔۔۔ یا سر کے بال نوچ لے گا۔۔۔۔" وہ سردوسپاٹ انداز میں سوچتے سوچتے یادوں کی گلیوں میں کھو گیا۔

زبیدہ خالہ زرتاج کو چپ کروانے اور آواز آہستہ رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے دلاسہ دینے لگی۔

"حوصلہ رکھو زرتاج۔۔۔۔۔ میں سنبھال لوں گی۔۔۔۔۔ تم بس یہاں سے باہر نہیں نکلنا۔" اڈھیر عمر زبیدہ خالہ نے زرتاج کو سر پر ہاتھ پھیر کر دلا سہ دیا۔ اسے چپ کرواتے وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور باہر سے تالہ لگا دیا۔ اسے نیچے بیٹھا کر زرتاج اٹھی اور کمرے کی ساری لائٹیں بند کر دی۔ زرتاج واپس اس کے پاس آ کر بیٹھی تو اندھیرے کے خوف سے وہ پھر سے ماں کی حصار میں چھپ گیا۔

زرتاج مسلسل زیر لب دعائیں پڑھ کر اس پر اور کمرے میں پھونک رہی تھی۔ آنسو اب رک چکے تھے لیکن دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ اس سے سر لگائے وہ ماں کا دلآرہ واضح طور پر سن سکتا تھا۔

"ماں۔۔۔۔۔ یہ لوگ مجھے تم سے الگ کر دے گے۔" تو تلی زبان سے ٹوٹی پھوٹی بولتی میں اس نے ماں سے خدشہ ظاہر کیا۔

زرتاج جو ملا تشی نظروں سے آس پاس دیکھ رہی تھی۔ کان لگائے غور سے باہر برپاشور سن رہی تھی اچانک اس کے اندیشے پر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

اپنے بھیگی آنکھوں سے اس کے ننھی گول گول آنکھوں میں دیکھ کر پھیکا مسکرائی۔

"نہیں میری جان۔۔۔۔۔ تمہیں مجھ سے کوئی الگ نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ میرے جیتے

جی۔۔۔۔۔ میں کسی کو تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی۔ "زر تاج کے اندر ممتا کا ولولہ امڑ
امڑ کر آ رہا تھا۔

ماں کا تسلی بخش جواب سن کر وہ پورے دل سے مسکرایا۔ اس پل اسے بلا کا تحفظ محسوس ہوا۔
اس کی ماں ہے نا اس کے پاس؛ اس سوچ نے اس کا سارا خوف ر فو چکر کر دیا۔

وہ دن گزرنے کے کافی دن بعد زرتاج کنویں کے پاس بیٹھی اس کے کپڑے دھورہی تھی۔

"ماں دلاور کون ہے۔" وہ پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھا تھا جب یک دم سے اس نے یہ سوال پوچھا۔ زرتاج کے تیز تیز چلتے ہاتھ رک گئے۔ تعجبی نظروں سے اسے دیکھا۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

"تم کیسے جانتے ہو اس نام کو" زرتاج نے تنہ ہوئے اعصاب سے اسے دیکھا۔ وہ ماں کی غصیلی نظر سے گھبرا گیا۔

"وہ۔۔۔۔۔ وہ اس دن۔۔۔۔۔ اس دن۔۔۔۔۔ روتے ہوئے تم نے۔۔۔۔۔ تم نے خود یہ نام لیا تھا۔" ننھے شہزادے کے مانو پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔ اس نے گڑبڑا کر ماں کو اس دن کا سچ بتایا۔

زرتاج کے تنے آبرو پھیل گئے اور رخ موڑ لیا جیسے اپنے انجانے میں کئے اس غلطی پر سخت پچھتا رہی ہو۔ احساسِ ندامت سے وہ اپنی جگہ جامد ہو گئی تھی۔

"کیا ہو اماں۔۔۔" اس نے ماں کو حیران پریشان دیکھ کر دوبارہ مخاطب کیا۔

"کچھ نہیں۔۔۔۔ اور اس نام کا کوئی نہیں ہے۔۔۔۔ آئندہ یہ نام کبھی مت لینا۔۔۔۔"

سمجھ آئی۔۔۔۔۔ اب اندر جاو۔۔۔۔۔ میرے سر پر مت بیٹھے رہو۔۔۔ "زرتاج نے سیاٹ

انداز میں سخت لہجے میں اسے جھڑکا۔ وہ ماں کے اچانک طیش میں آنے کی وجہ نہ سمجھ پایا۔ ماں کی ڈانٹ پر وہ فوراً سے کرسی سے اتر ا اور کمرے میں بھاگ گیا۔

اس شام زرتاج بہت اداس بیٹھی تھی۔ وہ کمرے کے کھڑکی میں مایوس کھڑا اپنی ماں کو بے
آواز آنسو بہاتے دیکھ رہا تھا۔ "کون ہے یہ دلاور۔۔۔۔۔ جس کا نام سنتے ہی اس کی ماں رونے لگ
جاتی ہے۔" اس غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت رکھنے والے بچے نے یہ ضرور سوچا تھا۔

"کیا ہوا رز تاج۔۔۔۔" اسے گم سم سی بے آواز روتا دیکھ کر زبیدہ خالہ اس کے پاس آ کر
زینے پر بیٹھ گئی۔

"وہ آج مجھ سے دلاور کے بارے میں پوچھ رہا تھا خالہ۔۔۔۔۔" زرتاج اب پوری روہانسی ہو کر روئے جا رہی تھی۔ ان کے پیچھے کھڑکی کر در سے چہر اٹکائے کان لگا کر سنتا بچہ جانتا تھا یہ اس کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔

"پھر تم نے کیا کہا۔" زبیدہ خالہ نے زرتاج کے رخسار پر بہتے آنسوؤں کو صاف کر کے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا دیا۔

"میں نے اسے ڈانٹ دیا خالہ۔۔۔۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔۔۔" زرتاج اب بلند آواز میں زار و قطار رو رہی تھی۔

"میں کس منہ سے اسے بتاؤں۔۔۔۔۔ دلاور پر ویز خان کون ہے۔۔۔۔۔ کل کا آنے والا سردار دلاور پر ویز خان کون ہے۔۔۔" یہ نام لیتے زرتاج کانپ اٹھی اس پر کپکپی طاری ہو گئی تھی۔

"بس کر زرتاج۔۔۔۔۔ سنبھال اپنے آپ کو۔۔۔۔۔ وہ بچہ ہے۔۔۔۔۔ معصوم ہے۔۔۔۔۔
سمجھ جائے گا۔۔۔۔۔" خالہ آبدیدہ ہو گئی۔ ان سے زرتاج کا یوں زار و قطار رونادیکھا نہیں جا رہا
تھا۔

"پر میں نے اسے ڈانٹ دیا۔۔۔۔۔ آج دلاور کے نام سے ہی میرے اور میرے بچے کے بیچ
تکرار آگئی۔۔۔۔۔ آگے پتا نہیں کیا کیا ہو گا ہمارے ساتھ۔۔۔۔۔" زرتاج آنسو صاف کرتی
منہ پر ہاتھ رکھ گئی جیسے وہ اپنے دکھ بیان کرنے سے گریزاں ہو۔

اس ننھے بچے کو یہ احساس نہیں ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ وہ بھاگتا
ہوا یتیم خانے سے نکل گیا اور وہاں سے فاصلے پر ایک خالی میدان تھا جہاں صرف ایک درخت
تھا۔ اس گھنے درخت کے پیچھے چھپ کر وہ رونے لگا۔ یہ اس کی وہ مخصوص جگہ تھی جہاں وہ
بہت زیادہ غمگین صورت حال میں آتا تھا اور سسک سسک کر روتا تھا۔

اس وقت اس کی ماں اسے ڈانٹنے پر رو رہی تھی یاد دلاور کو یاد کر کے وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ سمجھا تھا
تو صرف اتنا کہ اس کی ماں کے آنسوؤں کی وجہ سے صرف ایک ہے دلاور پرویز خان۔ سمجھ سکا تو اتنا
کہ اس کی مظلوم ماں کو اتنے دکھ دینے والا صرف ایک ہے دلاور پرویز خان۔ جان سکا تو اتنا کہ

اس کی بے بسی کی وجہ صرف ایک ہے دلاور پرویز خان۔ اس نے روتے روتے یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ اب آئندہ کبھی بھی ماں کے سامنے اس شخص کا ذکر نہیں کرے گا۔ وہ اب اپنی ماں کو اس نام کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا نہیں کرے گا۔ البتہ یہ نام دلاور پرویز خان اس کے دل اور دماغ پر چسپاں ہو گیا۔ اپنی ماں کے ہر آنسو کو یاد کر کے اس کے ننھے سے دل میں اس انسان کے لیے نفرت ابھرنے لگی۔

آج اتنے سالوں بعد وہ نفرت ابلتے لاوا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ضبط کرتے کرتے اس کی آنکھیں سرخ انگارہ پڑنے لگی تھیں۔ وہ مضبوط عصاب مرد تھا جلدی آپے سے باہر نہیں ہوا کرتا تھا لیکن آج اس کے ماں کے وہ زار و قطار آنسو اس کے دل کے زخموں پر نمک بن کر برس رہے تھے۔

تین گھنٹے بس کا سفر کر کے اور 1 گھنٹہ اوپر نیچے چٹانی اور پتھریلے پہاڑوں کے درمیان سے گزر کر وہ سب ایک سبزہ زار میدانی علاقے میں پہنچے۔ جہاں قریب ہی ایک جانب ندی بہہ رہی تھی اور دوسری جانب گھنا جنگل شروع ہوتا تھا۔ ٹینٹ لگا کر سب تھوڑی دیر سستانے بیٹھ گئے۔ سحر کو وہ جگہ بہت ہی اسرار کن لگی۔ وہاں کا نظارہ دیکھتے ہی اس کی ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔ اس نے پھرتی سے اپنے بیگ سے کینوس اور پینٹنگ کا سامان نکالا۔ ٹینٹ سے کچھ دور چھوٹی سی چٹان پر کینوس کو برابر کیا۔ وہ جلد از جلد اس نظارے کی پینٹنگ بنانا چاہتی تھی۔

ایک طرف بہتی ندی۔ دوسری طرف جنگل۔ ندی کے پیچھے پہاڑ۔ نیلے آسمان میں ہلکے بادل اور اڑتے پرندے۔ سبزہ زار میں لگے ان کے ٹینٹس۔ یہ قدرت کا شاہکار دل کش اور دل نشیں نظارہ اسے اپنے خوبصورتی سے مسرور کر رہا تھا۔

وہ پینسل نکال کر تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔

عارفہ اپنے باقی گریز گروپ کے بشمول ٹینٹ کے اندر اپنا سامان سیٹ کر رہی تھی۔ شاویز سامان رکھ کر بوائز ٹینٹ سے باہر آیا۔ ٹراؤزر کے پائچے اوپر چڑھائے اور ندی کنارے پیرپانی کے اندر جھلاتا ہوا بیٹھ گیا۔



مغرب کے بعد سی آر اور سب لڑکوں نے کچھ لکڑیاں جلادی۔ سب گول دائرے کی صورت بیٹھ گئے۔ نبیل اپنے ساتھ گیتار بھی لایا تھا۔ وہ کوئی دھن بجانے لگا تو سب خاموشی سے گیتار کے سورو سے لطف اندوز ہونے لگے۔

وہی ایک کونے میں باربی کیوکا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ شہزاد لاریب اور شاویز سیخ میں بوٹیوں کے ٹکڑے پھنسا کر بھوننے لگے۔

گیٹار کے ساتھ اب سب گنگنانے لگے تھے اور تالیاں بجا کر ماحول کو خوشگوار بنایا جا رہا تھا۔ کچھ مدد کرنے کے بعد لاریب ہاتھ صاف کرتا ہوا اٹھا اور گھیرے میں سی آر کو پکڑ کر ناپنے لگا۔

تالیاں بجاتے گانا گاتے عارفہ کو کھٹک محسوس ہوئی اس نے کنکھیوں سے دیکھا دھوئیں کے آڑ میں شاوینز دل فریبی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عارفہ نے کبھی شاوینز کی اس نظر کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آج پہلی بار اس کی دل میں اتر جانے والی یہ نظر اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ وہ شرماتی ہوئی رخ پھیر گئی۔ اس کے دل میں کچھ کچھ ہونے لگا۔ اچانک سے اسے آگ کی تپش بہت تیز محسوس ہوئی۔ وہ وقفے وقفے سے ادھر ادھر نگاہیں گھماتے ہوئے شاوینز کو دیکھتی وہ اسی دیکھ رہا ہوتا۔ وہ کھسیا سی گئی۔ ہو اسے اڑتے بال پیچے کو کئے اور بلش کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔ ندی کے پاس ہچکچاتے ہوئے کھڑی وہ اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔

رات کے تاریکی کو چاند کی چاندنی نے روشن کیا ہوا تھا۔ وہ بار بار شاوینز کو سوچ رہی تھی کہ اسے پانی میں اپنے پیچے شاوینز کا عکس ابھرتا نظر آیا۔ وہ شاک ہو گئی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

چند منٹ بعد کباب اور بریانی کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاری ہو چکی تھی۔ سب ایک ساتھ بیٹھے کھاپی رہے تھے۔ شاویز grill پر سے دو سیخ اتار کر آیا اور روٹی کی مدد سے سحر کے پلیٹ میں کباب نکالے اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ارے نہیں۔۔۔ میں اور نہیں کھا سکتی۔۔۔" سحر فوراً سے بولی تھی۔ عارفہ نے ہاتھ بڑھا کر مزے سے اس کے پلیٹ سے گرم گرم کباب کا ٹکڑا اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالا۔

"کھاؤ کھاؤ۔۔۔ صحت بناؤ۔۔۔ اتنی کمزور سی ہو۔" شاویز نے اپنا نوالہ بناتے ہوئے سحر کو کہا۔ وہ جھجکتے ہوئے زبردستی اس کے لائے کباب کھانے لگی۔

عارفہ نے آج تک سحر سے حسد یا کینہ و بغض نہیں رکھا تھا پھر اب کیسے رکھتی۔ البتہ شہزاد کو شاویز کی سحر سے بڑھتی نزدیکیاں بری طرح چبنے لگی۔ وہ ان کے سامنے بیٹھا سحر اور شاویز کو ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھ کر جل بھن گیا تھا۔

رات سوتے سوتے سب کو ڈیڑھ بج گئے۔ لڑکیاں اپنے ٹینٹ میں اور لڑکے اپنے ٹینٹ میں جا کر سونے لگے۔ ہوا کے چلتے جنگل اور ندی کا پانی عجیب وحشت ناک سرسراتی آوازیں برپا کر رہی تھی۔

سحر کو ان آوازوں سے اور آٹ ڈور میں سونے سے بے چینی ہو رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اسے جھنجھلاہٹ ہونے لگی وہ افک کرتی اٹھ بیٹھی۔ اس نے رخ پھیر کر دیکھا عارفہ سمیت سب گہری نیند سو رہی تھیں۔ دوسرے سمت چہرا کیا تو اسے ٹینٹ کے پاس باہر کچھ چمکتا ہوا نظر آیا۔ اسے تجسس ہوا وہ جا کر چیک کریں۔ وہ بنا آواز کئے اپنے بستر سے نکلی۔ دبے پاؤں ٹینٹ کا زپ نیچے کر کے باہر جھانکا۔ غور سے سبزہ زار میں چمکتے جلتے بجتے اس چیز کو دیکھا تو وہ جگنو تھا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھی۔ وہ خوشی سے چہک گئی۔ اس نے اس سے پہلے کبھی جگنو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسی طرح بنا آواز ننگے پیر چلتی قریب گئی۔ وہ اس جگنو کو پکڑنا چاہتی تھی۔ اسے جگنو کو ہاتھ میں پکڑنے کی جستجو ہونے لگی۔ ننگے پیر کھلے بال بغیر ڈوپٹے کے وہ اسی طرح جھک کر جگنو کے پیچے چلتی گئی۔

وہ جیسے ہی اس کو پکڑنے کے قریب ہوتی جگنو آگے کھسک جاتا۔ وہ ہنہ کرتی رہ جاتی لیکن اس نے تجسس اور جستجو نہیں چھوڑی۔ وہ آس پاس دیکھے بغیر اس کا پیچھا کرتی جنگل کی جانب بڑھ گئی تھی۔ جنگل کے گھنے درختوں نے چاند کی چاندنی کو چھپا دیا۔ اسے صرف اسی جگنو کی چمکتی روشنی محسوس ہو رہی تھی۔ جگنو پر نظریں جمائے؛ چلتے چلتے اسے یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ کتنا آگے جا چکی تھی کہ جنگلو کی روشنی ختم ہو گئی۔ اس نے تیز نظروں سے آس پاس دیکھا وہ جگنو غائب ہو چکا تھا۔

خود کو درختوں کے جھنڈ میں پا کر اس کے اوسان خطا ہو گئے وہ گھبرا کر پیچھے موڑی تھی کہ اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

وہ خفیہ تعاقب کار عین اس کے سر پر کھڑا تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ اگر سحر زرا سا بھی ہلتی تو اس سے ٹکرا جاتی۔ اس کے چہرے پر ماسک نہیں تھا لیکن ٹوپی نیچے کر رکھی تھی۔ وہاں اندھیرا اتنا تھا کہ سحر کو وہ صرف ایک سایہ محسوس ہوا کوئی بشر وجود نہیں۔ لیکن اس کی چلتی

سانس یہ تصدیق دے گئی تھی کہ وہ وہی تعاقب کار ہے۔ وہ جگنو کو پکڑنے کی خواہش میں اتنی مگن ہو گئی تھی کہ اسے کسی کے اپنے پیچے آنے کی خبر تک نہ ہوئی؛ سوچتے ہوئے اسے خود پر شدید غصہ آنے لگا۔ آہٹ پر سحر کو اندازہ ہوا وہ ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے لگا ہے۔ بس یہ وہم آیا ہی تھا کہ وہ چیخ مارتی بے ڈھنگی سی اٹھ قدم بھاگی۔ وہ کس سمت جا رہی ہے۔ وہ ننگے پیر ہے۔ کچھ چب سکتا ہے۔ کوئی جنگلی جانور چھڑپ کر کاٹ سکتا ہے۔ کچھ بھی سوچے بغیر وہ اسی طرح روہانسی ہو گئی تھی۔ چیختی چلاتی بھاگتے ہوئے اسے اپنے پیچے کسی کے آنے کا ہوش نہ رہا۔ بار بار پلٹ کر دیکھتی وہ کسی سے ٹکرا گئی۔

"وہ روتی چیختی آنکھیں موندے جھنجھلانے لگی لیکن اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی وہ خود کو آزاد نہیں کر پائی۔

شاویز نے موبائل کی لائٹ سحر کے چہرے پر ماری۔

"سحر----سحر----آنکھیں کھولو----میں ہوں----شاویز----" شاویز نے بلند آواز میں تند و تیز لہجے میں کہہ کر اسے متوجہ کیا۔

سحر نے آبدیدہ آنکھیں کھول کر سر اوپر کر کے دیکھا وہ شاویز تھا۔ اس نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام رکھا تھا اور سحر کے ہاتھ اس کے سینے پر جا ٹھہرے تھے۔ وہ تیزی سے پلٹی اور غور سے بیچے دیکھا اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

"کیا ہو گیا ہے----اور تم یہاں----جنگل کے بیچ بیچ کیا کر رہی ہو----" شاویز نے پوری شدت سے اسے کندھوں سے جھنجھوڑا۔ شاویز کو وہ غائب دماغ لگی تھی۔ سحر اب بھی ہیبت زدہ سی کانپ رہی تھی۔ اسے یہ سارا منظر سمجھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

"وہ----ووو۔۔۔۔۔ممم۔۔۔۔۔میں----" سحر کو ڈر اور خوف سے بھاگتے؛ چیختے؛ روتے سانس چڑھ گئی تھی اس سے ٹھیک سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔۔اچھا۔۔۔۔کوئی بات نہیں۔۔۔۔اب چلو یہاں سے۔۔۔۔" شاویز نے اس کی غائب دماغی اور بوکھلاہٹ جانچتے ہوئے نرم لہجے میں کہا اور اس کے بازو چھوڑ دیے۔

شاویز موبائل کے لائٹ کی روشنی میں آگے چلنے لگا۔ دو قدم آگے بڑھ کر اسے حیرت محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا سحر کھوئے کھوئے انداز میں مخالف سمت چلنے لگی تھی۔

"سحر۔۔۔" اس نے تیز آواز میں اسے مخاطب کیا۔

سحر جھٹکا کھا کر سیدھی ہوئی اور ہڑبڑا کر شاویز کو دیکھا۔

"اس طرف۔" اس نے بے یقینی سے اسے راستے سے آشنا کیا۔

سحر نے ایک نظر پھر سے پیچھے دیکھا اور سر جھکا کر شاویز کے جانب بڑھ گئی۔

چلتے چلتے اس کی نظروں کے سمت میں شاویز نے پلٹ کر ضرور دیکھا تھا۔

بلکل اس کے سامنے چلتے پیرادھر ادھر مارتا اپنے جوتوں سے وہ راستے میں آنے والے ذرات کنکر کیڑے مکوڑے دکھاتا اس کے لیے راستہ صاف کرتا گیا۔ پیچے پیچے سحر کے لیے راستہ ہموار ہوتا گیا۔ اب وہ بغیر کسی تکلیف اور رکاوٹ کے صحیح چل رہی تھی۔

شاویز اس وقت رحمت کا فرشتہ بن کر اسے اس موت کی کھائی سے نکال لایا تھا اور بدلے میں وہ اس سے بے مروتی برت رہی تھی۔ چلتے چلتے ایک جھاڑ سے سحر ٹکرا گئی وہ گرنے لگی تھی کہ غیر ارادی طور پر اس نے شاویز کا کندھا دبویچ لیا اور خود کو سنبھالا۔ شاویز رک گیا اور ہلکے سے رخ موڑ کر سنجیدگی سے سحر کو دیکھا۔

"سوری۔۔۔" اس نے شرمساری سے اپنے ہاتھ پیچے کرتے ہوئے کہا۔

شاویز اسی خاموشی اور سپاٹ تاثرات سے اسے دیکھے گیا۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر سحر کے آگے گیا۔ سحر کو اپنا یہ روپ شاویز پر عیاں ہونے پر پہلے ہی جھجک ہونے لگی تھی اوپر سے جوتے نہ لینے پر

"تمہاری چیخ و پکار سن کر آیا تھا" بنا کوئی تہمید باندھے اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ جنگل سے نکل کر وہ سحر کا ہاتھ چھوڑ چکا تھا۔ اب ہاتھ پیچھے باندھے سامنے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا۔

"اففف۔۔۔۔۔ میں اتنا اونچا چیخی تھی کیا۔" سوچتے ہوئے سحر کا شرم سے زمین میں گڑھ جانے کا دل کیا۔

کیا آج اس کا بار بار شاویز کے سامنے شرمندہ ہونے کا دن ہے؛ سوچتے ہوئے وہ انگلیاں مڑوڑنے لگی۔

"ویسے۔۔۔۔۔ ایسا کیا دیکھ لیا تھا۔۔۔۔۔ جو اتنا روہانسی ہو گئی تھی۔۔۔۔۔" شاویز نے محتاط انداز میں اس سے پوچھا۔

"ایک آدم خور۔۔۔۔۔" سحر کو اپنی آواز کھائی میں سے آتی ہوئی لگی۔ وہ لمحہ یاد کر کے وہ پھر سے خوفزدہ ہو گئی۔

"سحر۔۔۔۔۔ پیروں پر دوائی لگا لینا۔۔۔۔۔" اس نے جاتے ہوئے سحر کو اس کے زخمی پیروں کی جانب متوجہ کیا۔ اس کا لہجہ اتنا مدہم اور نرم تھا کہ سحر نے حیران ہو کر پہلے اپنے پیر دیکھے پھر شاویز کو۔ اس سے پہلے سحر کچھ اور کہتی وہ اپنے ٹینٹ تک جا چکا تھا۔



اس کھلے میدانے علاقے میں آفتاب طلوع کے ساتھ صبح جلدی ہو گئی تھی۔ سب 7 بجے ہی اٹھ گئے اور شال کندھوں پر ڈال کر ناشتے کی تیاری کرنے لگے۔

سحر رات سوئی ہی اتنے دیر سے تھی کہ اب اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ عارفہ کے دو تین دفعہ ڈانٹنے غصہ کرنے پر آخر وہ 9 بجے تک اٹھ گئی۔ رات سونے سے پہلے وہ پیروں پر دوائی لگا کر جرابیں پہن چکی تھی تاکہ کوئی اس کے زخمی پیر نہ دیکھ سکے۔

10 بجے تک سب تیار ہو کر پہاڑ پر چڑھ کر پانی کے چشمے کو قریب سے دیکھنے جانے لگے۔

سحر کا دل تو نہیں کر رہا تھا لیکن وہاں اکیلے رکنے کا اس کا قطعی طور پر ارادہ نہیں تھا۔

شاویز اپنا بیگ کندھے پر ڈالے ان کے پاس آیا۔

"گڈ مارنگ سحر۔۔۔" عارفہ سے وہ صبح سویرے ہی مل چکا تھا۔ سحر سے اب رو بہ رو ہوا تھا۔

"گڈ مار ننگ" سحر نے بھی اسی خوشگوار مزاجی سے جواب دیا۔

رات کے واقعے کے بعد اس کے دل میں شاوینز کے لیے بچی کچی کلفت بھی دور ہو گئی تھی۔

عارفہ نے اجنبیت سے سحر کو دیکھا جیسے وہ اس کا یہ روپ پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔

"اوکے۔۔۔۔۔سب۔۔۔۔۔چلیں۔۔۔۔۔" ان تینوں نے اپنے پیچھے سی آر کو سب کو مخاطب

کرتے سنا تو وہ سب گروپ کی صورت اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔

ایک تصویر کے لیے اس نے موبائل سحر کو دیا جس میں ان دونوں کے پیچھے پہاڑ اور چشمہ بھی پورا آسکے۔ سحر ان کی تصویر لے رہی تھی جب لاریب مستی کرتا ہوا اس کے سامنے آیا اور تصویر خراب کر دی۔

"چڑیل۔۔۔۔۔ چڑ گئی۔۔۔" اس نے آنکھوں کے اشاروں سے عارفہ اور شاویز کی رقبت کا اشارہ کیا۔

"لاریب۔۔۔۔۔ اب تو مجھ سے نہیں بچ پائے گا۔۔۔" عارفہ چڑ گئی تھی اور اس کے پیچھے مارنے کو بھاگنے لگی۔

اس کے پاس سے ہٹتے ہی شاویز سحر کے ساتھ آکر کھڑا ہو گیا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بظاہر تو وہ چشمے کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ آدم خور پھر تو نہیں آیا" شاویز نے مسکراہٹ دبائے ہوئے کہا۔

سحر اس کا شرارتی انداز سمجھ گئی۔

شاویز اس کی بات پر کھکھلا کر ہنسا۔

ان دونوں کو آپس میں ایسے ہنستے گھلتے دیکھ کر عارفہ کو کچھ کھٹک محسوس ہوئی۔ وہ لاریب کے پیچھے بھاگنے سے؛ واپس آئی اور شاوینز اور سحر کے درمیان کھڑی ہو گئی۔

پہاڑ سے اتر کر واپس اپنے ٹینٹ میں آ کر گھروں کو جانے کی تیاری کرنے لگے تھے۔ آج شام 7 بجے انہیں واپس نکلنا تھا۔ سحر اس پہر فوراً سے کینوس لگا کر اپنی باقی ماندہ پینٹنگ مکمل کرنے جٹ گئی تھی۔ آتے وقت کا سفر جتنا پر جوش اور رونق افروز تھا واپسی کا اتنا ہی خاموش۔



"اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔۔۔۔ بیٹی کے ساتھ رات کے وقت ڈرائیو کرنے کا موقع ہمیشہ تھوڑی ملتا ہے۔" دلاور صاحب نے خوش دلی سے کہا۔

"مما کیسی ہے۔۔۔ اور صائم۔۔" والد کا بااعتماد لہجہ اور خوش مزاج انداز دیکھ کر سحر مسکرا دی۔

"وہ دونوں بھی ٹھیک ہے اور تمہارا انتظار کر رہے ہے۔" انہوں نے ڈرائیو کرتے ہوئے سامنے دیکھتے کہا۔



"شاویز آج میرے ساتھ چلو" عارفہ اسے بازو سے پکڑے اپنی کار میں بیٹھانا چاہ رہی تھی۔

"عارفہ۔۔۔۔ پھر کبھی۔۔۔۔ ابھی لاریب کے ساتھ جاوگا۔" شاویز نے معذرت خواہاں انداز میں اس سے اپنا بازو آزاد کروایا۔

"تم ہر بار ایسی کرتے ہو" عارفہ کا اچھا خاصہ منہ بن گیا۔

"میں صبح ہی اس سے وعدہ کر چکا تھا یار۔۔۔۔" شاویز نے منانے کے غرض سے نرمی سے کہا۔

عارفہ اسی طرح منہ بھسورے کھڑی تھی کہ اس نے لاریب کی بابت کاہارن سنا۔ وہ شاویز کے انتظار میں تیار کھڑا تھا۔

"پلیز عارفہ۔۔۔۔ اگلی دفعہ پکا تمہارے ساتھ چلوں گا۔۔" شاویز نے معصومیت سے آنکھیں جھپکائی۔

عارفہ نے لمبی سانس لی اور اسے جانے کے لیے کہتے ہوئے خود اپنی کار میں سوار ہو گئی۔

"تھینکیو۔۔۔۔۔بائے۔۔۔۔۔گڈ نائٹ" شاویز نے گرم خوشی سے اسے شب بخیر کہا۔ اس کی

کارروانہ ہوئی تو سنجیدہ تاثرات بنائے وہ لاریب کے پاس آگیا۔

اس کے ساتھ بانگ پر سوار ہونے کے بجائے اس نے لاریب کے کندھے کو تھپکتے ہوئے
شکریہ ادا کیا۔ عارفہ کے سامنے اسے ساتھ لے جانے کی اداکاری کرنے اسے شائیز نے ہی کہا
تھا۔

"شاویز۔۔۔۔۔ ویسے تو یہ تیرا اور عارفہ کا پرسنل میٹر ہے۔۔۔۔۔ پر۔۔۔۔۔ کیا تم اسے خود

سے دور کر رہے ہو۔۔۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔ تمہارا اس کے ساتھ رویہ بدل گیا

ہے۔۔۔۔۔ کوئی پر اہلم ہے کیا۔" لاریب نے دوستانہ مزاج میں پوچھا۔ وہ جتنی بچگانہ حرکتیں

کرتا تھا سیریس معاملے میں اتنا ہی سنجیدہ ہو جاتا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔۔ میں صرف اس ریلیشن پر نظر ثانی کرنے کے لیے وقت لے رہا ہوں۔۔۔۔ میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ مجھے عارفہ میں کوئی دلچسپی ہے بھی یا نہیں۔" شاویز نے افسوس سے سر جھٹکا اور لاریب کو خیر باد کہہ کر پیدل روانہ ہو گیا۔ لاریب وہی کھڑا سنجیدہ انداز میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔



اسے کسی نے منظبوطی سے زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ کوئی ہنٹر سے اس کے برہنہ وجود کو مار مار کر زخمی کر رہا تھا۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ ایک دو تین ایک کے بعد دیگر ضرب لگائی جا رہی تھی۔ اس کے وجود میں ہنٹر کے نشانات پیوست ہو رہے تھے۔ اس نے ہمت کی لیکن خود کو آزاد نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے کراہنے کے ساتھ کوئی اس پر واضح طور پر ہنس رہا تھا۔ وہ بشر

وجود قدم قدم چلتا ہوا سامنے آیا۔ اس کے ساتھ بہت روشنی چمک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں
چندیا گئی۔ وہ آنکھیں چھوٹی کر کے اس انسان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتا۔ وہ روشنی اس کی
آنکھوں کو اندھا کر رہی تھی کہ ایک جھٹکے سے سب تاریک ہو گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

پھر سے وہ خواب؛ اس نے سوچتے ہوئے بے بسی سے بستر پر مقے مارے۔ کیوں یہ خواب آخر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے؛ اس نے سوچتے ہوئے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس مضبوط و توانا مرد کے پاس ہر چیز سے لڑنے کی طاقت تھی سوائے اس کے مانگمرین اور ان خوابوں کے۔

وہ تاریکی میں چلتا بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ خاموش آسمان میں چمکتے تارے۔ سب پر سکون تھے
صرف اس کے اندر شور برپا تھا۔

سر جھٹکتا اپنے سوچوں اور خوابوں کے جہان سے نکلتا وہ معمول کی طرح تیار ہو کر ورزش کے لیے نکل گیا۔

Visit For More Novels : www.urdu-novelbank.com Page 175
E-mail pdfnovelbank@gmail.com WhatsApp [03061756508](https://wa.me/03061756508)

کہا۔

نے اب کی بار نرم لہجے میں کہا۔

حصے کا اضافہ کیا۔

سحر نفی میں سر ہلاتے رو دینے کو تھی۔

"آپ بھی نا۔۔۔۔۔ کیوں پریشان کر رہے ہے۔۔۔۔۔ میری بیٹی کو۔۔۔۔۔ زبردستی تھوڑی شادی کروائے گے۔۔۔۔۔ جب خود کہو گی تب ہی کروائے گے۔۔۔۔۔" عابدہ بیگم نے اس کی دل گرفتگی محسوس کرتے ہوئے دلا سہ دیا۔

وہ اب ماں اور باپ کے درمیان اداس بیٹھی تھی۔ صائم سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"ہاں تب تک صائم کے لیے کوئی لڑکی ڈھونڈ کر آپ کے لیے بہو کا بندوبست کر دوں گا۔۔۔۔۔ تاکہ سحر کی کمی محسوس نہ ہو" دلاور صاحب نے مذاحیہ انداز کہا۔ یہ بات سن کر صائم بد مزہ ہو گیا۔

"پاپا۔۔۔۔۔" سحر اب پوری طرح جھنجلا گئی تھی۔ دلاور صاحب کھکھلا کر ہنسنے اور اس کے گرد بازو مائل کیا۔

"بہت زبردست ہے۔۔۔۔۔ کمال ہے۔۔۔۔۔ میری بیٹی تو پوری آرٹسٹ بن گئی ہے۔۔۔۔۔ یہ تو میں اپنے سٹڈی روم میں لگاؤں گا۔" پاپا کی تعریف پر سحر خوشی سے چہک اٹھی۔

پینٹنگ ہاتھ میں لیئے پاپا اپنے سٹڈی میں چلے گئے۔ صائم بھی اپنے کمرے میں جا چکا تھا اور عابدہ بیگم اپنے کمرے میں۔ وہ پنک کو یاد کرتی سونے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔



سوتے ہوئے ایک پل کو سحر کو دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اپنے ہاتھ پیر ہلانا چاہتی تھی لیکن کسی دباؤ کی وجہ سے ہلانا نہ سکی۔ اس نے اضطراب میں آنکھیں کھولی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ اپر والا بالکل اس کے پہلو میں بیٹھا ہے اس کے دونوں ہاتھ پیر رسی سے بندھے ہوئے ہیں اور وہ اپر والا اپنی پوری قوت سے اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ وہ بن

پانی کے مچھلی جیسے مچل گئی۔ ہاتھ پیر مارتی وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ جب اپنی ہمت جواب دے گئی تو حلق کے بل چلا چلا کر دلاور صاحب کو پکارنے لگے۔

"پاپا۔۔۔۔۔ پاپا۔۔۔۔۔" اس کا گلاب گیا۔ اس سے سانس تک نہیں لی جا رہی تھی۔ اس کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ پھر سے دھاڑیں مار کر چیخی تھی۔

اسی طرح چلاتے چلاتے اسے اپنے سماعتوں میں دلاور صاحب کی آواز آنے لگی۔ وہ گڑبڑا کر ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔ عنودگی سے باہر آئی تو معلوم پڑا دلاور صاحب اس کے سرہانے بیٹھے اسے جھنجھوڑ رہے تھے۔

"سحر۔۔۔۔۔ ہوش میں آؤ۔۔۔۔۔" کیا ہو گیا "دلاور صاحب نے اسے بازوؤں سے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ عابدہ بیگم اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی حواس باختہ ہو گئی تھی۔ صائم آنکھیں مسلتا زبردستی نیند ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"پاپا۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ مجھے مار رہا تھا۔۔۔۔۔ میرا گلاب۔۔۔۔۔ دبا رہا تھا۔۔۔۔۔"

وہ۔۔۔۔۔ مج۔۔۔۔۔ مجھے مار دے گا۔۔۔۔۔ "اس نے ہچکچاتے ہوئے اکھڑے سانس میں اپنی کیفیت بتائی۔

"بیٹا۔۔۔۔۔ کوئی نہیں ہے یہاں۔۔۔۔۔ دیکھو کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگایا۔

وہ اپنے پاپا کے بازو کو جکڑ کر ہانپتے کانپتے رونے لگی۔

"سحر ہم تمہارے چلانے سے ہڑبڑا کر بھاگتے ہوئے آئے۔۔۔۔۔ تم نیند میں چیخ رہی تھی۔۔۔۔۔" عابدہ بیگم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ حقیقت نہیں تھا خواب تھا۔ اس کا دماغ ماو ہو گیا تھا۔

"عابدہ۔۔۔۔۔ تم آج اس کے پاس سو جاؤ۔۔۔۔۔ اسے سنبھالو۔" دلاور صاحب اس کے سر ہانے سے اٹھے اور عابدہ کو ہدایت دینے لگے۔



"سحر۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ تم لے کیوں نہیں رہی۔۔۔" شاویز نے تعجب سے اسے آبرو اچکا کر دیکھا۔

سحر ایک نظر اسے دیکھ کر نظر انداز کر گئی۔

"لے لے گی۔۔۔ تم کیوں ٹینشن لے رہے ہو" عارفہ نے ہنس و مزاح کا انداز اپنائے دبے غصے سے شاویز کو مخاطب کیا۔

شاویز آج کل اسے پوری طرح نظر انداز کئے سارا ادھیان سحر پر مرکوز کئے ہوئے تھا جس سے عارفہ کے اندر ناراضی اور جلن کے ایشیا پھیلنے لگے تھے۔

"مجھے بھوک نہیں ہے" سحر بد مزہ اسی ہو کر کیفیٹریا کے دوسرے جانب دیکھنے لگی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ صبح ناشتہ بھی نہیں کیا ہو گا۔۔۔۔۔ iam sure۔۔۔۔۔ یہ لو تھوڑا سا کھالو۔" شاویز نے نرمی سے کہتے ہوئے اسنیکس ہاتھ میں لے کر اس کے منہ کے آگے کیا۔

عارفہ کا؛ شاویز کا اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاتے دیکھ کر پارا چڑھنے لگا۔

یہ ہمدردی تھی؛ دوستی تھی؛ مستی تھی؛ یا کچھ اور سحر سمجھ نہیں سکی اور میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے اٹھ کھڑی ہو گئی۔

"بس کرو۔۔۔۔۔ just stop it۔۔۔۔۔ کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ بہت فکر ہے تمہیں میری۔۔۔۔۔ جب سے تم سے تھوڑا ہنس کر بات کرنا شروع کیا ہے۔۔۔۔۔ تم تو ہر وقت میرے سر پر چڑھنے لگے ہو۔" آخری فقرہ کہتے ہوئے سحر نے اپنے سر کے طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

وہ یک دم ہی غصے سے پھٹ پڑی تھی۔ اسے طیش میں آتے دیکھ کر عارفہ اور شاویز بھی کرسی سے اٹھ گئے۔ باقی میزوں پر بیٹھے سٹوڈنٹس بھی ان کے جانب دیکھنے لگے۔

"تنگ آگئی ہوں میں۔۔۔۔۔ غلطی کر دی تمہیں اچھا سمجھ کر۔۔۔۔۔ لیکن اب

بس۔۔۔۔۔ آئندہ تم۔۔۔۔۔ مجھے میرے آس پاس بھٹکتے نہ دکھو۔۔۔۔۔" اس کے منہ میں

جو آ رہا تھا وہ بنا سوچے سمجھے بولے جا رہی تھی۔ عارفہ کا متفکر انداز میں منہ کھل گیا۔ وہ

فکر مندی سے کبھی سحر کو انگلی اٹھا کر شاویز کو سناتے ہوئے، تنبیہ کرتے دیکھتی کبھی شاویز کو جو جبرِ سخت کر کے اس کے غصے کو ضبط کر رہا تھا۔

لمبی سانس لیتے ہوئے سحر اپنا بیگ کندھے پر ڈالتے وہاں سے بھاگ گئی۔

"سحر۔۔۔۔۔" عارفہ نے بے بسی سے اسے پکارا لیکن وہ نہیں رکی۔

شاویز آس پاس سب میں اپنا تماشا بننا دیکھ کر چھنپ سا گیا اور سخت تاثرات بننا دوسری سمت بڑھ گیا۔

عارفہ نے اداس نظروں سے اسے جاتے دیکھا اور سحر کے پیچھے لپکی۔

"سحر رکو۔۔۔۔" اس کا بازو پکڑ کر عارفہ نے اسے روکا۔ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اس کی سانس چڑھ گئی۔ اسے مضبوطی سے پکڑے عارفہ پاس پڑے بیچ پر بیٹھی۔ سانس بحال کرنے کے بعد وہ سحر کے بے تاثر چہرے کو دیکھنے لگی۔

"کیا ہو گیا سحر۔۔۔۔۔ اتنا غصہ کس بات کا ہے۔۔۔۔۔ ایسا بھی کیا کر دیا شاویز نے جو اتنا ڈانٹ دیا بیچارے کو۔" عارفہ نے مدھم آواز میں سختی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" سحر گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ عارفہ سے نظریں ملانے سے کترار ہی تھی۔

"سحر۔۔۔۔۔ اب ایسی بھی کیا بات ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ جو تم مجھ سے بھی شیر نہیں کرنا چاہتی۔"

اس نے بھر آئی آواز میں کہا۔ عارفہ کو اب واقعی اس کی بہت فکر ہونے لگی۔ نرمی سے اس کا

رخ اپنے جانب کیا۔ سحر سے مزید چپایا نہیں گیا وہ اس کے کندھے سے لیٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

"سحر۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔ خدا کے لیے بولو۔۔۔ تم اب مجھے خوفزدہ کر رہی ہو۔۔۔" عارفہ حواس باختہ سی ہو گئی۔ اس کے دل میں بہت برے خیالات آرہے تھے۔ وہ عجیب و غریب وہم میں مبتلا ہو گئی تھی۔

کچھ آنسو بہہ جانے کے بعد سحر نے چہرے پر آئے بال پیچے کئے اور زکام زدہ سانس اندر کھینچ کر خود کو کمپوز کیا۔ اپنے رویے پر اسے شدید احساسِ ندامت ہوا۔

"آئی ایم سوری۔۔۔ عارفہ۔۔۔ میں کئی دنوں سے بہت پریشان ہوں۔۔۔۔۔ کوئی میرا پیچا کر رہا ہے۔۔۔۔۔ مجھے ڈراتا دھمکاتا ہے۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتی وہ کون ہے۔۔۔۔۔"

کیا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ پر جب بھی میرے سامنے آتا ہے میں وحشت میں آجاتی ہوں۔۔۔۔۔"

سحر نے روتے ہوئے عارفہ سے اپنی دلی کیفیت بیان کی۔

عارفہ شاک سی پلکیں جھپکائے بغیر اس کے افسردہ سراپے کو دیکھ رہی تھی۔

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔۔۔۔ تم نے اسے دیکھا ہے کیا۔۔۔۔" اس نے مضبوطی سے
سحر کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔ اسے اپنی بیسٹ فرینڈ کی بے چارگی پر بہت
افسوس ہونے لگا۔

"وہ ہمیشہ نقاب پوش رہتا ہے۔۔۔۔۔ میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔۔۔۔۔ پر وہ بہت خطرناک ہے۔۔۔۔۔ اس کے سامنے آتے ہی میں اپنے ہوش و حواس کھودیتی ہوں اور والہانہ پن سے بھاگنے لگتی ہوں۔۔۔۔۔" سحر نے جھکی نظروں سے اسے اپنے ساتھ ہوئے سارے واقعات بیان کئے۔ مارکیٹ میں اسے دیکھنا پھر اس کا روڈ پر دوڑ لگا دینا۔ اس کی کار کا پیچے آنا اور سحر کو

گن دکھانا۔ جنگل میں اس کا اسے پکڑنے کی کوشش کرنا۔ یہاں تک کہ اپنے اس خواب کے بارے میں بھی سب بتا دیا۔ آج وہ عارفہ سے کچھ بھی چپائے نہیں رہ سکیں تھیں۔ اس نے اپنی بیسٹ فرینڈ کے سامنے اپنے دل کے سارے راز افشاں کر کے رکھ دیئے تھے۔

اس کی آپ بیتی سن کر عارفہ آبدیدہ ہو گئی۔

بولتے بولتے سحر نے اپنا سر پکڑ لیا اور پھر سے رونے لگی۔

"تم نے گھر پر بتایا۔" عارفہ نے اپنے جذبات قابو کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"پاپا آج کل اپنے نئے پروجیکٹ کے تکمیل میں بہت بڑی ہیں۔۔۔۔۔ مجھے ان سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔۔۔۔۔ اور ماما کو بتانے کی ہمت نہیں ہو سکی تھی۔۔۔۔۔ وہ بہت پریشان

"سحر۔۔۔۔ اس طرح رونے سے بھی تو کچھ نہیں ہو گا نا۔۔۔۔ تمہیں اپنے گھر پر بتا دینا چاہیئے۔۔۔۔ مجھے یقین ہے خان انکل ضرور حل ڈھونڈ لیں گے۔۔۔۔ وہ جو کوئی بھی ہے۔۔۔۔ خان انکل اسے پکڑ لیں گے۔۔۔۔ تم انہیں ساری سچائی بتا دو" عارفہ نے دل سے اسے امید دلائی۔ اس کی پر امید نظریں دیکھ کر سحر کو بہت حوصلہ ملا۔ اس نے دل میں ٹھان لیا وہ آج گھر جا کر اپنے فیملی سے اس بارے میں ضرور بات کریں گی۔

ماں باپ ہی تو ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کی ہر تکلیف سمجھ لیتے ہیں۔ ان کی مشکلات دور کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

عارفہ کو اتنے دنوں بعد اس کے چہرے پر تسلی بخش تاثرات نظر آئے تھے۔ اس وقت اس کی بچپن کی بیسٹ فرینڈ کو اس کے ساتھ کی اشد ضرورت تھی۔ وہ اسی کے ساتھ بیٹھی رہی شاویز کو منانے نہیں گئی۔ سحر اپنے غموں میں گم تھی کہ اس نے بھی دوبارہ شاویز کے بارے میں دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔



"ارے سحر۔۔۔۔۔ آو۔۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔۔ کون آیا ہے۔۔۔۔۔" عابدہ بیگم نے اسے دیکھ کر خوشگوار مزاجی سے مخاطب کیا۔

عابدہ بیگم کے اسے مخاطب کرنے پر دلاور صاحب بھی اس کی جانب متوجہ ہوئے اور اس مرد سے بات کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ تنے ہوئے اعصاب سے قریب پہنچ کر اس نے اس مرد کو اپنے طرف مڑتے دیکھا۔

سحر کی پہلی نظر اس سے ٹکرائی ہی تھی کہ وہ ٹھٹک گئی۔ تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور تیزی سے نظریں جھکا گئی۔

"اسلام علیکم" بغیر کسی کو مخصوص کئے اس نے مشترکہ انداز میں سلام کیا۔ چونکہ سب اس کی طرف متوجہ تھے وہ بے مروتی کا مظاہرہ کرتی وہاں سے جا بھی نہیں سکتی تھی اس لیے مجبوراً عابدہ بیگم کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔" اس کے سلام کا جواب دلاور صاحب نے دیا۔

وہ مرد بھی شاید ایسے اچانک سے اسے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ ایک جھوٹی نظر سحر پر ڈال کر وہ پھر سے دلاور صاحب کے جانب رخ پھیر گیا۔

"سحر۔۔۔۔ تمہیں جاوید تو یاد ہو گا۔۔۔۔ پتا ہے پولیس میں اچھی پوسٹ پر نوکری ہو گئی ہے اس کی۔۔۔۔ ہمارے ہی شہر میں A.S.P کے عہدے پر فائز ہوا ہے۔۔۔" عابدہ بیگم نے سامنے بیٹھے اس نوجوان مرد کا مختصر سا تعارف کیا۔ سحر اپنی ماما کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی۔ جاوید نے عابدہ آنٹی کی تعریف پر انہیں دیکھا جبکہ سحر کے جانب دیکھنے سے کتراتا رہا تھا۔

دلاور صاحب جاوید کو اپنے نئے پروجیکٹ کے متعلق آگاہ کر رہے تھے اور وہ غور سے ان کی باتیں سنتا سر کو جنبش دیتا رہا۔ دلاور صاحب کمپنی کے افتتاحی تقریب کے سلسلے میں اس سے سیکورٹی کے انتظامات کرنے کے بابت اس سے گفتگو کرتے رہے۔

"آپ بے فکر رہے خان انکل۔۔۔۔۔ آپ کو جب بھی میری سروس درکار ہوگی میں ایک کال پر حاضر ہو جاؤ گا۔" جاوید نے بارعب اور بااعتماد لہجے میں دلاور صاحب کو اپنی موجودگی کی یقین دہانی کروائی۔

"باقی باتیں بعد میں کر لیجئے گا۔۔۔۔ اتنا عرصہ بعد جاوید ہمارے گھر آیا ہے۔۔۔۔۔ اسے سکون سے چائے تو پینے دیں۔۔۔" عابدہ بیگم نے دلاور صاحب سے خفگی ظاہر کرتے ہوئے جاوید کو لوازمات پیش کئے۔

سحر کو وہاں بیٹھے کوفت ہونے لگی وہ آہستہ آواز میں معذرت کرتی اٹھ گئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"آئی بس۔۔۔ بہت لے لیا۔۔۔ صبح سے کھلائے جا رہی ہیں۔۔۔ لگتا ہے مجھے اپنا ورک آؤٹ ہاور بڑھانا پڑے گا۔۔۔" جاوید نے خوش مزاجی سے کہا۔ اس کی بات پر دلاور صاحب اور عابدہ بیگم کھکھلا کر ہنسی۔

جاوید جانے کے لیے اٹھا تو وہ دونوں میاں بیوی بھی ساتھ اٹھ گئے۔

"تھوڑی دیر اور رک جاتے جاوید۔۔۔۔۔۔ لہجہ کا وقت ہونے والا ہے۔۔۔۔۔۔ کھانا کھا کر جاتے۔"

عابدہ بیگم نے اس سے ملتے ہوئے کہا۔

"آئی۔۔۔ اب تو میں اسی شہر کا ہو گیا ہوں۔۔۔۔ اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔۔۔۔ کھانا اگلی دفعہ کھاؤ گا۔۔۔۔" جاوید نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے تھپتھپایا۔

"او کے۔۔۔۔۔ لیکن اگلی دفعہ۔۔۔۔۔ مئی بابا کو بھی لے کر آنا۔" عابدہ بیگم نے آنکھیں بڑی کر کے اسے تنبیہ کیا۔

"ضرور۔۔۔۔۔ اوکے انکل چلتا ہوں" جاوید دلاور صاحب سے گلے مل کر رخصت ہوا اور پوریج کی جانب بڑھ گیا۔



وہ آج خوش تھا۔ اس کا پہلا پلان کامیاب گیا تھا۔ دلاور پرویز خان کے فیملی کے پہلے فرد کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ دن کا چین برباد ہو چکا تھا۔ سحر بنت دلاور پرویز کو اس نے ذہنی اذیت سے روشناس کروا دیا تھا۔ اس کا پہلا ٹارگٹ اختتام کو پہنچ گیا تھا اب اسے اپنا نشانہ سحر سے ہٹا کر دوسرے ٹارگٹ کے جانب کرنا تھا۔ سحر نے آج عارفہ کو سب بتا دیا تو اب وہ دلاور کو بھی بتا دے گی؛ اس بات سے وہ مطمئن تھا۔

سحر کی زندگی میں طوفان برپا کرنے کی خوشی میں وہ آج چھوٹا سا جشن منا رہا تھا۔

لاؤنج میں ایل سی ڈی پر بلند آواز میں گانے لگا کر وہ اوپن کچن میں اپنے لیے کھانا پکانے میں مصروف تھا۔ اس نے مٹن کڑا ہی تیار کی اور گانے سنتے ہوئے مزے سے کھانے لگا۔

کھانے کے بعد میٹھے کے طور پر فروٹ چاٹ بنائی۔ پھلوں سے بھرا پیالہ لیئے وہ اپنے بیڈ روم میں آیا۔ ورکنگ ایریا میں آکر، چند ٹکڑے پھل منہ میں ڈالا کر؛ اس نے پیالہ میز پر رکھا۔ پھل جباتے ہوئے اس نے نیلے مارکر سے سحر کی تصویر پر ٹک مارک لگایا۔ پھر سرخ پین لے کر اس نے سوچتے ہوئے آنکھیں چھوٹی کی۔

"اگلا نشانہ کون ہونا چاہیے دلاور صاحب عابدہ بیگم یا۔۔۔۔۔ صائم دلاور" سوچتے ہوئے اس نے استخزیہ مسکرا کر سرخ قلم سے صائم کے تصویر پر گول دائرے کا نشان بنایا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اب اس کا اگلا ٹارگٹ صائم دلاور تھا۔

اپر پہننے کے بجائے اس نے جینز کے ساتھ بلیک ٹی شرٹ پہنی۔ کالے چشمے لگائے چہرے پر ماسک پہنا۔ بالوں کو ماتھے پر بکھیرے ہوئے چھوڑ کر سر پر پی کیپ جمائی۔

نارمل انداز میں چلتا وہ گاڑی کے پاس آکر اس میں سوار ہو گیا اور تیز رفتار سے سڑک پر دوڑا دی۔

صائم اس وقت فُٹبال گراؤنڈ میں فُٹبال کھیل رہا تھا۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے شائقین کے بیچ آکر بیٹھ گیا۔ صائم ادھر ادھر بھاگتا اپنے کھیل میں مشغول تھا اور وہ اپنی تیز نظریں اس پر گاڑھے ہوئے آگے کو ہو کر بیٹھا تھا۔

آدھے ٹائم میں تفریح کے دوران سب کھلاڑی پانی پینے بیٹھ گئے۔ وہ صائم کو دیکھتا ہوا اٹھ کر جانے لگا کہ ساتھ بیٹھے ایک آدمی سے ٹکرا گیا۔

"اندھے ہو کیا۔۔۔۔۔" اس آدمی نے جھڑکتے ہوئے اسے گالی دی۔ وہ اس کی جھڑک کو ضبط کر کے جانے لگا تھا لیکن گالی سن کر رک گیا۔

طیش میں آکر وہ ایڑیوں کے بل گھوما۔ گلاس ہٹا کر جیب میں اڑھسے۔ اس کی غصیلی نگاہ محسوس کر کے اس آدمی کو اپنے گالی دینے پر چبھتا ہوا ہوا۔ وہ پھرتی سے اٹھا اور باہر کے جانب بھاگنے لگا۔

وہ اسی تیزی سے تند و تیز نظریں اس آدمی پر مرکوز کئے اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ آدمی نے اپنی پوری جان لگا دی سب کو دھکم پیل کرتا بھاگتا گیا لیکن اس کی رفتار سے زیادہ تیز بھاگ نہیں سکا۔ گروانڈ کے گیٹ پر ہی وہ اس آدمی پر جھڑپ پڑا۔ اسے کندھے سے دبوج کر اس کا رخ اپنے جانب کیا اور کس کر اس کے قمیض کا کالر پکڑ لیا۔ ضرب لگانے ہاتھ اٹھا کر مٹھی مینچھ لی۔

"کسی کو ناحق نہیں مارتے" اس کی سماعتوں میں رزتاج کی نرم آواز گونجی تھی۔

"پر اس نے مجھے گالی دی۔" ساتھ ہی اس ننھے بچے کی غضب ناک چنگارتی آواز۔

اس کے طیش میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے زوردار مقہ اس آدمی کے منہ پر دے مارا وہ لڑکھڑا گیا لیکن اس نے کالر سے کھینچ کر اسے پھر سے سیدھا کیا اور دوسرا ضرب لگایا۔ سب لوگوں کا جمکنا بن گیا۔ فٹبال دیکھنے آنے والے شائقین راستے میں کھڑے ہو کر ان کی مار پیٹ دیکھنے لگے۔

اس آدمی نے اپنے دفاع میں جوابی کارروائی کرنی چاہی لیکن اس نے اپنے جانب بڑھتا اس کا ہاتھ پکڑ کر مضبوطی سے مڑوڑ دیا اور اس کی پیٹھ پر اپنی پوری قوت سے کہنی ماری۔ وہ ہلکتا ہوا نیچے جھکا۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی اس کے گرفت میں تھا۔ اس کا غصہ تھا جو قابو میں آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس نے درد سے کراہتے اس جھکے مرد کے پیٹ میں گھٹنا مارا اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ڈگمگا گیا اور زمین بوس ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس زمین پر پڑے کراہتے آدمی کے پاؤں اور پھٹو پر لاتیں برسانا شروع کی۔ اس غضب ناک نوجوان کو روکنے کی کسی میں ہمت نہیں ہو پارہی تھی۔ کسی لڑکے نے بھاگ کر گراونڈ کے سکیورٹی کو اطلاع دی تو وہ بھاگتے ہوئے آئے اور اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ دو سکیورٹی اہلکاروں نے

ایک بازو سے اور دو اہلکاروں نے دوسرے بازو سے پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے اس آدھ مرے آدمی سے دور کیا۔ کچھ شہری لوگ تیزی سے آگے آئے اور اس زخمی آدمی کو جلد از جلد ہسپتال لے جانے لگے۔

وہ تھوڑا آگے کو جھکا اور ساری طاقت سے اپنے بازو اپنے جانب کئے پھر ایک جھٹکے سے خود کو سیدھا کیا تو سیکورٹی اہلکاروں کی گرفت اس پر سے آزاد ہو گئی۔ وہ ڈگمگا گئے۔ سب نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ دوبارہ آگے آکر اسے پکڑنے کی وہ جرات نہیں کر سکے تھے۔ اس نے تنے ہوئے اعصاب سے ان کو دیکھا اور اپنی شرٹ کی سلوٹیں صحیح کرتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیٹ سے باہر روانہ ہو گیا۔



سحر اضطرابی کیفیت میں کمرے میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہی تھی۔ وہ جو ساری ہمت اکٹھا کرتی یونیورسٹی سے گھر آئی تھی جاوید سے روبہ رو ہونے کے بعد ہوا میں اڑ گئی تھی۔ اس نے پیپا کے پاس جانے کا سوچا لیکن پھر مایوس ہو کر رک گئی۔

"اگر میں نے پایا کو بتایا۔۔۔۔۔ تو وہ پولیس میں رپورٹ کرنے کے غرض سے۔۔۔۔۔ سب کچھ جاوید کو بتا دیں گے۔۔۔۔۔ اب تو اس گھر میں کوئی بھی مسئلہ ہو گا۔۔۔۔۔ پایا کی پہلی کال ہی جاوید کو ہو گی۔۔۔۔۔ اففف اب پایا کو کیسے بتاؤں۔۔۔۔۔" وہ ناخن کاٹتی بے بسی سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"جاوید کو بھی ابھی پولیس آفسر بن کر آنا تھا۔۔۔۔۔ اففف۔۔۔۔۔ قسمت بھی کیا کھیل؛
کھیل رہی ہے میرے ساتھ۔۔۔" اس نے دل گرفتگی سے سر پکڑ لیا۔ اتنا سوچ سوچ کر اس
کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔

"کیا کرنا چاہتی تھی۔۔۔ اور کیا ہو گیا" اس نے سوچتے ہوئے لمبی سانس لی۔ جہاں وہ اپنے ارادے کے پست ہو جانے پر اداس تھی وہی دوسری جانب جاوید کے واپس آنے پر خوش بھی تھی۔

جاوید ارسلان۔ ارسلان منیر کے بڑے بیٹے تھے۔ ارسلان صاحب پولیس کمشنر رہ چکے تھے۔ دلاور صاحب اور ارسلان صاحب تعلیمی دور سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ہر سکھ دکھ خوشی غم میں دونوں فیملیز ایک دوسرے کے ساتھ ہوتیں۔ جاوید کی چھوٹی بہن رابعہ سے سحر کی بہت اچھی بنتی تھی۔ عمر میں 3 سال بڑی ہو کر بھی رابعہ اور سحر کی اچھی دوستی تھیں۔ سحر 10 سال کی تھی اور جاوید 16 سال کا جب ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

ہر تہوار میں سحر ہمیشہ رابعہ کے ساتھ رکنے کی ضد کرتی اور دلاور صاحب بیٹی کے اموشنل بلیک میل کے آگے ہار جاتے۔ اس رات وہ رابعہ اور جاوید دیر گئے تک بیٹھ کر باتیں کرتے گیمز کھیلتے بہت شغل رہتا۔

جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی جاوید لڑکپن سے جوانی میں جاتا گیا سحر کا اس پر کرش بنتا گیا۔ وہ دل ہی دل اسے پسند کرنے لگی۔ اپنے بڑھتے جذبات کے چلتے سحر کو جاوید سے شرم آنے لگی وہ اس کے سامنے جانے سے کترانے لگی۔ جاوید اگر کبھی اچانک سے اس کے سامنے آ جاتا تو وہ کھسیا سی جاتی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ سحر سے سیدھے منہ جاوید سے سلام دعا بھی نہیں کیا جاتا۔ اسے اپنے اس کیفیت پر سخت غصہ آتا لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی۔

وہ 15 سال کی ہوئی اور جاوید 21 کا تھا۔ جب وہ پولیس کی تعلیمات حاصل کرنے لاہور چلا گیا۔ اس رات وہ اپنے کمرے میں چھپ کر اس کی یاد میں بہت روئی تھی۔ اس کے بعد سحر کا ان

کے گھر جانا کم ہو گیا۔ جب بھی وہ وہاں جاتی نا جانے کیوں اسے جاوید بہت یاد آتا۔ جاوید سال میں ایک مرتبہ گھر آتا اور اس موقع پر سحر اپنی فیملی کے ساتھ سرما کی چھٹیوں میں گاؤں گئی ہوتی۔ اس سلسلے میں اس کا جاوید سے پھر کبھی سامنا نہیں ہو سکا تھا۔ تہواروں میں عیدوں میں وہ ارسلان انکل تھینہ آئی اور رابعہ سے ملتی لیکن کہی نہ کہی اسے جاوید کی کافی کمی محسوس ہوتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات قابو تو ہو گئے لیکن دل کے کسی کونے میں آج بھی جاوید کے لیے نرم گوشہ موجود تھا۔

آج سے پہلے اس نے جاوید کو تین سال پہلے رابعہ کی شادی میں دیکھا تھا۔ وہ 26 سال کا باوقار اور رعب دار جوان مرد بن گیا تھا۔ اس کا لمبا قد؛ چوڑی باڈی آنکھوں میں اعتماد دیکھ کر سب سمجھ گئے تھے کہ اس نے پورے دل اور لگن سے پولیس کی تعلیمات حاصل کی تھی۔ اس وقت وہ لاہور کے ہی مضافات میں اپنی کارکردگی کے جوہر دکھا رہا تھا اور صرف بہن کی شادی کے سلسلے میں کراچی آیا ہوا تھا۔

سحر کو جب پتا چلا کہ جاوید شادی میں شریک ہونے آئے گا۔ وہ بہت اہتمام سے تین دن لگاتار لگا کر عارفہ کے ہمراہ شاپنگ پر گئی تھی اور اپنے لیے اناری رنگ کا لانگ فرائیڈ خرید لائی تھی۔

بارات کے دن وہ 20 سالہ خوب رو لڑکی اناری رنگ کے لانگ فرائیڈ میں ملبوس تھی ساتھ میں لمبی ہیل والی سینڈل پہنی لمبے بال رول کئے نفیس سی جیولری زیب تن کی اور ہلکا میک اپ کیا۔

شادی ہال میں مسلسل اس کی نظریں جاوید کو ڈھونڈتی رہی اور آخر کار وہ اس کو نظر بھی آ گیا۔

دلاور صاحب سے وہ مردانہ ہال میں مل کر اب 18 سالہ صائم کے ساتھ چلتے عابدہ بیگم سے ملنے ان ہی کی طرف آرہا تھا۔ جہاں وہ ایک قدم آگے بڑھتا سحر ایک قدم پیچھے ہو جاتی۔ جس کے لیے وہ اتنے اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی اب اس کے روبہ رو ہونے میں اسے شرم محسوس ہو رہی تھی۔

شادی کے اختتام پر رخصتی کے دوران وہ رابعہ کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی جب رابعہ نے جاوید بھائی کہتے ہوئے جاوید کو مخاطب کیا۔ جاوید چلتا ہوا ان کے پاس آیا۔ سحر کا دل ڈمگانے لگا وہ تیزی سے وہاں سے جانے کے لیے مڑی تھی کہ اس کے لمبے فراق کا دامن اس کی ہیل کے نیچے آگیا وہ بہت بری طرح لڑکھرائی اور گرنے لگی تھی کہ جاوید نے اسے پکڑ لیا۔ جاوید کی بازوؤں میں آکر؛ اپنے کندھوں پر اس کے لمس کا احساس ہوتے ہی وہ گڑبڑا گئی۔

"Are you okay? ----" جاوید نے نرمی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ یک دم سر اثابت میں ہلاتے ہوئے سیدھی ہوئی اور فراق پہلوؤں سے اٹھا کر تیز رفتاری سے وہاں سے روانہ ہو گئی۔

اگلی صبح اس نے عارفہ کو رات کی روداد سنائی تو وہ پیٹ پکڑ کر ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہو گئی تھی۔

"پتا نہیں کیا سوچ رہا ہو گا میرے بارے میں" سحر نے خفگی سے کہا۔

"یہی۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ اتنی بڑی ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ اب تک ڈنگ سے چلنا نہیں آیا۔۔۔۔۔" عارفہ

نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑاتے اس پر قہقہے لگاتے ہوئے کہا۔

"شٹ اپ عارفہ۔۔۔۔۔ بس بھی کرو۔۔۔۔۔" سحر اس کے اس طرح پنسنے پر تپ گئی تھی۔

"اچھا کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ آج ولیمے میں مل کر۔۔۔۔۔ سوری اور تھینکیو۔۔۔۔۔ دونوں کہہ

دینا۔۔۔" عارفہ نے اپنے ہنسی روکتے ہوئے اسے تجویز دی۔

ولیمے کے فنکشن میں وہ سادگی سے تیار ہو کر گئی۔ عارفہ کے تجویز پر اس نے ہمت کر کے جاوید

سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سارے فنکشن وہ نظر گردانی کرتی رہی لیکن اسے وہ کہی

نہیں ملا۔ تقریب کے اختتام پر دلا اور صاحب نے ارسلان صاحب سے جاوید کی غیر موجودگی

کے متعلق پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔ اس کے ڈی آئی جی صاحب کی کال آگئی تھی۔۔۔۔ ایک ضروری کارروائی کے لیے اسے واپس بلا لیا تھا۔۔۔۔ اس لیے آج صبح ایمر جنسی میں اسے واپس جانا پڑا۔" ارسلان صاحب نے درپیش صورت حال سے آگاہ کیا۔

سحر کا دل بجھ گیا تھا اتنے سالوں بعد وہ اس سے ملی تھی اور امپریس کرنے کے بجائے وہ اپنی حرکت سے خود اس کے سامنے شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ اب پتا نہیں پھر کب دیدار نصیب ہو سوچتے ہوئے اس پر مایوسی چھا گئی تھی۔ یونیورسٹی میں داخلے کے ساتھ جاوید کے خیالات اس کے دل میں دب گئے تھے۔ اب وہ اسے بہت کم یاد کیا کرتی لیکن ہمیشہ کی طرح اس کے سامنے آجانے پر سحر کھسیا سی جاتی۔

اس دن کے بعد؛ آج تین سالوں بعد وہ اسی کے شہر میں اچھے عہدے پر فائز ہو کر واپس آیا تھا۔



صائم تھکا ہارا فٹبال میچ سے واپس آیا۔ پہلے تو صوفے پر پھیل کے بیٹھ گیا اور ٹیبل پر پڑے لوازمات کھانے لگا۔

"کون آیا تھا ممما۔۔۔۔" اس نے کاجو منہ میں بھرتے ہوئے کہا۔

ڈرائی فروٹ فریش فروٹ پیسٹری کباب سمو سے پکوڑے پیسٹیز رولز اور بھی بیکری کے اشیاء دیکھ کر وہ سمجھ گیا کوئی خاص بندے کی خاطر داری کی گئی ہے۔

"جاوید آیا تھا۔" عابدہ بیگم نے ڈائمنگ ٹیبل پر ڈش رکھتے ہوئے کہا۔ صائم جاوید کا نام سن کر خوشی سے چہک اٹھا۔

"صائم گندے ہاتھوں سے نہ کھاو۔۔۔ پہلے جا کر فریش ہو جاو" اسے کھاتے دیکھ کر عابدہ بیگم نے سختی سے تنبیہ کیا۔

وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں جانے کے بجائے سحر کے کمرے میں در آیا۔ وہ جو نہا کر نکلی تھی آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر بال برش کر رہی تھی۔

"ہائے sis ---" اس نے کہتے ہوئے اس کا بیگ اٹھایا اور پرس ٹٹولنے لگا۔

"تم آج یونیورسٹی کیوں نہیں آئے تھے۔" سحر غیر مروی نقطہ کو دیکھتے ہوئے خود کو انجان رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔

"میچ تھا میرا۔۔۔۔۔ پتا ہے ہم جیت گئے۔۔۔۔۔ اگلے ہفتے فائنل ہے۔۔۔" صائم نے جوش و خروش سے اپنے آنے والے میچ کے بارے میں معلومات فراہم کی۔

سحر نے آئینہ میں ہی اسے دیکھا وہ فٹبال کے میلے مٹھی لگے شرٹ اور شارٹس میں ہی اس کے بیڈ پر لیٹا تھا۔

"صائم گندے کپڑوں میں میرے بیڈ پر لیٹے ہو۔۔۔۔۔ اٹھو۔۔" وہ برش چھوڑ کر تند و تیز لہجے میں اسے جھڑکتی اس کے سر پر پہنچی اور اس کے ہاتھ سے بیگ لے کر اسے اپنے بیڈ پر سے اٹھایا۔

"تم نے اس گھر کے۔۔۔۔۔ شہزادے سلیم کی بے حرمتی کر دی ہے۔۔۔۔۔ گستاخ کنیز۔۔۔۔۔ میں تمہارا سر۔۔۔۔۔ قلم کرنے کا حکم دیتا ہوں۔۔۔" صائم نے مزاحیہ انداز میں آواز کو بھاری بنا کر اداکاری کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

وہ اس کا ڈانٹاگ بولنے تک خاموش رہی جب اس کی اداکاری مکمل ہوئی تو وہ کمرے کے در تک آئی اور دروازہ کھولا۔

"پاپا۔۔۔۔۔ صائم مجھے تنگ کر رہا ہے۔۔۔۔۔" وہ پورے جوش سے دلاور صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے چلائی تھی۔

صائم کی آنکھیں پھیل گئی۔ وہ دانت پیستے ہوئے اس کے سامنے آیا۔

"صائم۔۔۔۔۔" وہ کچھ اور کہتا اس سے پہلے دلا اور صاحب نے رعب دار آواز میں اسے پکارا۔
 "آیا۔۔۔۔۔" آیا۔۔۔۔۔" وہ منہ پھلائے زیر لب سحر کو سناتے ہوئے اسے آنکھیں دکھاتا
 باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی سحر نے سرد سانس خارج کی اور پھر سے برش کرنے لگی۔



وہ جو صائم پر حملہ کرنے کا منصوبہ بندی کر کے گیا تھا۔ اس انجان آدمی سے جھڑپ کر کے اپنا
 منصوبہ بغیر تکمیل کئے واپس آگیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے گھر میں داخل ہوا۔ کمرے میں
 جاتے ہی تیز تیز شرٹ اتاری اور واشروم میں گھس کر ٹھنڈے پانی کے شاور میں کھڑا ہو گیا۔

اس وقت اپنے جذبات قابو کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی آپشن نہیں تھا۔ بار بار زرتاج کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس لمحے کو یاد کرنے لگا۔

8 سال کا وہ بچہ اپنے سے عمر میں بڑے لڑکے سے لڑائی جھگڑا کر رہا تھا۔ اس نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

اس لڑکے کی چیخ و پکار سن کر زرتاج کمرے سے باہر آئی۔

"یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔ چھوڑو۔۔۔۔۔" وہ تیزی سے ان بچوں کے پاس گئی اور لڑائی آزاد کروائی۔

اپنے ننھے شاہ سوار کو غصے سے آگ بگولادیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھی۔ وہ ماں کی گرفت سے آزاد ہو کر پھر سے اس لڑکے پر جھڑپنا چاہتا تھا لیکن زرتاج نے اسے جھنجوڑ دیا۔

"کسی کو ناحق نہیں مارتے۔۔۔ کیوں مار رہے ہو اسے۔۔۔" اس نے شدید تفکر میں پوچھا۔

زرتاج کو اس کی مایوس کن شکست خوردہ باتوں سے بہت تکلیف ہوئی۔ وہ حسب عادت ڈوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی اٹھی اور اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"پڑنا چاہیے۔۔۔۔۔ تمہیں فرق پڑنا چاہیے۔۔۔۔۔ تمہارے باپ کا نام اتنا کم ظرف نہیں ہے
بیٹا۔۔۔۔۔ کہ کوئی ان کے لیے گالی نکالے۔۔۔۔۔" اس کی ماں نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ
پھیر کر سمجھانے لگی۔

"وہ بہت اچھے انسان ہے۔۔۔۔۔ صاف دل۔۔۔۔۔ نیک۔۔۔۔۔ ایماندار۔۔۔۔۔ خوش
اخلاق۔۔۔۔۔ پیار محبت بانٹنے والے۔۔۔۔۔" اس کی ماں نرمی سے مدھم آواز میں اسے اپنے
انجان باپ کی خوبیاں گنوانے لگی۔

غصے سے سرخ گال پھلائے بچے نے اداس نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"جو بھی ہو۔۔۔۔۔ پر ہماری اسے کوئی پروا نہیں ہے نا۔۔۔۔۔ ورنہ ایسے چھوڑ کر جاتا

کیا۔۔۔" اس نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ وہ بالکل بھی غائبانہ باپ کے خصوصیات سے قائل ہونے کے لیے راضی نہیں تھا۔

زرتاج بے بسی سے لب کاٹنے لگی۔

"تمہیں پتہ ہے۔۔۔۔۔ قسمت کون لکھتا ہے۔۔۔۔۔" اس نے چمکتی گول گہری آنکھیں بڑی کر کے اس سے پوچھا۔

جواب میں وہ خاموش رہا تو زرتاج نے اس کا چہرہ اپنے جانب کیا۔

"قسمت اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ ہماری زندگیوں میں جو بھی ہونا ہوتا ہے وہ پہلے سے لکھا

ہوتا ہے۔۔۔۔۔ میری قسمت میں تمہارے پایا کا اتنا ہی ساتھ لکھا تھا۔۔۔۔۔ مدت پوری

ہوئی تو ساتھ بھی چھوٹ گیا۔۔۔۔۔" زرتاج کچھ لمحے اپنے آنسو روکنے خاموش ہو گئی۔

اس نے ماں کی آنکھوں میں بے پناہ افسردگی دیکھی تھی۔

"پر اس کا یہ مطلب نہیں۔۔۔۔۔ کہ ہم ان کی بے حرمتی ہونے دیں۔۔۔۔۔ ان کی بے عزتی برداشت کریں۔۔۔۔۔ اگر کبھی بھی کوئی تمہارے پاپا کے لیے غلط الفاظ استعمال کریں۔۔۔۔۔ تو تمہیں ان کو جواب دینا چاہیے میرے شاہ سوار۔۔۔۔۔" زر تاج نے مسکراتے ہوئے اپنے لخت جگر کو سینے سے لگایا۔

یادوں کے پھوار اس کے اوپر گرتے شاور کے پانی میں بہہ گئی۔ وہ پھر سے ماضی سے نکل کر حال میں لوٹ آیا۔ شاور بند کیا اور تولیہ سے گیلے بال سکھانے لگا۔

آج اسے فرق پڑا تھا۔۔۔۔۔ آج اس نے اپنے باپ کو گالی دینے والے کو منہ توڑ جواب دیا تھا۔۔۔۔۔ آج اپنے باپ کے لیے غلط الفاظ نکالنے والے کی اس نے مار مار کر چٹری سجادی تھی۔۔۔۔۔ کاش اپنے شاہ سوار کی یہ جرأت مندی دیکھنے اس کی ماں زندہ ہوتی؛ سوچتے ہوئے اس نے سر جھٹکا پھیکا سا مسکرایا اور اپنے الماری سے خشک کپڑے نکال کر چینیج کرنے لگا۔



عارفہ کی شاویز سے اس دن کے بعد سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نظر انداز تو وہ کافی دنوں سے کرتا رہا تھا۔ پر اس دن کے بعد وہ مکمل طور پر اس کے سامنے آنے سے بھی گریزاں تھا۔

عارفہ ملنے کی کوشش کرتی پر وہ کسی بہانے سے دور چلا جاتا۔

دو دن بعد یونیورسٹی کی تعطیلات کا آغاز ہونے والا تھا اس لیے آج عارفہ نے اس سے لازمی بات کرنے کے ارادے سے لائبریری کے باہر اسے جکڑ لیا۔

"کیا ہو گیا ہے شادیز۔۔۔۔۔ ایسا کیوں بیہو کر رہے ہو۔۔۔۔۔ میرا نمبر بھی بلاک کر دیا ہے۔۔۔۔۔ یونی میں بھی اگنور کرتے ہو۔۔۔۔۔ ناراض ہو۔۔۔۔۔" عارفہ نے ایک ہی سانس میں سب شکایات اور سوالات پوچھ ڈالے۔

شاویز سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے اپنا بازو چھڑا گیا۔

"آئی ایم سوری عارفہ۔۔۔۔۔۔ پر مجھے تم سے اب کوئی رابطہ نہیں رکھنا۔۔۔" اس نے سیاٹ انداز میں سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

عارفہ پر جیسے گڑھوں یانی گر گیا ہو وہ یک دم ہی روہانسی ہو گئی۔

"دیکھو شاویز۔۔۔۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔۔۔۔ تو میں دل سے معذرت خواہ ہوں۔۔۔۔ پر اس طرح رابطہ توڑنے کی بات مت کرو۔۔۔۔" اس کا دل ڈمگانے لگا۔

"اوپر سے وہ سحر۔۔۔۔ ہر وقت مجھے ڈانٹتی پھرتی ہے۔۔۔۔ میری بھی کوئی self respect ہے۔۔۔۔ اس طرح ہر وقت اس کے ہاتھوں بے عزت ہوتا نہیں پھر سکتا۔۔۔۔" شاویز کا لہجہ بے لچک اور سپاٹ تھا اسے اب کسی کی پروا نہیں تھی۔

"اور تم سحر کی سزا مجھے دے رہے ہو" دو آنسو ٹوٹ کر اس کے رخسار پر بہہ رہے تھے۔

"تم سے دوستی بھی میں نے سحر کے قریب جانے کے لیے کی تھی۔۔۔۔ پر اب جب وہ نہیں تو تم بھی نہیں۔۔۔۔" شاویز نے ہاتھ اٹھا کر اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

اس بات پر عارفہ شاک سی ہو گئی۔

"تم نے مجھ سے دوستی۔۔۔۔ سحر کے لیے کی تھی۔۔۔۔ کیا تم۔۔۔۔ سحر کو پسند کرتے ہو۔۔۔" بے یقینی سے اس نے شاویز کے بے تاثر چہرے کو دیکھا۔

"آگر تم سیدھا سیدھا جواب سننا چاہتی ہو۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ ہاں۔۔۔" اس کے یک ٹک جواب سے عارفہ کا دل ڈوب گیا۔ اس نے کرب سے آنکھیں میچھ لی۔ اس کی سانس رکنے لگی۔

"میرا زرا بھی احساس نہیں ہوا۔۔۔۔۔ میرے جذبات سے کھیلا۔۔۔۔۔ میرا دل توڑ دیا۔۔۔۔۔ سحر کے رقت کے لیے اتنے بے حس ہو گئے تم۔۔۔۔۔" عارفہ کو ایک کے بعد دوسرا شاک مل رہا تھا۔ اس کا دل بھر آ گیا۔ وہ اپنی جگہ جامد ہو گئی تھی۔ اس سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ شدید گرمی میں بھی اسے ٹھنڈ لگنے لگی۔ اسے کپکپی ہونے لگی تھی۔

"میں سوری کر رہا ہوں نا۔۔۔۔۔ تسلیم کر رہا ہوں اپنی غلطی۔۔۔۔۔ اور کیا کروں۔۔۔۔۔"

شاویز دو قدم آگے ہوا اور کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے تیز آواز میں غرایا۔

عارفہ بے حس و حرکت بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کاش سوری کہہ دینے سے سب پہلے جیسا ہو سکتا۔۔۔" اس کا زور زور سے رو دینے کو دل کیا۔

اس کی کسی بھی بات کا اثر لیئے بغیر شاویز جانے لگا۔

"اب سے ہم نہ رابطہ کریں گے۔۔۔ اور نہ ملے گے۔۔۔ its over ---" جاتے

جاتے اس نے سختی سے تنبیہ کرتے ہوئے کہا اور بنا مڑے آگے بڑھ گیا۔

عارفہ نے اسے روکنا چاہا پر وہ نہیں رکا۔ وہ اس کا دل اپنے قدموں تلے روندتے ہوئے اس سے اپنے سارے رابطے توڑتا وہاں سے چلا گیا اور عارفہ بہتے آنسوؤں سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔



دلاور صاحب کی نئی کمپنی کی تکمیل ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں افتتاحی تقریب کے سلسلے میں اچھی خاصی پارٹی دینے کا انتظام بھی کیا جا چکا تھا جس کی سکیورٹی کے لیے جاوید نے اپنی ٹیم کو چاک و چوبند کر رکھا تھا۔

یونیورسٹی کے تعطیلات کے چلتے عارفہ اور سحر کی ملاقاتیں بھی کم ہو گئی تھیں۔ سحر زیادہ تر اوقات گھر میں رہتی۔ البتہ صائم اپنے فٹبال میچ کے لیے جاتا رہتا۔

ان دنوں دلاور صاحب چیف مینسٹر سے کمپنی کے اجازت نامے پر دستخط کروانے اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔

صائم کا آج فائنل میچ تھا۔ وہ جلدی سے تیار ہوا اور اپنی بانک پر سوار ہو کر گراؤنڈ کے لیے روانہ ہو گیا۔ مین روڈ پر پہنچ کر اس نے ایک طویل ٹریفک جام دیکھی۔ گھڑی دیکھتے ہوئے اس نے سر جھٹکا اور بانیں جانب گلی میں مڑ گیا۔ اسے میچ کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ وہ الگ الگ گلیوں میں بانک لے جاتے ہوئے جلد از جلد اپنے منزل کو پہنچنا چاہتا تھا۔ ایک گلی کے کونے پر وہ موڑ مڑا ہی تھا کہ سامنے ایک بلیک لینڈ کروزر کار اس کے راستے میں آگئی۔ اس نے پھرتی سے بریک مارا۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ وہ سیٹ سے اٹھ کر آگے جھک گیا۔ خود کو سنبھال کر اس

نے سامنے دیکھا وہ بلیک لینڈ کروزر کار وہاں سے او جھل ہو چکی تھی۔ اس نے جان بچی تو لاکھوں پائے؛ سوچتے ہوئے پھر سے بانک سٹارٹ کی اور روڈ پر آگیا۔

تیز سپیڈ سے بانک چلاتے اسے احساس ہوا وہ بلیک لینڈ کروزر کار عین اس کے پیچھے ہے اور بار بار اسے لائٹ مار رہی ہے۔ وہ اس کار کو راستہ دینے سائیڈ پر بھی ہوا لیکن وہ کار آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ صائم کے آبرو تن گئے۔ وہ اضطراب میں سپیڈ کم اور تیز کرنے لگا تو وہ کار بھی اس کے ساتھ ہی اپنی سپیڈ کم یا تیز کر دیتی۔ صائم کو وہ کار مشکوک لگی۔ اس نے کار کے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن اس کار کے شیشے بھی کالے رنگ کے تھے اس لیے وہ کچھ دیکھ نہیں سکا۔

گروانڈ کے سڑک پر بانک لاد کر صائم نے دیکھا اس بلیک لینڈ کروزر کار نے اپنی سپیڈ بڑھائی اور ایک جھٹکے سے اس کے بانک کے سامنے آگئی۔ صائم سہم گیا اور گھبراہٹ میں بانک کو غلط رخ موڑا کہ یک دم اس کا موازنہ ڈگمگا گیا اور پوری قوت سے بانک صائم کے بانیں پیر پر گر گئی اور ساتھ ہی کچھ میل تک اسے ساتھ لیے آگے گھسیٹ گئی۔ صائم نے بریک پر زور دیا تو بانک

کے ٹائر رک گئے لیکن تیز سپیڈ کی وجہ سے کھچاواتنا زوردار تھا کہ بانک پر صائم کی گرفت چھوٹ گئی۔ وہ وہی گر پڑا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بانک دوسری گاڑیوں سے ٹکرا کر ضرر زدہ ہو گئی۔ اس کے ٹکڑے ادھر ادھر اڑتے نظر آئے۔

صائم کا بایاں بازو اور پیر بری طرح زخمی ہو گیا تھا اس کی فٹبال کی جرسی خون سے لت پت ہو گئی۔ وہ درد سے کراہنے لگا۔ اس نے بھیگی آنکھوں سے پیچے دیکھا وہ بلیک لینڈ کروزر کا اسی طرز میں کھڑی تھی۔ شاید اندر بیٹھا شخص اس کے زخموں کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحے اور گزرے صائم نڈھال پڑتا گیا۔ اس کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ وہ بے ہوش ہونے لگا اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تو اس نے دیکھا وہ بلیک کار خاموشی سے مخالف سمت روانہ ہو گئی۔



"ہیلو۔۔۔ ہاں صائم۔۔۔ کیا۔۔۔ کہاں پر۔۔۔ اچھا میں آرہا ہوں۔۔۔" شاویز کو ایک انجان نمبر سے کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف صائم تھا۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا وہ بہت مشکل سے گفتگو کر رہا ہے۔

صائم کی جب آنکھ کھلی وہ ہسپتال میں تھا۔ اس کے بائیں پیر اور بازو پر پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے اپنے موبائل کا اسے پتا نہیں تھا کہ کہی گر گیا تھا یا اس کے بے ہوشی کے وقت کسی نے چرا لیا تھا۔

پاپا اسلام آباد میں تھے اور گھر پر فون کر کے وہ ممّا اور سحر کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جاوید بھائی کا نمبر اسے زبانی یاد نہیں تھا۔ ان سب کے علاوہ جو نام اس کے ذہن میں نمودار ہوا تھا وہ

شاویز کا تھا۔ شاویز کا نمبر اتنا آسان تھا کہ صائم کو ایک ہی دفعہ میں یاد ہو گیا تھا۔ اس نے ہوش میں آ کر نرس کے موبائل سے شاویز کو کال ملائی اور اپنے ایکسیڈنٹ کا بتایا۔

جس وقت شاويز اس کے پاس پہنچا وہ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ صد شکر کہ اسے زیادہ زخم نہیں آئے تھے۔ پر تکلیف کی وجہ سے اسے اٹھنے بیٹھنے میں مدد درکار تھی۔ ہاتھ اور پیر پوری طرح چھل گئے تھے اور پیر بھاری بانگ گرنے کے باعث بل پڑ گیا تھا۔

ان سب سے زیادہ دکھ اسے اپنے آج کے فائنل میچ میں شرکت سے محروم ہونے کا تھا۔
بانک کی حالت تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا تو اس کا کیا غم بیان کرتا۔

صائم کے ہی کہنے پر شاویز نے اس کے گھر کال کر کے عابدہ بیگم کو صائم کارات اس کے ساتھ رکنے کا بتایا۔ لیکن وہ ماں تھی فوراً سمجھ گئی کہ کوئی تو بات ہے اس لیے انہوں نے صائم سے بات

کرنے کی ضد کی۔ اس سے گفتگو کے دوران عابدہ بیگم کو احساس ہوا کہ وہ تکلیف میں مبتلا ہے۔

ان کے بار بار پوچھنے پر صائم نے اپنے ساتھ ہوئے حادثے کے بارے میں انہیں بتایا۔

"مما۔۔۔۔۔مما میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ زیادہ نہیں لگی۔۔۔۔۔ پلیز ایسے نہ روئے۔۔۔۔۔"

عابدہ بیگم بیٹے کے زخمی ہونے کا سن کر فون پر ہی زار و قطار رونے لگی۔ ان کی رونے کی آواز

سن کر سحر ہڑبڑا کر بھاگتے لاؤنج میں آئی۔

عابدہ بیگم تو روئے جا رہی تھی ان سے کچھ کہا نہیں گیا۔ سحر نے از خود ان کے ہاتھ سے فون کا

رسیور لیکا اور صائم سے بات کرنے لگی۔

"صائم۔۔۔ تم کس ہسپتال میں ہو۔۔۔ مجھے بتاؤ۔۔۔ میں ابھی آتی ہوں۔۔۔" سحر

نے لرزتے آواز میں کہا۔ اسے اپنے چھوٹے دل عزیز بھائی کی بہت فکر ہونے لگی تھی۔

صائم ہسپتال کے بستر پر نیم دراز لیٹا؛ موبائل فون کان سے لگائے ہوئے حیران پریشان شاویز کو دیکھنے لگا۔ اس سے اپنی ماما اور بہن سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ شاویز اس کے سامنے صوفے پر بیٹھے ہوئے ہاتھ ہوا میں اٹھا کر آبرو اچکا کر مسکرایا۔

صائم نے سرد سانس خارج کی اور پھر سے کال کی طرف متوجہ ہوا۔

"سحر۔۔۔ اس وقت اتنی رات گئے۔۔۔ تم یہاں آ کر کیا کر لو گی۔۔۔ میں اب ٹھیک ہوں۔۔۔ میں نے صرف اپنی خیریت بتانے کال کی تھی۔۔۔" وہ اب مستحکم لہجے میں متفکر بہن کو دلا سہ دے رہا تھا۔

"ابھی تم آ بھی جاؤ تو میں تو سو جاؤں گا۔۔۔ اور صبح ویسے بھی ڈسچارج ہو رہا ہوں۔۔۔ تم پلیز اس وقت ماما کو سنبھالو۔۔۔ میری تشویش مت کرو۔۔۔ میرے ساتھ شاویز ہے نا۔۔۔ صبح گھر آ کر ملتا ہوں۔۔۔ اوکے میری پیاری بہن۔۔۔" اس نے معصوم انداز بنا کر سحر کو قائل کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ پر اپنا خیال رکھنا۔۔۔۔۔ تکلیف زیادہ ہو تو فوراً ڈاکٹر کو بلا لینا۔۔۔۔۔" سحر نے اسے ہدایات جاری کی اور فون رکھ کر ماما کی جانب متوجہ ہوئی۔ عابدہ بیگم اشک بار آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ماما کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

صائم نے کال کاٹ کر سکون کی سانس لی اور موبائل شاویز کی طرف بڑھایا۔

"تمہاری کوئی بہن ہے شاویز۔۔۔۔۔" صائم نے استخز یہ ہنستے ہوئے کہا۔

شاویز نے موبائل تھام کر نفی میں سر ہلایا۔

"پھر تو شکر کرو۔۔۔۔۔ کیونکہ بہنوں کو سنبھالنا انٹری ٹیسٹ سے بھی مشکل کام ہے۔۔۔۔۔ وہ

بھی اگر بہن سحر جیسی ہو۔" کہتے کہتے وہ کھکھلا کر ہنسا۔ اس کا ساتھ دینے شاویز بھی مسکرا دیا۔

"چلو اب تم آرام کرو۔۔۔۔۔ اس وقت تمہیں ریٹ کی ضرورت ہے۔۔۔" شاویز ہدایت دیتے صوفے پر سے اٹھا اور اس کے پاس آکر اسے لیٹنے میں مدد کی۔



وہ رات سحر اپنی ماما کے ساتھ ان کے کمرے میں سوئی۔ عابدہ بیگم کو تو پریشانی سے نیند ہی نہیں آئی۔ جیسے تیسے کر کے رات گزاری۔ فجر کی نماز میں اپنے نور چشم کے لیے بہت دعائیں کی۔ ان سے اور رہا نہیں گیا اور طلوع آفتاب کے ساتھ ہی انہوں نے دلاور صاحب کو کال کر کے وہاں کے درپیش حالات سے واقف کیا۔

سحر جب اٹھی اسے ماما پر غصہ آگیا۔

"مما۔۔۔۔ کیا ضرورت تھی پایا کو پریشان کرنے کی۔۔۔۔ اب وہ اپنا سارا کام چھوڑ کر واپس روانہ ہو جائے گا۔۔۔۔۔ چھوٹا سا ایکسیڈنٹ تھا تھوڑی دیر میں وہ گھر بھی آ جائے گا۔۔۔۔۔ آپ بھی نا۔۔۔۔" سحر نے کہتے ہوئے بے بسی سے سر پکڑ لیا۔

"مجھ سے مزید صبر نہیں ہو سکا۔۔۔۔" عابدہ بیگم نے بھر آئی آواز میں اپنے کئے کی وضاحت دی۔

سحر کو جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا۔ دلاور صاحب اپنے مینیجر اور سیکرٹری کو مینسٹر صاحب کے دفتر میں متعارف کروا کر خود پہلی فلائٹ سے واپسی روانہ ہو گئے تھے۔

دن کے 11 بجے تک صائم ہسپتال سے رخصت ہو گیا تھا۔ زخموں کی نوعیت زیادہ پریشان کن نہیں تھی۔ اسے ابھی ایک دو ہفتے بس آرام کرنا تھا اور پابندی سے پٹی تبدیل کرواتے رہنا تھا۔ زیادہ بھاگ دوڑ اور چلنے پھرنے سے احتیاط برتنی تھی۔

عابدہ بیگم کے ضد پر بھی سحر انہیں ساتھ ہسپتال لے کر جانے پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی عابدہ بیگم صائم کو پیٹوں میں جکڑا دیکھ کر جذباتی ہو جائے گی اور رودے گی اس لیے وہ انہیں تسلی سے گھر پر ہی انتظار کرنے کی ہدایت دے کر خود ڈرائیور کے ساتھ چلی گئی۔

اس دن کے بعد سحر کی ہسپتال میں شاویز سے ملاقات ہوئی۔ رسمی سی علیک سلیک ہوئی۔ سحر کے ہوتے ہوئے بھی اٹھنے بیٹھنے میں شاویز ہی صائم کی مدد کرتا رہا۔ سحر کو اپنے برے رویے پر پچھتاوا ہوا۔ وہ مسلسل شاویز کو دیکھتی رہی اور وہ بدلے میں مسلسل اسے نظر انداز کرتا رہا۔

اسے کار میں بیٹھا کر شاویز جانے لگا تھا لیکن صائم نے اسے روک لیا اور ان کے ساتھ گھر جانے کی پیشکش کی۔ اس کے بہت اصرار پر شاویز گاڑی میں بیٹھ گیا اور کار ان کے گھر کی جانب بڑھ گئی۔



عابدہ بیگم اضطراب میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہی تھی جب صائم؛ شاویز کے کندھے پر بازو ڈالے لنگڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ سحر خاموشی سے ان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ انہیں آتے دیکھ کر عابدہ بیگم تیزی سے ان کے پاس پہنچی اور روتے ہوئے صائم کو گلے سے لگایا۔

"مما۔۔۔ پہلے آرام سے بیٹھنے تو دیں۔۔۔ پھر تسلی کر لیجیے گا۔۔۔" سحر نے آنکھیں بڑی کر کے عابدہ بیگم کو گھورا۔ وہ آنسو پونچھتی گیلی سانس اندر کھینچتی سامنے سے ہٹی۔

صائم کے زخمی پاؤں کا سوچ کر انہوں نے اس کے لیے نیچے اپنے کمرے کے ساتھ والا کمرہ تیار کروایا تھا۔ وہ اسی طرح شاویز کا سہارا لیئے کمرے میں آیا اور بیڈ پر نیم دراز بیٹھ گیا۔ اپنے بیٹے کو آرام دہ ہوتا دیکھ کر عابدہ بیگم تسلی ہو گئی۔

"کھڑے کیوں ہو۔۔۔ بیٹھو۔۔۔" صائم کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ شاویز سے مخاطب ہوئی۔

اس نے منع کرنا چاہا لیکن انہوں نے اسے ہاتھ سے تھام لیا۔

"ناشتہ کیے بغیر تو میں جانے نہیں دوں گی۔۔۔ اور ویسے بھی۔۔۔ صائم کے پاپا بس پہنچنے والے ہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے خاص طور پر مجھے ہدایت دی ہے کہ ان کے آنے تک تمہیں

بیٹھائے رکھوں۔۔۔۔۔ وہ خود تم سے مل کر پر سنلی شکریہ کرنا چاہتے ہے۔۔۔ "عابدہ بیگم نے خوش دلی سے کہا اور صائم کو آرام کرنے کا کہہ کر شاویز کو ساتھ لیئے لاؤنج میں آگئی۔

سحر کچن میں ملازمہ کے ساتھ صائم کے لیے سوپ بنانے لگی تھی اور عابدہ بیگم لاؤنج میں شاویز کی خاطر داری کرنے۔ وہ اس کے آگے الگ الگ لوازمات رکھنے لگی تھی اور شاویز غیر آرام دہ ہو کر ہر چیز سے منع کرتا رہا۔

"آنٹی۔۔۔۔۔ ان سب کی کوئی ضرورت نہیں ہے سیر یسلی۔۔۔۔۔" اس نے ان کا دل رکھنے صرف ایک کپ چائے سے کفارہ کیا۔

ابھی وہ چائے پی رہا تھا جب اس نے دروازے سے ایک نوجوان کو پولیس وردی میں تیار؛ تیز قدموں سے اندر آتے دیکھا۔

عابدہ آنٹی اسے دیکھ کر مسکرائی اور ملنے کھڑی ہو گئی۔

"جاوید۔۔۔" انہوں نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔

"میں آپ سے بہت ناراض ہوں آنٹی۔۔۔ ہمیشہ بیٹا بیٹا کہتی ہے۔۔۔ لیکن ضرورت کے وقت پر ایا کر دیا۔۔۔ خان انکل یہاں نہیں تھے تو کیا ہوا۔۔۔ میں تو تھا۔۔۔ آپ مجھے ایک کال کر لیتی۔۔۔ یہ تو میری تھوڑی دیر پہلے خان انکل سے کال پر بات ہوئی ہے۔۔۔ تو انہوں نے بتایا صائم کے ایکسیڈنٹ کا۔۔۔" جاوید نے جعلی خفگی سے آبرو جمائے ہوئے کہا۔

وہ وردی میں تیار ہو کر ڈیوٹی پر جانے کے لیے نکل رہا تھا جب اسے دلاور صاحب کی کال موصول ہوئی۔ وہ چاہتے تھے جب تک وہ واپس پہنچتے ہے؛ جاوید ان کے فیملی کی حفاظت کریں۔ اس لیے ان کی بات سنتے ہی جاوید فوراً آگیا تھا۔ پولیس کی خاکی وردی پہنے۔ بال چھوٹے تراشے ہوئے۔ سینہ تانے۔ ڈاڑھی موچ نفاست سے بنائے وہ باوقار آفسر عابدہ بیگم سے گلہ کر رہا تھا۔

عابدہ بیگم اسی طرح اس کا ہاتھ تھام کر مسکرائی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ تمہیں کال کرنا یاد نہیں رہا۔۔۔۔۔"
 اور پھر شاویز تھانا صائم کے ساتھ۔۔ "عابدہ بیگم نے دفاعی انداز میں تیزی سے اسے شاویز کی
 طرف متوجہ کیا۔

جاوید مسکراتا ہوا اس کے جانب مڑا تو وہ کھڑا ہو گیا۔

"ہائے شاویز۔۔۔۔۔ A.S.P جاوید" جاوید نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے مصافحہ کرنے ہاتھ
 آگے کیا۔

جو شاویز نے بروقت مسکرا کر تھام لیا اور جنبش دے کر مصافحہ کیا۔

"اچھا آئی۔۔۔۔۔ میں زرا صائم سے مل لوں۔۔۔۔۔ کہاں ہے وہ۔۔۔۔۔" جاوید مصافحہ کر کے
 پھر سے عابدہ بیگم سے گویا ہوا۔

"نیچے والے کمرے میں ہیں۔۔۔۔۔" انہوں نے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بتایا تو وہ سر کو
 جنبش دیتا اس کمرے کی جانب بڑھ گیا۔



"کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ ایسے ہارجیت تو ہوتی رہتی ہے۔۔۔۔۔ ہم سب اس بات کا شکر کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ کہ اللہ کے فضل سے تمہیں زیادہ نہیں لگی۔" جاوید اس کے پہلو میں بیٹھ کر بڑے بھائی کے جیسے سمجھانے لگا۔



شاویز کو اب واقعی جانا تھا۔ عابدہ بیگم نے اس کی مرضی کا لحاظ کرتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دی ہی تھی کہ پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

"لو۔۔۔۔۔ آگئے۔۔۔۔۔" کہتے ہوئے وہ لاؤنج کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

دلاور صاحب تیز قدموں سے پورچ کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔

"عابدہ۔۔۔۔ صائم کیسا ہے۔۔۔۔" انہوں نے اکھڑے سانس میں پوچھا۔ تیز تیز سفر کرنے سے ان کی سانس چڑھ گئی تھی۔

"وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔۔۔۔ کمرے میں آرام کر رہا ہے۔۔۔۔" بیوی کے تسلی بخش تاثرات دیکھ کر انہیں راحت ملی۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔۔۔" دلاور صاحب نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یہ شاویز ہے۔۔۔۔" اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتے عابدہ بیگم نے انہیں شاویز کی طرف متوجہ کیا جو ان سے تھوڑا فاصلے پر کھڑا انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

دلاور صاحب براؤن کلر کے سوٹ میں ملبوس قدم قدم چلتے اس کے طرف آنے لگے۔

دلاور پرویز خان کی بارعب اور بااعتماد شخصیت سے؛ ان کے پر خلوص لہجے سے شاویز بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

"ہائے شاویز۔۔۔۔۔ تھینکیو سوچ۔۔۔۔۔" انہوں نے شاویز کو مخاطب کیا اور اس کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کرنے لگے۔

"میری غیر موجودگی میں۔۔۔ میرے بیٹے کی مدد کر کے۔۔۔ تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔۔۔" دلاور صاحب اسی انداز میں اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے نرمی سے پلکیں جھپکا کر اس سے اظہار تشکر کر رہے تھے۔

"پلیز انکل۔۔۔ اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔۔۔ اس میں احسان کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔ صائم میرا دوست ہے۔۔۔۔۔ اس کی مدد کرنا میرا فرض تھا۔" شاویز نے خوش اخلاقی سے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی خوش مزاجی کو سراہنے لگے۔ ان سے رخصت لیتا شاویز باہر کی سمت بڑھ گیا اور دلاور صاحب صائم سے ملنے چلے گئے۔



جاوید نے صائم سے حال احوال پوچھتے اور باتیں کرتے ہوئے ایک آدھ مرتبہ خاموش نظروں سے سحر کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے سوپ پر نظریں جمائے متواتر چیچ ہلا رہی تھی۔

"او کے میں چلتا ہوں۔۔۔۔۔ تم جلدی سوپ پیو۔۔۔۔۔ چھچ چلا چلا کر پہلے ہی سارا ٹھنڈا کر دیا ہے۔" اٹھتے ہوئے شرارتی انداز میں آبرو اچکا کر جاوید نے سحر کو ڈائریکٹ مخاطب کئے بغیر اس پر تبصرہ کیا۔

جاوید کو دیکھتے ہوئے صائم لب میٹھے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کرنے لگا جبکہ سحر خود پر ہونے والے اس تبصرے پر چھنپ سی گئی اور چیخ ہلاتا ہاتھ رک گیا۔

جاوید دروازے کے در تک گیا تھا کہ دروازہ کھول کر دلاور صاحب اندر داخل ہوئے۔
دروازے پر ہی ان سے کچھ مباحثہ کر کے جاوید باہر نکلا اور دلاور صاحب اندر آئے۔

جاوید کے جاتے ہی سحر کے پیروں میں حرکت شروع ہوئی۔ وہ بھاگتی ہوئی لاؤنج میں گئی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

"مما۔۔۔ شاویز چلا گیا کیا۔" اس نے عابدہ بیگم کو بلند آواز میں مخاطب کیا۔

"ہاں۔۔۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی نکلا ہے۔۔۔" عابدہ بیگم نے بھی اپنے کمرے سے جوابی صدا لگائی۔

ان کا جواب سن کر وہ بھاگتے ہوئے گھر کے گیٹ سے باہر جھانکنے لگی۔ خوش قسمتی سے اسے شاوینز دیکھ گیا تھا۔ وہ بس تھوڑا ہی آگے گیا تھا۔

جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پیدل چلتے ہوئے شاویز نے کسی کو خود کو پکارتے سنا۔ اس نے رک کر پیچھے دیکھا سحر اسی کی طرف بھاگ کر آرہی تھی۔

وہ پورا گھوم کر اس کے جانب رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ بھاگتے ہانپتے اس کے پاس پہنچی۔
"تھینکیو" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

سوچتے ہوئے حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ اس نے دوبارہ اسے پکارنا چاہا لیکن تب تک وہ ان کے گلی کے حدود سے دور جا چکا تھا۔



عارفہ اپنے گھر کے لان میں گم سم بیٹھی تھی۔ غیر مروی نقطہ کو دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی۔

"کیوں میں اس کے ارادے سمجھ نہیں پائی۔۔۔ کیوں بنا سوچے سمجھے اسے دل دے دیا۔۔۔۔ اس نے کبھی مجھے پرویز نہیں کیا۔۔۔ کبھی یہ تک نہیں کہا کہ وہ مجھے پسند کرتا

ہے۔۔۔ پھر میں نے کیوں سمجھ لیا تھا میرا پیار ایک طرفہ نہیں ہے۔۔۔ کیوں یہ مان بیٹھی تھی کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔۔۔ "سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آگئی تھیں۔

شاویز کے باتوں کی تصدیق کرنے سحر خود عارفہ کے گھر ملنے آئی۔ گھر کے اندر داخل ہو کر اس نے عارفہ کو لان میں بیٹھایا۔

وہ اس کے پاس آئی اس کے عین سامنے کھڑی ہو گئی پھر بھی عارفہ کو احساس نہیں ہوا کہ کوئی وہاں آیا ہے۔

سحر اسے غائب دماغ پا کر اس کے پڑمردہ چہرے کو دیکھ کر سب حقیقت سمجھ گئی۔ ایک دم اسے عارفہ پر بہت افسوس ہوا۔ کیا حال کر دیا اس نے میری چنچل سہیلی کا؛ سوچتے ہوئے سحر کو شاویز سے نفرت ہونے لگی۔ اسے شاویز پر شدید غصہ آ رہا تھا لیکن موڈ کو ٹھیک رکھتے ہوئے وہ زبردستی عارفہ کے ساتھ اڈ جسٹ ہوتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

عارفہ کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ وہ اداس نظروں سے سامنے لان میں دیکھنے لگی۔

"میں بات کرتی ہوں شاویز سے۔۔۔۔۔ ایسا کیسے کر سکتا ہے وہ میری فرینڈ کے

ساتھ۔۔۔۔۔ میری بیسٹ فرینڈ کا دل توڑنے پر۔۔۔۔۔ میں اسے چھوڑو گی۔" سحر نے ٹھوس

اقدامات اٹھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے سختی سے کہا۔

"نہیں سحر۔۔۔۔۔ تم اس سے کوئی بات نہیں کرو گی۔۔۔۔۔ وہ مجھے پسند ہی نہیں

کرتا۔" عارفہ نے دل گرفتگی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

سحر نے مایوسی سے اس کے بے رنگ چہرے کو دیکھا

"اب تک وہ تمہیں ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا ہے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ پورے شہر میں چراغ

ہاتھ میں لے کر ڈھونڈے گا۔۔۔۔۔ تب بھی تمہاری جیسی نہیں ملے گی اسے۔۔۔" سحر نے

اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

عارفہ اس کی بات پر پھیکا کا مسکرائی۔

"اب سمجھنے سمجھانے کو کچھ نہیں بچا۔۔۔۔۔ ویسے بھی وہ۔۔۔۔۔ کسی اور پسند کرتا ہے۔۔۔"

اس سے سیدھے سادے سحر کا نام نہیں لیا گیا۔ اس نے بات گھمادی۔

"کیا۔۔۔۔۔ اتنا چپ ہے وہ۔۔۔۔۔ دل میں کوئی اور تھی۔۔۔۔۔ اور وقت تمہارے ساتھ

گزار رہا تھا۔۔۔۔۔ ٹائم پاس سمجھ رکھا تھا کیا۔۔۔۔۔" سحر کے طیش میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

"رہنے دو سحر۔۔۔۔۔ اچھا ہوا اس نے بتا دیا۔۔۔۔۔ زبردستی ریلیشن رکھ کر کیا فائدہ جب وہ

میرے ساتھ خوش ہی نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔" عارفہ نے بے دلی سے سر جھٹکا۔

"ویسے۔۔۔۔۔ تمہیں کس نے بتایا میرے بریک اپ کا۔۔۔۔۔" عارفہ کو اچانک خیال آیا کہ اس

نے تو نہیں بتایا تھا پھر سحر کو کیسے معلوم ہوا۔

سحر جو غصے میں کھڑی ہو گئی تھی پھر سے اس کے ساتھ آکر بیٹھی۔

"شاویز نے بتایا۔۔۔۔۔ آج گھر پر آیا تھا صائم کے ساتھ۔۔۔۔۔ کل رات بھی وہ اس کے ساتھ ہسپتال میں رہا ہے۔۔۔۔۔" وہ ایک لائن سے سٹوری سنانے لگی تھی۔

"کیا۔۔۔۔۔ ہسپتال میں۔۔۔۔۔ کیا ہوا صائم کو۔۔۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہے۔۔۔۔۔" عارفہ گڑبڑا گئی اور کرسی سے اٹھ کر سحر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"ہاں اب ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔۔۔۔۔" سحر اٹھی اور اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے تسلی دی۔

بدلے میں عارفہ نے اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔۔۔۔۔" وہ سحر پر خفا ہونے لگی۔

"عارفہ۔۔۔۔۔ تم ٹھیک ہونا۔۔۔۔۔" اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے سحر نے نرمی سے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ اسے عارفہ بہت اداس سی لگی تھی۔

لاوا کم نہیں ہو رہا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک کی ہر یاد امڑامڑا کر اس کے دل میں جوش مار رہی تھی۔

"اے اے اے۔۔۔۔۔" دھاڑتے ہوئے اس نے ایک زوردار مقہ دائیں جانب لگے انسان قد آئینہ پر دے مارا۔ اسی طرح دو تین ضرب لگائے اور تیسرے ضرب پر آئینہ اس کے ہتھیلی کو چیرتا ہوا ٹوٹ کر فرش پر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

اس نے کرب سے آنکھیں میچ لی۔

ہتھیلی پر سے خون فوارے کی صورت بہنے لگا۔ بھیگی آنکھیں کھول کر وہ اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔

"ہاں اس کو کٹ ہی جانا چاہیئے۔۔۔۔۔ اس کا سارا خون بہہ جانا چاہیئے۔۔۔۔۔ ہمت کیسے کر

لی۔۔۔ اس نے آج میری ماں کے قاتل سے ہاتھ ملانے کی "سوچتے ہوئے وہ جوان مرد رونے لگا۔

اس کے ہاتھ سے حوض خون کی دھار گر گر کر لکڑی کے فرش کو تر کر رہی تھی۔ اس نے سختی سے مٹھی مینچھ لی اور روتے روتے گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔

آج اپنی ماں کا وہ شاہ سوار کمزور پڑ گیا تھا۔ اس کے زار و قطار آنسو اس کی اسٹائل سے بنائی شیو کو بھگا رہی تھی۔ اس کی اتنے سالوں کی محنت سے بنائی باڈی کانپ رہی تھی۔ گہری آنکھیں لمبی ناک سرخ ہو گئے تھے۔

زر تاج کا بیٹا اس کا دل آ رہا اس کا طاقتور ترین شاویز آج اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ آج زر تاج کا شاہ سوار نہیں اپنی ماں کا 8 سالہ روتا شاویز تھا۔

"نہیں ماں۔۔۔۔۔ اتنا آسان نہیں ہے۔۔۔۔۔ جب تک میری سانس چل رہی ہے۔۔۔۔۔ میں وہ وقت نہیں بھلا سکتا۔۔۔۔۔ اور ہمیں اس وقت میں مبتلا کرنے والے کو میں قطعی معاف نہیں کر سکتا۔" دانت پیستے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی اور اپنی برداشت کے حد تک اندر روکے رکھی۔ جب خارج کی تو وہ گرم سانس اس کے غضب کو کسی حد تک کم

کر چکی تھی۔ وہ اسی طرح مٹھیاں سختی سے مینچھے اٹھا اور گیلے چہرے سے دلاور پرویز خان کی تصویر کو دیکھنے لگا۔

"تمہارا یہ سحر انگیز (جادو انہ) انداز کم از کم مجھے نہیں پگلا سکتا دلاور پرویز خان۔۔۔۔۔" نفرت سے اس تصویر کو دیکھتے ہوئے شاویز پھر اپنی یادوں کی دنیا میں کھو گیا۔ اسے وہ دن وہ راتیں آج بھی اتنے شفاف انداز میں یاد تھیں جیسے کل کی ہی بات ہو۔۔۔

17 ##### سال قبل #####

زرتاج بستر پر پڑی اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اسے سانس لیتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ بار بار کھانستی اپنا سینہ سہلاتی لیکن کچھ بھی کر کے اس کی تکلیف میں کمی نہیں

آ رہی تھی۔ وہ بھیگی آنکھوں سے 8 سالہ شاویز کو دیکھنے لگی۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سانس اٹک جاتی اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر زبیدہ خالہ کو اشارہ کیا۔ زبیدہ خالہ پھرتی سے روتی بلکتی اس کے سرہانے بیٹھی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ش---شا---شاہ---وی---ز" اس نے پھر سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

"تم فکر مت کرو زرتاج--- شاویز اب میری ذمہ داری ہے--- میں اس کا بہت اچھے سے خیال رکھوں گی--- اسے پڑھاؤں گی بڑا آدمی بناؤں گی--- جیسا تو چاہتی ہے--- تیرا بہادر شاہ سوار بناؤں گی---" زبیدہ خالہ روتے ہوئے کپکپاتی آواز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی سمجھا رہی تھی۔

نئے شاویز سے اپنی ماں کی یہ تکلیف برداشت نہیں ہو سکی اور وہاں سے بھاگ گیا۔

تیزی سے بھاگتے ہوئے وہ اپنی مخصوص جگہ پر آگیا۔ اور بڑے درخت کے پیچھے چھپ کر رونے لگا۔ تکلیف اس کی ماں کو تھی لیکن برابر درد وہ اپنے ننھے سینے میں اٹھتا محسوس کر رہا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس کی ماں کے پاس تو زبیدہ خالہ تھی اور یتیم خانے کی باقی عورتیں۔ لیکن اس معصوم بچے کے پاس کوئی نہ تھا اس کے آنسو صاف کرنے اسے جھوٹی ہی صحیح پر تسلی دینے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اکیلا ہی اپنا غم چھپا کر سسک سسک کر روتا رہا۔

شام تک رو رو کر جب وہ نڈھال پڑ گیا تو اسے اپنے بازو پر کسی کی گرفت محسوس ہوئی۔

"کب سے ڈھونڈ رہے ہیں تجھے۔۔۔۔ اور تو یہاں بیٹھا ہے۔۔۔۔ چل جلدی۔۔۔۔ دائی

ماں کب سے بلارہی ہے۔۔۔" وہ 15 سالہ لڑکا ان ہی کے یتیم خانے کا تھا۔ اس نے زبیدہ خالہ

کانام لیتے ہوئے اسے کھیچ کر کھڑا کیا اور اپنے ساتھ گھسٹنے لگا۔

یتیم خانے کے سب بچے زبیدہ خالہ کو دائی ماں کہتے تھے کیونکہ وہ وہاں کی کیئر ٹیکر تھی۔ یتیم خانے کی دیکھ بھال کرتی تھی وہاں آنے والے یتیموں کی جانچ پڑتال دیکھ رکھ سب زبیدہ خالہ کے ذمہ ہوتا تھا۔

ذبیح اللہ کے ہمراہ وہ مایوسی سے لڑکھڑاتا جب یتیم خانے کے اندر داخل ہوا تو سب چہرے اشک بار تھے۔ سب میں ہنگامہ سا برپا تھا۔ زرتاج کی روح پرواز کر چکی تھی۔ وہ اسے تہنا چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اتنا رو کر بھی؛ ننھے سے دل میں اتنی دعائیں کر کے بھی وہ اپنی ماں کو نہیں بچا سکا تھا۔ قدرت نے اس کی ماں کو اس سے الگ کر دیا تھا۔

ذبیح اللہ اسے اس کے کمرے میں لے جانے کے بجائے دائی ماں کے کمرے میں لے جا رہا تھا۔ اس نے چھوٹی سوچی ہوئی آنکھوں سے پلٹ کر اپنے کمرے کے جانب دیکھا تھا لیکن دروازہ اور

کھڑکی بند تھی۔ پردے برابر کئے ہوئے تھے۔ اندر زرتاج کے آخری رسومات چل رہے تھے۔

ڈگمگاتے قدموں سے وہ دائی ماں کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ جواتنے جتن کر کے اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی شاویز کو دیکھ کر پھر سے تڑپ اٹھی اور اسے گلے لگا کر بلند آواز میں آہ وبکا کرنے لگی۔

اس کی ماں کے ساتھ کیا ہوا تھا وہ ننھا دلآرہ سمجھ نہیں پا رہا تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ اس کی ماں کو اس سے الگ کیا جا رہا ہے۔ اسے دور لے جایا جا رہا ہے۔

دائی ماں کے سینے سے لگ کر بھی وہ تسلی نہیں ہو سکا تھا۔ جو سکون اسے اپنے ماں کے گلے لگ کر ملتا تھا وہ جانتا تھا اب وہ سکون اسے پھر کبھی نصیب نہیں ہو گا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو دائی ماں اسے چارپائی پر بیٹھا کراٹھ گئی۔ باہر قاری صاحب انہیں بلا رہے تھے۔

وہ سُن دماغ سے خالی نظروں سے خاموش بیٹھا تھا۔ کان اس کے مسلسل باہر لگے تھے۔ اب قاری صاحب نماز جنازہ ادا کر رہے تھے۔ اب ماحول میں پھر سے آوازیں بلند ہو گئی تھیں۔ اس نے ہمت کر کے اٹھنے کی کوشش کی لرزتے جسم سے اس نے دروازے کا در کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا یتیم خانے کے بڑے لڑکے اور کچھ محلے کے مرد قاری صاحب کے ہمراہ زرتاج کا جنازہ لے جا رہے تھے۔

وہ بھاگ کر ان کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن اچانک ماحول پانی میں تیرتا لگا۔ اس کی آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر آنسو جاری ہو گئے تھے۔ جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ وہ چلا چلا کر زرتاج کو آواز دینا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

وہ وہی دروازے کا در پکڑ کر کانپنے لگا۔

"ماں۔۔۔۔" مرد حضرات نے جب 31 سالہ جوان زرتاج کا جنازہ اٹھائے قدم یتیم خانے کے دہلیز کے پار رکھے تو زیر لب شاویز کی لبوں سے یہ پکار نکلی۔ اس کے آگے کا منظر تاریک ہو گیا وہ بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔

دہلیز سے لگی زرتاج کو دور جاتے دیکھتی دائی ماں کو اچانک شاویز کا خیال آیا تو تیزی سے الٹے قدم بھاگ کر اپنے کمرے کے جانب آئی۔

"یا اللہ خیر۔۔۔" شاویز کو در پر گرا پڑا دیکھ کر وہ دہل گئی اور کانپتے کانپتے ہوئے اسے اٹھا کر جھنجھوڑنے لگی۔ لیکن وہ معصوم جان بے حس و حرکت تھا۔

"ذبیح اللہ۔۔۔۔۔ ہمیمہ۔۔۔۔۔ صفدر۔۔۔۔۔ جلدی آو۔۔۔۔۔" انہوں نے بلند آواز میں واویلا مچا دیا۔ ان کا دل ڈوب گیا تھا۔ ابھی ابھی تو انہوں نے زرتاج کا جنازہ رخصت کیا اور اب

یہ بے حس بچہ۔ اڈھیر عمر دائی ماں کو یہ سب سوچ کر چکر آنے لگے تھے۔ ان کی چیخ و پکار سن کر سب وہاں اکٹھا ہو گئے۔

دائی ماں سے تو اب اپنی حالت سنبھلی نہیں جا رہی تھی۔ وحشت ہی وحشت کا سماء بندھ گیا تھا۔ ہمیشہ نے پھرتی سے آگے آکر دائی ماں کو سنبھالا اور صفدر نے شاویز کو ان کے بازوؤں سے اٹھا کر بستر پر ڈالا جب کہ ذبیح اللہ ڈاکٹر کو بلانے بھاگ گیا تھا۔ گلی کے کلینک والے ڈاکٹر فوراً سے آگئے۔ انہوں نے شاویز کا چیک اپ کیا۔ دائی ماں کو تسلی دی اور دوائیاں لکھوا کر واپس چلا گیا۔

اگلے تین سے چار دن تک ننھا شاویز بخار میں تپتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے ہوش میں آتا لیکن زرتاج کی جگہ دائی ماں کو سامنے دیکھ کر پھر سے بے ہوش ہو جاتا۔ دائی ماں متواتر اس کا بخار کم کرنے ٹھنڈی پٹیاں اس کے پیشانی پر رکھتی رہی تھی۔ وہ راتیں اس نے بہت اذیت ناک

گزاری تھی۔ زرتاج سے جدائی کی وہ راتیں اسے سانپ بچھو کی طرح ڈستی رہتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ خوف و ہراس میں ماں کو پکارتا ٹپ اٹھتا۔

ایک ہفتے تک دوائیوں کے زیر علاج اور دائی ماں کے زیر نگرانی رہ کر وہ پھر سے تندرست تو ہو گیا لیکن پوری طرح خاموش ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں ویرانی چھائی رہتی۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کے وہ پھولے ہوئے گال سکڑ گئے تھے۔ زرتاج کے غم نے اسے کافی کمزور کر دیا تھا۔ دائی ماں زرتاج سے کئے اپنے وعدے کے مطابق شاویز کا بہت خیال رکھتی۔ اسے اپنے ساتھ سلاتی۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی لیکن اس کی تو مانو دنیا ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ صرف تھوڑا سا کھا کر اٹھ جاتا اور اپنے کمرے میں آ کر زرتاج کے تکیے پر سر رکھ کر لیٹا رہتا۔ آنکھیں بند کر کے وہ اس تکیے پر زرتاج کا لمس محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔



ان سب کے چلتے دائی ماں کو پریشانی لاحق ہو گئی تھی کہ شاویز کہی اپنی غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت کھونہ دیں۔ انہوں نے ہمیشہ سے اسے اسکول کی تعلیم اور قاری صاحب سے اسے دینی تعلیم فراہم کرنے لگا دیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ صدمے سے باہر آنے لگا۔ اور اپنے تعلیمی نظام پر دھیان دینے لگا۔

اسے معمول کی زندگی میں لوٹتے ہوئے ایک سال لگ گیا۔

ایک دن دائی ماں اس کے کمرے کو صاف کروا رہی تھی۔ اب وہ کمرہ ہمیشہ کو دیا جانا تھا۔ شاویز خاموشی سے دائی ماں کو زرتاج کی چیزیں کمرے سے نکالتے دیکھ رہا تھا جب اسے الماری میں

بہت سے غیر ارسال شدہ خطوط ملے اور ساتھ میں کچھ تصاویر ملی۔ اس نے آگے بڑھ کر وہ خطوط اور تصویریں اٹھائی۔

ان تین تصویروں میں ایک اس کی اور زرتاج کی تھی۔ اور دو یتیم خانے کی گروپ فوٹوز تھیں جن میں ٹین اتج زرتاج اور جوان زبیدہ خالہ کو وہ پہچان گیا تھا۔ ان کے ساتھ موجود باقیوں کو وہ نہیں جانتا تھا نہ اس وقت وہ یتیم خانے میں موجود تھے۔

تصویریں دیکھ کر شاویز نے اپنے گھٹنے کے نیچے چھپادی اور اب وہ ان خطوط کو دیکھ رہا تھا۔ ان پر کوئی ایڈریس درج نہیں تھا صرف ایک نام درج تھا دلاور پرویز خان۔ اس کے 9 سالہ دماغ میں کچھ کھٹکا۔ اسے یہ نام شناسا لگا۔ اس نے گہری آنکھیں چھوٹی کر کے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخر وہ اس نام سے کیسے واقف ہے۔ ایک جھٹکے سے اس کے تنے آبرو

پھیل گئے آنکھیں بڑی ہو گئی۔ یہ نام وہ 5 سال پہلے اپنی روتی ہوئی ماں کے زبان سے سن چکا تھا جس کے بارے میں پوچھنے پر پہلی بار زرتاج نے اسے ڈانٹا تھا۔

آخر کون ہے یہ دلاور پرویز خان۔ کیوں اس کا نام بار بار اس کے اور اس کی ماں کی زندگی میں آجاتا ہے؛ سوچتے ہوئے اس نے ایک خط کھولا۔ وہ ابھی تک اتنا پڑھ لکھ نہیں گیا تھا کہ جلدی جلدی کچھ پڑھ سکے۔ ابھی وہ پہلے ہی لائن کی تھک کر رہا تھا کہ دائی ماں کی اس پر نظر پڑی اور فوراً سے اس کے ہاتھ سے خطوط لپک لئے۔

"دائی ماں۔۔۔۔" اس نے بے رخی سے انہیں پکارا۔

زبیدہ خالہ نے وہ خطوط اپنے بغل میں چھپا دیے اور اسے ڈانٹنے لگی۔

"دائی ماں خط واپس کریں۔۔۔" شاویز اسی جگہ بیٹھا ان سے اپنا مطالبہ کر رہا تھا۔ خط چھین جانے کے بعد اسے ڈر تھا کہ اگر دائی ماں نے وہ تصویریں دیکھ لی تو وہ بھی اس سے چھپٹ لیں گی۔

"چپ چاپ باہر جا کر اپنا سبق پڑھو۔۔۔۔۔ میرا دماغ خراب مت کرو۔۔۔۔۔ بہت کام ہے مجھے۔۔۔۔۔" دائی ماں نے خطوط واپس کرنے کے بجائے اسے سختی سے ڈانٹ دیا۔ وہ منہ بھسورتا ہوا احتیاط سے اٹھا۔ دائی ماں کی اس طرف پشت تھی وہ تصویریں کمر کی جانب پکڑے ان سے چپے چپاتے کمرے سے نکل گیا۔

بھاگتا ہوا وہ یتیم خانے سے نکل کر اس درخت کے پاس آیا۔ آج اسے ایک مرتبہ پھر زرتاج کی شدت سے یاد آرہی تھی۔ آج پھر شاویز کو اس کی ماں کی شدت سے کمی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی اور مسکراتی زرتاج کی چند سال پہلے لی گئی اس تصویر کو چھوٹے ہاتھوں میں پکڑے بے آواز آنسو بہانے لگا۔ ٹپ ٹپ گرتے اس کے آنسو تصویر کو تر کر رہی تھی۔ اسی اثناء میں محلے کا ایک لڑکا آیا اور بھاگتے ہوئے اس کے ہاتھ سے وہ تصویر جھڑپ لی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ وہ لڑکا کچھ فاصلے پر رک کر تصویر اس کے آگے جھلاتے ہوئے اسے تنگ کرنے لگا۔ اس کے کچھ اور ساتھی بھی اس مذاق میں اس کا ساتھ دیتے ہوئے شاویز پر ہنس رہے تھے۔

"تصویر واپس کرو۔۔۔" شاویز نے اپنے رخسار صاف کرتے ہوئے پیار سے اسے پیشکش کی۔
وہ لڑکے اسی طرح اس پر ہنستے رہے۔

"دیکھ کیا رہا ہے۔۔۔ پھار دے۔۔۔" ان میں سے ایک نے تصویر پکڑے لڑکے کو صدا لگائی۔

اس نے بھی استخزیہ ہنستے ہوئے دونوں ہاتھوں میں تصویر بیچ میں سے پکڑی اور ہلکی سی مڑوڑی ہی تھی کہ شاویز بھاگتا ہوا اس پر جھڑپ پڑا اور ننھے ہاتھوں کی مٹھیاں بنا کر اس لڑکے کو مقے اور ضربیں مارنے لگا۔ اس کی ہاتھ سے تصویر چھوٹ گئی۔ شاویز فوراً اس پر لپکا اور تصویر اٹھا کر اپنے قمیض کے جیب میں ڈالی۔ طیش سے اس لڑکے کو گھورتے ہوئے وہ جانے لگا کہ اس لڑکے نے اس کے گردن کو بازو میں دبوچ لیا۔ شاویز نے اپنی پوری قوت سے دانت اس کے بازو میں گاڑھے تو وہ درد سے کراہ اٹھا۔ اس نے شاویز کی گردن چھوڑ دی لیکن شاویز اسی طرح دانت

گڑھے ہوئے تھا۔ اس پر ہنسنے والوں کی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہو سکی تھی لیکن ان میں سے ایک یتیم خانے کی سمت بھاگا۔

دائی ماں زرتاج کا کمر صاف کروا کر اب اپنے کمرے میں عصر کی نماز ادا کر کے اٹھی ہی تھی کہ اس لڑکے نے ان کے پاس آکر شادویز کے لڑائی کی اطلاع دی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھتی اسی طرح نماز کی چادر اوڑھے ہوئے باہر کی جانب بڑھ گئی۔

تیزی سے آگے آکر انہوں نے اس لڑکے کا ہاتھ شادیز کے دانتوں سے آزاد کروایا اور مضبوطی سے اسے گھسٹنے لگی۔

"ہااہہہہ۔۔۔۔۔" وہ شاہ سوار بھوکے شیر کی مانند غرایا تھا۔ اپنی ساری طاقت لگا کر وہ اس لڑکے کو کھا جانے والے انداز میں دیکھ کر دھاڑ رہا تھا۔

وہ جو ایک سال سے اپنے جذبات اپنے آنسو اپنے خواہشات دبائے ہوئے تھا۔ اپنے دل پر پتھر رکھے ہوئے تھا؛ سب تحلیل ہو چکا تھا۔ اس کا سارا غصہ اتنے سالوں بعد دلاور پرویز خان کا نام دیکھ کر اپنے ماں کے آنسو یاد کر کے پھٹ پڑا تھا۔ جس کا شکار اس وقت وہ لڑکا ہو چلا تھا۔

شاوہیز کا یہ جنون دیکھ کر دائی ماں شدید تشویش میں پڑ گئی تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ آگے جا کر اس کے بڑھتے جنون کو کیسے قابو کر پائے گی۔

اپنے کمرے میں لا کر دائی ماں متفکر انداز میں اسے سمجھانے لگی۔

"شواہد۔۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔۔ تم بہت بہادر ہو۔۔۔۔ آخر تم۔۔۔۔ زر تاج کے بیٹے ہو۔۔۔۔" دائی ماں شاید اس کے پاپا کا نام لینے لگی تھی لیکن پھر چپ ہو کر بات بدل دی اور زر تاج کا نام لیا۔

"پر تمہیں اپنی یہ صلاحیت بے کار کے لڑائی جھگڑوں میں خرچ نہیں کرنا۔۔۔۔۔ تمہیں ابھی اچھا انسان بننا ہے۔۔۔۔۔ بڑا آدمی بننا ہے۔۔۔۔۔ اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔۔۔۔۔ زندگی کی

حقیقت کو تسلیم کرو۔۔۔۔۔ خود کو مضبوط عصاب بناو۔۔۔۔۔ زرتاج کا شاہسوار بناو۔۔۔۔۔"

وہ اڈھیر عمر خاتون نرمی سے اس کی سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ اسے اس کا موقف یاد کروا رہی تھی۔ وہ اسے اس کی ماں کا خواب؛ اس کی خواہش یاد کروا رہی تھی۔

وہ غصے سے سرخ پڑتی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ دل میں اچانک ایک جوش و جذبہ پیدا ہوا اور اس نے سر اثابت میں ہلا کر دائی ماں کو یقین دہانی کروائی۔



10 سال کی عمر تک اس کا اسکول مدرسہ کھیل کا میدان سب کچھ یتیم خانے کے اندر ہی تھا۔ وہ دن میں ہمیشہ آپنی سے اسکول کی کتابیں پڑھتا۔ دوپہر کو قاری صاحب سے دینی تعلیم حاصل کرتا۔ اس نے اب پڑھائی پر پورا دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔ ہمیشہ کو وہ زبردستی زیادہ سبق

پڑھانے پر مجبور کرتا۔ ایک سال میں دو کلاس کا سلیبس یاد کر لیتا ویسے ہی مدرسہ میں بھی وہ اب باقاعدہ سے قاری صاحب کے ساتھ باجماعت نمازیں ادا کرتا۔

وہ پہلی مرتبہ 11 سال کے عمر میں دنیا کے رش سے روشناس ہوا تھا۔ اسے ہجوم میں جانے سے خوف آتا۔ لیکن اب وہ اپنی ذمہ داری خود اٹھانے کا پابند تھا۔

دائی ماں کے یتیم خانے کا جتنا بجٹ تھا وہ اس کے بڑے آدمی بننے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے محنت کے ساتھ ساتھ مزدوری کرنے کی طرف رجوع کیا۔

وہ جو کہتے ہیں مجبوری انسان کو وقت سے پہلے بڑا کر دیتی ہیں؛ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اسے بھی اپنے لیے کمانے کی مجبوری نے وقت سے پہلے بڑا اور ذمہ دار بنا دیا تھا۔

وہ یتیم خانے کے قریب مین روڈ پر ایک چھوٹے ہوٹل میں ملازمت کرنے لگا۔

شروع شروع میں شاویز کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس سے کام نہیں کیا جاتا۔ برتن اس کے ہاتھوں سے پھسل کر ٹوٹ جاتے کبھی کپ میں چائے ڈالتے وقت اپنا ہاتھ جلا دیتا کبھی میزوں کی ٹھیک سے صفائی نہیں ہو پاتی تھی جس کے چلتے وہ ہر دوسرے دن ہوٹل کے مالک سے ڈانٹ کھاتا رہتا۔

8 سال تک اس کی ماں نے اور پھر 3 سال سے دائی ماں نے اسے بہت لاڈ پیار سے پالا تھا۔ کبھی دنیا کی بھیڑ میں ایسے بھی نکلنا ہو گا اس نے سوچا نہ تھا۔ وہ بہت نرم دل بچہ تھا کوئی اگر بلند آواز میں بات بھی کرتا تو وہ سہم جاتا۔ لیکن قدرت کے کھیل نے اسے سخت بنا دیا تھا۔ لیکن وہ جتنا بھی سخت بننا پر دل تو اس کا زرتاج جیسا تھا۔ رات کی تنہائی میں وہ اکثر اپنی ماں کو یاد کر کے بہت روتا تھا۔ مگر روتے روتے بھی وہ اپنے آپ سے یہی عزم دوہراتا کہ اسے شاہ سوار بننا ہے۔ اسے مضبوط بننا ہے۔ اسے ہر مشکل کا ڈٹ کر سامنا کرنا ہے۔ اسے ہر مصیبت سے لڑنا ہے۔ اور ان سب سے اہم عزم تھا کہ اپنی ماں کے گنہگار کو نہیں بخشنا۔ وہ جہاں بھی ہے اسے ڈھونڈ کر سزا دینی ہے۔



دو سال تک وہ دل لگا کر کام کرنے لگا رہا۔ اب تو وہ اتنا سیکھ چکا تھا کہ صرف ہوٹل کے مالک کے اشارے پر ہی وہ سمجھ جاتا کہ اسے کس کام کا بولا جا رہا ہے۔

وہ مالک تو کافی پہلے ہی اسے ملازمت سے نکال دیتا اگر اس آدمی کو زبیدہ خالہ کا لحاظ نہ ہوتا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ ہر کام بہت مہارت سے سیکھ گیا تھا۔ اب تو وہ 3 ملازموں کے برابر کام اکیلے کر لیا کرتا تھا۔

صبح سویرے مالک کے ہوٹل آنے تک وہ ہوٹل کھول کر ساری چارپائی اور میزیں قطار سے لگا دیا کرتا۔ پورے ہوٹل کا جھاڑو پونچھا کر دیا کرتا۔ بازار سے مالک کی دی ہوئی لسٹ کا سامان بمہ حساب کی رسید مالک کے ٹیبل پر رکھی ہوتی۔ سب برتن دھو کر سکھانے کے لیے رکھے ہوتے

یہاں تک کہ چائے کے لیے پانی بھی چڑھایا ہوتا۔ ہوٹل کے مالک اس سے کافی متاثر ہو گئے تھے۔

اس نے زندگی کو اسی معمول پر جینا سیکھ لیا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا جب تک وہ انٹر میڈیٹ کے امتحانات پاس نہیں کر لیتا وہ یہی ملازمت کرے گا اور ابھی تو اس کے 12 جماعتیں پوری ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔

وہ صبح فجر کے وقت اٹھ جاتا۔ پہلے جا کر ہوٹل کی صاف صفائی کر لیتا پھر واپس آ کر دن کے 12 بجے تک سکول کا پڑھتا۔ عمر کے لحاظ سے تو اسے چھٹی جماعت کا طالب علم ہونا چاہیے تھا لیکن وہ 13 سال کی عمر میں نویں جماعت کا گھریلو طالب علم بن گیا تھا۔

ظہر کی نماز قاری صاحب کے ساتھ پڑھ کر وہ عصر تک قرآن مجید کا درس یاد کرتا اور عصر کی نماز کے بعد وہ واپس ہوٹل چلا جاتا اور رات 11 بجے تک وہی رہتا۔

کھیل کود، لڑکوں کے ساتھ ہنسی مذاق، دوستیاں بنانا یہ سب تو اس کی زندگی کے فہرست میں شامل تھی ہی نہیں۔

اسے بس جلد از جلد تعلیم مکمل کر کے کسی نوکری کی تلاش کرنی تھی بڑا آدمی بننا تھا دائی ماں کے یتیم خانے کی کفالت اٹھانی تھی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی شاویز کی آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ ابھی تو اور سخت ترین اور اذیت ناک ہونی تھی۔

وہ سرما کے موسم کا آغاز تھا۔ کراچی میں بھی ان دنوں صبح سویرے کافی ٹھنڈ محسوس ہوتی۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ جیسے ہر جگہ اتوار کو اسکول اور مدارس کی چھٹی ہوتی ویسے ہی وہ بھی اتوار کو پڑھائی سے چھٹی لیا کرتا اور پورا دن ہوٹل میں اپنی خدمات سرانجام دیتا۔

اس وقت بھی وہ اپنے کام میں لگا تھا جب وہ ان سے ملا۔ وہ شخص جس نے اس کی قسمت پلٹنی تھی جس نے شاویز کو اس کے اصل سے متعارف کروانا تھا۔ جس سے مل کر اس کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔



ان دنوں ہوٹل میں کافی رش لگا رہتا۔ ٹھنڈے علاقہ جات سے لوگ سیر و تفریح کرنے کراچی کے خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہونے آیا کرتے تھے۔

سیاحوں کی بڑھتی تعداد کے چلتے جیب کترے اور لوٹیرے بھی سیاحتی جگہوں کا رخ کیا کرتے۔

وہ حسب معمول ہوٹل میں اپنا کام کر رہا تھا کہ ایک ٹین اتیج جیب کترے نے ایک صاحب کا بٹوہ اچک لیا۔ اس سے پہلے کہ ان صاحب کو خبر ہوتی وہ تیز رفتار سے بھاگنے لگا۔ وہ صاحب اٹھ

کر اس لڑکے کے پیچے جانے لگے تھے کہ انہوں نے دیکھا ایک 14 سالہ لڑکے نے اسے لپک لیا اور پھرتی سے اس کا ہاتھ مڑوڑ کر بٹوہ اس کے ہاتھ میں سے چھین لیا۔ وہ صاحب اپنی جگہ کھڑے اس بچے کی دلیری دیکھتے رہے۔ ان کے باقی دو ساتھی بھی ساتھ میں کھڑے ہو گئے تھے۔

شاویز نے بٹوہ سمیت اس لڑکے کو بھی کھینچ کر ان صاحب کے روبہ رو کھڑا کیا۔

وہ 35 سے 37 سالہ لمبا چوڑا تو انا مرد آبرو اٹھائے ہوئے اس بچے کو دیکھ رہے تھے جو اس سرد ہواؤں میں جہاں بڑے بڑوں نے گرم کپڑے زیب تن کئے تھے؛ صرف ایک ہلکے قمیض میں ملبوس تھا۔

اس بچے کے ہاتھ سے بٹوہ لے کر انہوں نے سو روپے کا نوٹ نکال کر جیب کترے کو دیا اور تند آواز میں دفع ہو جانے کا کہا۔ وہ جان بچاتے گھبراتے ہوئے تیزی سے وہاں سے رنچکر ہو گیا۔

شاویز ان صاحب کے بارعب آنکھوں میں اپنے مقناطیسی کشش کی آنکھیں ڈالے دیکھ رہا تھا۔
 صادق صاحب واپس چارپائی پر بیٹھے ان کے ساتھ ساتھ باقی ساتھی بھی تشریف فرما ہو گئے۔
 صادق صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے شاویز کو قریب بلایا۔ وہ قریب گیا تو انہوں نے اس
 کی ایمانداری پر انعام دینے کے لیے کچھ رقم آگے کئے جو شاویز نے لینے سے منع کر دیا۔

"نہیں سر۔۔ میں کسی کی مدد کرنے کے پیسے نہیں لیتا۔۔" 14 سالہ شاویز نے با اعتماد لہجے
 میں کہا۔

"بہت ایمان دار ہو۔۔ کیا کرتے ہو۔۔" صادق صاحب نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

"یہاں ملازمت کرتا ہوں۔۔" جواب اب بھی اسی دلیری سے آیا تھا۔ حلال کمانے میں
 شرم کیسی پھر چاہے وہ مزدوری کا کام ہی کیوں نہ ہو۔

"پڑھتے ہو۔۔" ایک اور ساتھی نہیں سوال کیا۔

"کہاں رہتے ہو۔۔۔۔" اب صرف صادق صاحب ہی اس سے مہو گفتگو تھے باقی دونوں اپنے کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔

"یتیم خانے میں۔۔۔" اس نے نرمی سے مسکرا کر جواب دیا۔

"آگے کا سوچا ہے۔۔۔ کیا بننا چاہتے ہو۔۔۔" اس کے یتیم ہونے کا جان کر صادق صاحب کو اس سے بہت ہمدردی ہوئی۔

"شاہ سوار بننا چاہتا ہوں۔۔۔ بہت بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔۔۔" شاویز نے معصومیت سے کہا۔

اس کے زبان سے یہ الفاظ سن کر؛ اس کی اتنی بڑی خواہشات جان کر باقی دونوں ساتھی پھر سے اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

"تم جانتے بھی ہو۔۔۔ شاہ سوار کون ہوتے ہیں۔۔۔" صادق صاحب نے اس کی معصومیت پر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ وہ بہت مضبوط اور طاقتور ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔۔۔۔۔ ہر مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ جنگجو ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ حق کے لیے لڑتے ہیں۔۔۔۔۔ برائی کو روکتے ہیں۔۔۔۔۔" اس نے جوش و خروش سے بلند لہجے میں کہا۔

صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کس نے سیکھائی ہے یہ باتیں۔۔۔۔۔" اس کی ذہانت پر صادق صاحب کافی متعجب ہو گئے تھے۔

"میری ماں نے۔۔۔۔۔" شاویز نے مسکرا کر دیکھا۔

"پر ابھی تو تم نے کہا۔۔۔۔۔ تم یتیم خانے میں رہتے ہو۔۔۔۔۔" انہوں نے قدرے تیز لہجے میں اس کی غلط بیانی کو ٹوکا۔

"میری ماں پانچ سال پہلے فوت ہوئی ہے۔۔۔۔۔ اس سے پہلے میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔" اس کے آبرو تن گئے تھے لیکن ان کی غلط فہمی کو نرمی سے دور کیا۔

صادق صاحب کے تنے آبرو ڈھیلے پڑ گئے۔

"ہمممم۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ محنت کرو۔۔۔۔۔ انشاء اللہ ایک دن اپنی منزل کو پہنچ جاو گے۔"

انہوں نے اس بچے سے مزید مباحثہ نہ کرنے کی نیت سے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا اور رخ پھیر کر چائے پینے لگے جو اس سے باتوں کے چکر میں ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

شاویز بھی ہوٹل کے اندر آ کر اپنے کام میں جٹ گیا۔



چائے اور پراٹھے ختم کرنے کے بعد صادق صاحب اٹھے اور ہوٹل کے اندر آ کر نظر گردانی کی۔

"یہاں ہاتھ دھونے کے لیے جگہ ہے۔" انہوں نے بلند آواز میں کہا تو شاویز بھاگتا ہوا ان کے پاس آیا اور انہیں ہوٹل کے بائیں دیوار کے ساتھ بنی سینک کے پاس لے آیا۔ انہیں ایک منٹ کا کہتا وہ واپس کچن کے اندر بھاگا اور جگ میں گرم پانی لے آیا۔ اس کا انتظار کرنے کے بجائے صادق صاحب واپس مڑے اور فریزر سے ٹھنڈے پانی کا بوتل نکالا۔

"میں گرم پانی لے آیا۔۔۔۔۔ وہ تو فریج کی بوتل ہے۔۔۔" اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا جگ ان کے آگے کیا لیکن اس سے پہلے ہی صادق صاحب ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھونے لگ گئے تھے۔

"فوجی ٹھنڈا پانی استعمال کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اس سے ان کی چمڑی سخت رہتی ہے۔۔۔۔۔" وہ منہ اور ہاتھوں سے پانی جھاڑتے ہوئے اب سامنے لگے ٹوٹے آئینہ میں اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوار رہے تھے۔

شاویز کی تو آنکھیں چمک اٹھی تھی۔ اس نے فوجیوں کے بارے میں کتابوں میں تو پڑھ رکھا تھا لیکن کبھی کسی فوجی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔

"آپ فوجی ہے۔۔۔۔۔ بارڈر پر جنگ لڑتے ہے۔۔۔۔۔" اس نے چمکتے ہوئے کہا۔ گہری آنکھیں بڑی کر کے وہ مسلسل صادق صاحب کا سراپا دیکھ رہا تھا۔ ان کا قد کاٹ چوڑا سینہ اور مضبوط بازو دیکھ کر اسے تصدیق بھی ہو گئی کہ ایسا سراپا کسی فوجی کا ہی ہو سکتا ہے۔

"صرف بارڈر پر جنگ لڑنے والے کو فوجی نہیں کہتے۔۔۔۔۔ فوجیوں کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ میں بیس (base) کے اندر والا فوجی ہوں۔۔۔۔۔ نئے جوانوں کو ٹریننگ سکھاتا ہوں۔۔۔۔۔" انہوں نے استخزیہ مسکرا کر کہا۔

وہ اب واپس ہوٹل سے نکل رہے تھے۔ شاویز ان کی رفتار سے قدم ملانے بھاگنے لگا۔

"کسی ٹریننگ۔۔۔۔" اس نے تیز سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ اچانک ہی اسے فوجی ٹریننگ کے بارے میں جاننے کا تجسس ہوا۔

صادق صاحب نے اس کی معصوم فرمائش پر کچھ تفصیلات بتانی شروع کی۔

"لڑنے کے طریقے۔۔۔۔ مشکل حالات میں رہنے طریقے۔۔۔۔ کوئی حملہ کر دے تو اپنا دفاع کرنے کے طریقے۔۔۔۔ وطن کی حفاظت اور عوام کی حفاظت کے طریقے۔۔۔۔ دشمن کو مار گرانے کے طریقے۔۔۔۔ اور بھی بہت کچھ۔۔۔۔ ایک طرح کے شاہ سوار ہی ہوتے ہیں فوجی۔۔۔۔" وہ چلتے چلتے اسے بتاتے گئے۔ ان کے دوست گاڑی میں بیٹھے ان کے منتظر تھے۔

شاویز چلتے چلتے رک گیا۔ اس کے اندر بہت سے جذبات اٹھنے لگے۔ اس نے بھاگ کر منظبو طی سے صادق صاحب کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"مجھے بھی فوجی ٹریننگ سیکھنی ہے۔۔۔۔" اس نے دلی جستجو ظاہر کی۔

"اتنا آسان نہیں ہے۔۔۔۔۔ بہت تکلیف دہ مراحل طے کرنے ہونے ہیں۔۔۔۔۔ ایسے ہی کوئی نہیں بن جاتا فوجی۔۔۔" انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے اسے سمجھانا چاہا۔ وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر جانے لگے۔

"کیا اس سے زیادہ مشکل ہے۔۔۔" وہ بلند آواز میں کہتا ہوا بھاگ کر ہوٹل کے اندر گیا۔ صادق صاحب اس کی آواز پر پلٹ کر اسے گھورنے لگے۔ اس نے ایک ٹپ میں سے؛ جو بر فیلے پانی سے بھرا ہوا تھا جس میں کولڈرنک ٹھنڈا کرنے رکھی جاتی تھی؛ جگ بھرا اور ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بر فیلے پانی سے بھرا ہوا جگ اپنے اوپر انڈیل دیا۔

صادق صاحب کے تنے آبرو پھیل گئے۔ وہ شاکی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ ان کے پیچے گاڑی میں سوار ان کے ساتھیوں کے بھی منہ کھل گئے۔

وہ جنونی نظروں سے انہیں دیکھتا ہوا تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ پتلے سے قمیض میں سر سے پاؤں تک بر فیلے پانی سے بھیگ کر بھی وہ برابر بھی نہیں لرزاتا تھا۔ صادق صاحب سپاٹ تاثرات بنائے اس کے قریب آئے اور قدرے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بہت جنون ہے تم میں ہاں۔۔۔۔۔ ایک دن یہ آگ یا تو تمہیں جلادے گی۔۔۔۔۔ یا کسی اور کو راکھ کر دے گی۔۔۔۔۔" صادق صاحب نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"جل تو میں اسی دن گیا تھا۔۔۔۔۔ جس دن میری ماں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔۔۔۔۔ اب تو راکھ کرنے کی باری ہے۔۔۔۔۔" اس نے دانت پر دانت جمائے ہوئے جواب دیا۔

"آپ اپنا بتائے۔۔۔۔۔ مجھے ٹریننگ سیکھائے گے یا نہیں۔۔۔۔۔" اس نے جیسے اپنا حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ فوجی ٹریننگ تو اسے لازمی سیکھنی ہے پھر صادق صاحب سیکھائے یا کوئی اور۔

"پر میں یہاں نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ میری ڈیوٹی بلوچستان میں ہے۔۔۔۔۔ یہاں تو میں چھٹیاں منانے آیا ہوں۔۔۔۔۔" صادق صاحب اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ سامنے پڑے چار پائی پر بیٹھا دیا۔

"میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور وہاں بھی اپنا خرچہ خود کروں گا۔۔۔۔۔" ایسی ہی محنت مزدوری کر کے کماؤں گا۔۔۔۔۔ "شاویز نے انہیں اپنی کفالت خود اٹھانے کی یقین دہانی کروانی چاہی۔

اس کی معصومانہ انداز پر صادق صاحب سر جھٹکتے ہوئے مسکرائے۔

"ایک دفعہ کوئی base میں داخل ہو گیا پھر باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ یہ وہاں کا قانون ہے۔۔۔۔۔ وہاں آئے ہر سٹوڈنٹ کو خرچہ گھر والے بھیجتے ہے۔" انہوں نے نرمی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

شاویز کا دل اچانک بجھ گیا تھا۔ اسے تو پیسے بھینچنے والا کوئی نہیں تھا۔ مطلب وہ ٹریننگ نہیں سیکھ سکتا؛ سوچتے ہوئے وہ مایوس ہو گیا۔ چہرے پر بے بسی در آئی۔

صادق صاحب اس کی کیفیت سمجھ گئے۔ وہ شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے سامنے دیکھنے لگے۔

"چلو مان لو۔۔۔۔ میں تمہیں فی سبیل اللہ۔۔۔ فری میں ٹریننگ کرا دوں۔۔۔۔ تو مجھے کیا ملے گا۔۔" انہوں نے ہاتھ آپس میں مسلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"تو۔۔۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔۔۔ جب میں بڑا آدمی بن جاؤں گا۔۔۔۔"

میرے پاس پیسے آجائے گے۔۔۔ میں آپ کا سارا قرضہ واپس کر دوں گا۔" اس نے پر امید انداز میں کہا۔

"ہمممم۔۔۔ اور اس کے علاوہ۔۔۔" صادق صاحب اس لالچ سے خاص متاثر نہیں ہوئے تھے۔ اس ذہین بچے سے انہیں کسی اور جواب کی توقع تھی۔

شاویز اب کی بار کچھ متذبذب ہوا اور سوچنے کے انداز میں آنکھیں چھوٹی کی۔

"اور میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں۔۔۔ کہ میں بڑا ہو کر اچھا سپاہی بن کر وطن کی حفاظت کروں گا۔۔۔ اپنی ساری صلاحیت اور ذہانت صرف ملک کے فلاح و بہبود پر لگا دوں گا۔۔۔" اس نے پورے جوش و جذبہ سے جواب دیا۔

صادق صاحب اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر آبرو اچکا کر مسکرائے۔ صادق صاحب ایماندار فوجی تھے وطن کے خدمت کے علاوہ انہیں کوئی اور کام خاص متاثر نہیں کیا کرتا

"لیکن اس سے تمہاری پڑھائی متاثر ہو جائے گی۔۔۔" انہوں نے متفکر انداز میں کہا

"ہمممم۔۔۔۔۔ جیسے آپ فی سبیل اللہ ٹریننگ سکھائے گے۔۔۔۔۔ ویسے ہی۔۔۔۔۔ کوئی اور اللہ والا۔۔۔۔۔ فی سبیل اللہ پڑھا بھی دے گا۔۔۔" اس میں ایک نئی امنگ جاگ اٹھی تھی۔

اپنی زندگی کا اصل مقصد معلوم ہو چلا تھا۔ اب وہ کسی بھی وجہ سے اپنے منزل سے پھر نہیں سکتا تھا۔

صادق صاحب نے اس کی جذبہ پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"متمم مجھے تھوڑا سوچنے دو" وہ سوچنے کے انداز میں آنکھیں گھمانے لگے جیسے دماغ میں ان سب کی پلاننگ کر رہے ہو۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے شاویز کو دیکھا وہ چمکتی آنکھوں میں امید کی کرن لیے ان ہی کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے گود لینا پڑے گا کیا۔۔۔" انہوں نے پریشانی کے عالم میں اس سے سوال کیا۔

"کیوں۔۔۔ گود لینے سے کیا ہو جائے گا۔۔۔" شاویز پلکیں جھپکا کر مسرور ہونے لگا۔

"صادق سر۔۔۔۔۔ آپ آئے گے نا۔۔۔۔۔" اس نے افسردگی سے اپنے دل میں اٹھتا اندیشہ ظاہر کیا۔ وہ بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔ جاتے جاتے وہ پلٹے اور اس کے سامنے جھک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دباؤ دیا۔

"تمہیں ایک فوجی کے وعدے پر یقین ہونا چاہیے۔۔۔۔۔" انہوں نے رعب و دبدبہ اور ہمدردی کے ملے جلے تاثرات سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"مجھے یقین ہے۔۔۔۔۔" اس نے نرمی سے ان کا ہاتھ اپنے چھوٹے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"شام کو آؤں گا۔" سیدھے ہو کر انہوں نے اپنی کار کی جانب جاتے ہوئے کہا۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا اور خوش ہو کر ہوٹل کے اندر بھاگ گیا۔



وہ مالک سے جلدی چھٹی لے کر یتیم خانے واپس آگیا تھا۔ دائی ماں نے اس کے بھگے کپڑے دیکھے تو اس کا کان پکڑ لیا۔

"ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ شاویز۔۔۔ زور کپڑے گیلے کر کے آجاتا ہے۔۔۔۔۔ کتنی دفعہ

سمجھاؤں۔۔۔ میرے ہاتھوں میں اب اتنا دم نہیں ہے کہ تیرے کپڑے دھوتی

پھروں۔۔۔۔۔ کب عقل آئے گی تمہیں۔۔۔" دائی ماں کان سے پکڑے ہوئے اسے کمرے میں لے جا رہی تھی اور وہ سی سی کرتا ان کے ساتھ چلنے لگا۔

"دائی ماں۔۔۔۔۔ چھوڑیں۔۔۔ درد ہو رہا ہے۔۔۔" اس نے ان کی گرفت سے اپنا کان

آزاد کروانا چاہا لیکن وہ کمرے میں لا کر ہی اس کا کان چھوڑنے پر راضی ہوئی۔

"بس کچھ دنوں کی بات ہے دائی ماں۔۔۔۔۔ پھر آپ کو یہ شکایت نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ میں

یہاں سے چلا جاؤں گا۔۔۔ تب آپ کو میرے یہ سب کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے

گی۔ "اس نے کان سہلاتے ہوئے جعلی خفگی سے کہا۔ جانے کی بات سن کر دائی ماں متفکر ہو گئی۔

"بے شرم۔۔۔ دائی ماں کی ڈانٹ کو دل پر لے لیا کیا۔۔۔ جانے کی بات کرتا ہے۔۔۔۔۔
کہیں نہیں جائے گا تو۔۔۔ سمجھ آئی۔۔۔" انہوں نے افسردہ انداز میں اسے جھڑک دیا۔
اس کی جانے کی بات پر ان کا دل دکھ گیا تھا۔

شاویران کی والہانہ محبت دیکھ کر کسمسا گیا اور ان کے کمر کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے انہیں خود سے لگایا۔

اس کے سر پر پیار دے کر دائی ماں نے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا۔

"کل کو بیمار ہو گا۔۔۔ تو سب سے زیادہ تکلیف مجھے ہی ہو گی نا۔۔۔۔۔ اس لیے ڈانٹتی ہوں
پگلے۔۔۔۔۔ جا اب جا کر خشک کپڑے پہن۔۔۔۔۔ سردی لگ جائے گی۔" دائی ماں نے اس کی
بلائیں لیتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا۔ وہ چہکتا ہوا الماری کے جانب بڑھ گیا۔

الماری میں اپنے کپڑوں کے بیچ اس نے وہ تصویریں سنبھال رکھی تھیں۔ اس نے چپکے سے اپنی اور زرتاج کی تصویر اٹھا کر چمکتی آنکھوں سے اپنی ماں کو دیکھا۔

"ماں۔۔۔۔ میں اب فوجی ٹریننگ سیکھوں گا۔۔۔۔۔ اصلی کا بہادر شاہ سوار بنوں گا۔" اس نے کھللاتے ہوئے ہونٹوں کے آگے ہاتھ کا پیالہ بنا کر سرگوشی میں کہا۔ فلحال وہ دائی ماں کو خبر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے صادق سر کے آنے کا بے صبری سے انتظار تھا۔ تصویر واپس چپا کر اس نے خشک کپڑے اٹھا اور چینج کرنے چلا گیا۔



وعدے کے مطابق صادق سرشام کے وقت آگئے تھے۔ سفید قمیض شلوار پہنے آستین کہینوں تک موڑے بال اور ہلکی داڑھی موجھ نفاست سے بنائے وہ اس وقت شاویز کو اس کی زندگی کا فرشتہ نما لگ رہے تھے۔

دائی ماں نے انہیں بیٹھک میں صوفے پر بیٹھایا۔ ان کی خاطر داری کرنے ہمیمہ کو چائے کا انتظام کرنے کا کہا۔ خود وہ ان کے ساتھ بیٹھی گفتگو کرتی رہی۔ شاویز دروازے سے لگا چپ چپکے بار بار اندر جھانک رہا تھا۔ اسے تجسس تھا کہ وہ جلدی سے دائی ماں سے اسے لے جانے کی بات کریں۔

اپنا تعارف کروانے کے بعد دوران گفتگو صادق صاحب نے انہیں اپنی اور شاویز کی صبح ہوٹل میں ہوئی ملاقات کی تفصیل بتائی۔ ہمیمہ تب تک چائے پیش کر چکی تھی۔

"وہ چاہتا ہے۔۔۔۔ میں اسے اپنے ساتھ بلوچستان لے کر جاؤں۔۔۔۔ وہاں اسے فوجی تربیت سیکھاؤں۔۔۔۔" صادق صاحب نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اصل موضوع پر بات شروع کی۔

دائی ماں شاویز کے فرمائش سن کر دنگ رہ گئی۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ چڑھنے اور دوسرا اترنے لگا۔

"لیکن کرنل صاحب۔۔۔۔ شاویز کبھی اس محلے سے بھی باہر نہیں گیا۔۔۔۔ پھر اتنی دور اکیلے۔۔۔۔ میں نہیں جانے دیں سکتی۔" دائی ماں نے سر کو جنبش دیتے ہوئے صاف انکار کر دیا تھا۔

شاویز ان کی تردید سن کر مایوس ہو گیا۔ ایک پل کے لیے اسے اپنا خواب ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔

"ہممم۔۔۔۔ میں نے بھی اسے یہی کہا۔۔۔۔ لیکن وہ بہت پر عزم ہے۔۔۔۔ اس نے مجھے خود کو سنبھالنے کی یقین دہانی کروائی ہے۔۔۔۔" انہوں نے دائی ماں کو قائل کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

"کرنل صاحب۔۔۔۔ وہ تو نادان ہے۔۔۔۔ بچہ ہے۔۔۔۔ اسے دنیا کے رہن سہن کا کیا پتا۔۔۔۔ پانچ دن بھی وہ مجھ سے الگ نہیں رہ سکے گا۔۔۔۔" دائی ماں اپنے فیصلے پر قائم رہی۔

دروازے کے باہر کھڑا شاویز شش و پنج میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ اضطراب میں ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا۔

"مجھے وہ ارادے کا بہت مضبوط لگا ہے۔۔۔۔ ایک دفعہ جو ٹھان لے۔۔۔۔ وہ کر کے ہی رہتا ہے۔۔۔۔ پھر بھی آپ اس کی سرپرست ہے۔۔۔۔ مجھ سے بہتر جانتی ہے اسے۔۔۔۔ تو جیسے آپ کو مناسب لگے۔۔۔۔" صادق صاحب نے مزید ضد کئے بغیر سارا معاملہ ان کے

سپر دچھوڑ دیا اور کپ میز پر رکھ کر جانے کے لیے اٹھنے لگے تھے کہ رک گئے۔ شاویز منہ پھلائے آبدیدہ آنکھوں سے دائی ماں کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

"دائی ماں۔۔۔۔۔ پلیز جانے دیں۔۔۔۔۔ میں اچھے سے تربیت حاصل کروں گا۔۔۔" وہ معصومانہ انداز میں زبیدہ خالہ سے التجا کرنے لگا۔

صادق صاحب پیر کے اوپر پیر جمائے تھیوری کجاتے ہوئے اسے بغور مشاہدہ کرنے لگے۔ وہ یہ آزمانہ چاہتے تھے کہ وہ اپنی منزل کو پانے کے لیے کس حد تک کوشش کر سکتا ہے۔ ایک طرح سے وہ اس کا امتحان لے رہے تھے کہ کیا وہ واقعی فوجی تربیت دیئے جانے کے قابل ہے بھی کہ نہیں۔

"میں پکا اپنا خیال رکھوں گا۔۔۔۔۔ اپنے سارے کام خود کروں گا۔۔۔۔۔ دائی ماں۔۔۔۔۔ اجازت دے دیں۔۔۔" اس کی آواز بھر آگئی تھی۔

دائی ماں اب بھی اس کے باتوں میں آنے کی طرف دار نہیں تھی۔ وہ محض نفی میں سرہلاتی رہی۔

"شاویز۔۔۔ تمہیں جو بھی کرنا ہے۔۔۔ تم یہی رہ کر؛ کر لو۔۔۔۔۔ ضروری ہے دوسرے شہر جانا۔۔۔" دائی ماں نے پیار سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ سمجھ نہیں رہی دائی ماں۔۔۔ یہاں رہ کر۔۔۔ میں دن رات لگاتار بھی کام کروں تو اتنی رقم جمع نہیں کر سکتا کہ فوجی ٹریننگ لے سکھوں۔۔۔ یہ تو صادق سر کی مہربانی ہے جو مجھے فری میں سیکھانے پر راضی ہوئے ہے۔" وہ بات کرتے کرتے دائی ماں کے ساتھ بیٹھ گیا اور ان کے بوڑھے ہاتھوں پر اپنے چھوٹے ہاتھ رکھے۔

"زرا سوچیں دائی ماں۔۔۔۔۔ مجھے زندگی کچھ بننے کا کچھ کرنے کا موقع دے رہی ہیں۔۔۔۔۔ مجھے میری ماں کا خواب پورا کرنے کا موقع دے رہی ہیں۔۔۔۔۔ میں اصل کا شاہ سوار بن سکتا

ہوں۔۔۔۔۔ اپنی ماں کا۔۔۔۔۔ آپ کی زرتاج کا شاہ سوار۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ "اس نے پر امید نظروں سے دائی ماں آنکھوں میں دیکھا۔ وہ جو مسلسل اضطراب میں تھی۔ اس کے حوصلہ مند باتیں سن کر ہلکا مسکرائی اور اسے خود سے لگا کر پیشانی پر بوسہ دیا۔

"اتنی پرکشش باتیں کیسے کر لیتا ہے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ کر لو اپنی ماں کا خواب پورا۔۔۔۔۔ جا کر سیکھ لے فوجی تربیت۔۔۔۔۔" دائی ماں نے مسکراتے ہوئے اشک بار آنکھوں سے اسے اجازت دے دی۔ وہ خوشی سے چہک اٹھا اور روشن چہرے سے صادق سر کو دیکھا۔ وہ اسی کو دیکھ کر مسرور ہو رہے تھے۔

کچھ اور رسمی بات کر کے صادق صاحب رخصت لیتے ہوئے جانے لگے۔

"چلتا ہوں نوجوان۔۔۔۔۔ ہفتے کی صبح پہلی ٹرین سے نکلے گے۔۔۔۔۔ میں تمہیں لینے آ جاؤ گا۔۔۔۔۔ تیار رہنا۔۔۔۔۔" صادق صاحب نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک فوجی کے وعدے پر یقین ہے۔۔۔۔۔" اس نے مستحکم بھرے انداز میں ان کے کمر کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے انہیں خود سے لگایا۔

صادق صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

وہ ابھی یتیم خانے کے دہلیز تک پہنچے ہی تھے کہ دائی ماں نے انہیں پکارا۔ وہ رک کر پلٹے اور زبیدہ خالہ کی بات سننے لگے۔

"شاویز کا غصہ بہت تیز ہے۔۔۔۔۔ وہ بہت حساس اور جنونی بچہ ہے۔۔۔۔۔ وہ کبھی اس چار دیواری کے باہر نہیں رہا ہے۔۔۔۔۔ تو الگ شہر میں ہم سب سے دور۔۔۔۔۔" وہ شاویز کے لیے بہت فکر مند تھی۔ انہیں اس کا ان سے دور رہنے پر شدید تشویش لاحق تھی۔

"آپ بے فکر رہیں۔۔۔۔۔ میں اسے اپنے ذمہ داری پر لے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں اس کا خیال رکھوں گا۔۔۔۔۔ اس کے جنون کو میں مثبت راہ پر لگاؤں گا۔۔۔۔۔ اگر میری تھوڑی محنت سے

ایک معصوم یتیم بچے کی زندگی سنورتی ہے۔۔۔۔۔ تو یہ میرے لیے بہت فخر کی بات ہے۔۔۔۔۔ "انہوں نے دائی ماں کو تسلی دی اور روانہ ہو گئے۔ دائی ماں ان کی نیک دلی پر اشک بار آنکھوں سے انہیں ڈھیر ساری دعائیں دینے لگی۔

اس دن شاویز بہت خوش تھا وہ یتیم خانے کے؛ اپنے محلے کے؛ اپنے ہوٹل کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔

"کچھ دن اور۔۔۔۔۔ پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا" اس نے دل میں محفوظ ہوتے ہوئے سوچا۔



جمعہ کی رات دائی ماں چار پائی پر بیٹھی صرف اشک بہا رہی تھی۔ جبکہ وہ اور ہمیشہ اس کا سامان باندھنے لگے تھے۔ ایک چھوٹے سے سوٹ کیس میں چار جوڑے کپڑے دو جوڑے جوتے کوئی دو عدد جیکٹ ٹوپی مفکر وغیرہ اور دسویں جماعت کی کتابیں رکھ کر اس نے بیگ تیار کر لیا۔ نہا کر صاف کپڑے بھی رات کو ہی پہن لیے تھے۔

اپنی تیاری سے مطمئن ہو کر وہ دائی ماں کے پاس آیا۔ ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو صاف کیے۔

"روتی کیوں ہو دائی ماں۔۔۔۔ میں ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہا ہوں۔۔۔۔ چھٹیوں میں واپس آ جایا کروں گا تیرے پاس۔۔۔۔" اس نے پیار سے ان کے کندھے پر سر ٹکایا۔

"اکیلے کیسے رہے گا شاویز۔۔۔۔ مجھے تیری فکر ستاتی رہے گی۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ حقیقی معنوں میں متفکر تھی۔

"دائی ماں۔۔۔۔ میں فون پر اپنے سارے دن بھر کی مصروفیات بتاتا رہوں گا۔۔۔۔" اس نے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا

"کاش زرتاج یہ لمحہ دیکھ پاتی۔۔۔۔۔ اس کا ننھا بیٹا۔۔۔۔۔ فوجی تربیت کے لیے جا رہا ہے۔۔۔" دائی ماں نے اداسی بھری لمبی سانس لی اور خود کو سنبھالا۔

شاویر اسی طرح دائی ماں سے لگے کھڑکی کے باہر تاریک آسمان میں چمکتے چاند اور تاروں کو دیکھنے لگا۔

"اسے پتا تھا۔۔۔۔۔ اس نے پہلے سے ہی میرے اس مستقبل کے لیے دعائیں کر رکھی تھی۔۔۔۔۔ یونہی تھوڑی وہ مجھے شاہ سوار بلاتی رہتی تھی۔۔۔۔۔ ایسی تو نہیں وہ ہر وقت مجھے بہادر بننے کی تلقین کرتی رہتی تھی۔۔۔۔۔ وہ جانتی تھی۔۔۔۔۔ میں ایک دن ٹریننگ کے لیے جاؤں گا۔۔۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں اپنی ماں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر پھیلتی اداسی جانچ کی دائی ماں نے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"بس میں بھی اب دعا کروں گی۔۔۔۔۔ میرا لاڈلا شہزادہ جلدی سے فوجی تربیت حاصل کریں۔۔۔۔۔ اور اسے مضبوط تو انا مرد بننے تک میری آنکھیں کھلی رہے۔۔۔۔۔" انہوں نے خوشگوار مزاجی سے اسے دعا دی اور سونے کی ہدایت دے کر اپنے چارپائی پر آکر لیٹ گئی۔ وہ اپنے بستر پر لیٹا رہا لیکن صبح آنکھ نہ کھلنے کے خوف سے وہ رات بھر سویا ہی نہیں۔ جب کبھی اس کی آنکھ لگ جاتی وہ ہڑبڑا کر اٹھ جاتا۔

اسی طرح کرتے کرتے اس پر رات بیت گئی اور فجر کی اذان ہونے لگی۔ وہ آنکھیں مسلتا ہوا اٹھا اور واشروم جا کر وضو کرنے لگا۔

قاری صاحب کے ہمراہ اس نے باجماعت نماز ادا کی۔ دوران دعا وہ کافی دیر چھوٹے ہاتھ اوپر اٹھے اللہ سے اپنی کامیابی کی دعائیں کرتا رہا۔

یتیم خانے کے وسط میں ہی بنے اس مدرسے سے نکلتے ہوئے اس نے قاری صاحب سے اچھے سے مل کر رخصت لیا۔

وہ ان کے زیر نگرانی قرآن مجید مکمل کر چکا تھا۔ ان سے وابستہ شاویز کی کئی کھٹی میٹھی یادیں تھیں۔ قاری صاحب نے اسے ڈھیر ساری دعائیں دیں اور اپنی عبادات کی پابندی کی تلقین کرتے ہوئے اسے خیر باد کہا۔

صبح 6 بجے تک صادق صاحب اپنی گاڑی میں اسے لینے آ گئے۔ وہ دیر ہو جانے کی غرض سے گاڑی سے نہیں اترے اور گاڑی میں ہی اس کا انتظار کرنے لگے۔

وہ یتیم خانے کے باقی بچوں سے مل کر دائی ماں کا ہاتھ تھام کر دہلیز تک آیا۔ تب تک ذبیح اللہ اس کا سامان صادق صاحب کی گاڑی میں رکھوا چکا تھا۔

صادق صاحب دائی ماں سے ملنے گاڑی سے اترے اور اس وقت ان سے مہو گفتگو تھے۔

اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے دائی ماں پھر سے آبدیدہ ہو گئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ رو پڑتی شاویز ان سے لگ کر خدا حافظ کہتا باہر آ گیا اور گاڑی کے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

جب تک صادق صاحب ان سے وداع لے رہے تھے اس نے جی بھر کر یتیم خانے کی عمارت کو دیکھا جو اس کا کل سرمایہ تھا۔ جہاں اس نے آنکھ کھولی۔ جہاں اس نے چلنا سیکھا بولنا سیکھا۔ اپنی ماں کے سایے تلے 8 سال گزارے اور پھر دائی ماں کے پلو میں 6 سال۔ اس جگہ سے اس کی اچھی یادیں جڑی تھی تو ماں کو کھونے کا غم بھی۔ اس کی آنکھیں بھگنے لگی تو اس نے سر جھکا دیا۔

"نہیں شاویز۔۔۔۔ اب سے تمہیں رونا نہیں ہے۔۔۔۔ مضبوط بننا ہے۔۔۔۔ تاکہ تم اس کا خاتمہ کر سکو۔۔۔۔ جس کی وجہ سے خوشیوں کی موت تیری ماں چل بسی۔۔۔۔۔ دلاور پرویز خان کی بربادی۔۔۔۔ تمہیں اپنا یہ مقصد کبھی نہیں بھولنا" اس نے ٹھوس انداز میں خود سے عہد لیا۔ گہری سانس خارج کی اور خود کو کمپوز کر کے سامنے دیکھنے لگا۔

صادق صاحب تیز قدموں سے واپس آکر گاڑی میں بیٹھے اور تیز رفتار سے گاڑی چلا دی۔

"all set commando" انہوں نے پھر تیلے انداز میں اس سے پوچھا۔

وہ جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا ان کے خوشیلے انداز سے اس کے اندر الگ جذبہ پیدا ہوا۔

"Yes sir! ----" اس نے امید بھری اس نئی صبح کے چمکتے آفتاب کے مانند چمکتی مسکان

سجائے ہوئے کہا۔

یہ ٹریننگ میں بھی سٹوڈنٹس کو ایسی جو شیلہ کرتے ہونگے؛ سوچتے ہوتے شاویز کو صادق سر بہت

پیار آ رہا تھا۔

دنیا میں صرف دلاور جیسے مظلوموں کو تنگ کرنے والے لوگ نہیں ہوتے بلکہ بنا کسی مفاد کے ایک نئی زندگی کی طرف لے جانے والے صادق سر جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں؛ یہ بات اسے اس وقت صادق صاحب کے خوش اخلاقی کو دیکھ کر سمجھ آرہی تھی۔

سٹیشن کے پارکنگ میں پہنچ کر انہوں نے اپنا اور شاویز دونوں کا بیگ اٹھایا۔

"ا" just follow me ranger چونکہ ان کے دونوں ہاتھوں میں بیگ تھے وہ اسے ہاتھ سے پکڑنے سے قاصر تھے۔ تو انہوں نے تیز نگاہوں سے شاویز کو گھور کر کہا تا کہ وہ بغیر گے ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہے۔

وہ سر اثابت میں ہلاتا ہوا ان کے قدموں کی پیروی کرنے لگا۔

اسے ایک جگہ کھڑا کر کے صادق صاحب نے بیگز اس کے آگے رکھ کر خود ٹکٹیں کنفرم کروانے چلے گئے۔ واپسی ان کے ساتھ ایک دوست بھی چل کر آیا۔ کچھ رسمی باتیں کر کے انہیں اپنے گاڑی کی چابی دے کر ان کے گھر پہنچانے کی ہدایت دی پھر وہ اپنے دوست سے گلے مل کر رخصت ہوئے۔

ٹرین میں چڑھ کر شاویز کھڑکی کی سائیڈ پر بیٹھا اور ساتھ صادق صاحب بیٹھے یوں ان کی ٹرین اپنے منزل کے سمت چل پڑی۔



ٹرین کا سفر خوشگواریت سے گزر رہا تھا۔ وہ مسلسل چھوٹی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ باہر کے مناظر اسے محظوظ کرتے رہے۔ ٹرین کبھی میدانی علاقوں سے گزرتا کبھی سرسبز درختوں کے بیچ سے کبھی پہاڑی علاقوں سے۔ اسے سب سے زیادہ خوشی تب ہوتی جب ٹرین ٹنل کے اندر سے گزرتی۔ باقی شرارتی بچوں کی طرح ہر مرتبہ اس کا بھی اووووو کے نعرے لگانے کا دل کرتا لیکن صادق سر کا خیال کر کے چپ رہتا۔

ظہر کے وقت ٹرین ایک سٹیشن پر کچھ دیر رکا۔ دوپہر کھانے کے لیے تو دائی ماں نے اسے ٹفن تیار کر کے دیا تھا۔ وہ دونوں صرف فریش ہونے اترے اور وہی سٹیشن کے مسجد میں نماز بھی ادا کی۔ صادق سر اس بچے کو عقیدت سے نماز پڑھتے دیکھ کر کافی متاثر ہوئے۔

واپس اپنے سیٹ پر آکر انہوں نے دائی ماں کے ہاتھ سے بنا سالن نوش فرمایا اور ٹرین اپنے سفر کو رواں دواں ہو گیا۔

رات کے کھانے کے لیے وہ سٹیشن پر اترے۔ کھانا کھانے کے بعد صادق صاحب وہی واٹر کولر سے پانی بھرنے جانے لگے تھے لیکن شاویز نے ان کے ہاتھ سے بوتل لے کر خود بھرنے کی اجازت چاہی جو انہوں نے سر کے جنبش سے دے دی۔

وہ ابھی لائن میں اپنے باری کے لیے کھڑا تھا کہ اس کی باری پر ایک 20 سالہ آوارہ لڑکا لائن کا لحاظ کئے بغیر سامنے آیا اور زبردستی اس سے دم پھیل کرتے ہوئے بوتل بھرنے لگا۔

صادق صاحب تنے عصاب سے اسے دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا شاویز۔۔۔۔۔ تمہیں نہیں لگتا تمہارے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ کوئی پیچھے سے آکر لائن ڈسٹرب کر رہا ہے۔۔۔۔۔ کہاں ہے برائی کو روکنے والی وہ ہمت۔۔۔۔۔ یا

صرف میرے اور دائی ماں کے سامنے ہی تمہارا جنون باہر آتا ہے۔۔۔۔" صادق سر نے تند و تیز آواز میں سختی سے اسے تنبیہ کیا۔

"میں ایسے بزدل لڑکے کو۔۔۔۔ ٹریننگ نہیں سیکھا سکتا۔۔۔۔" انہوں نے میز کے ساتھ ٹکٹے ہوئے سپاٹ انداز میں کہا۔

ان کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ شاویز کے آبرو تن گئے۔ اس نے اس لڑکے کو پیٹ کے کمر سے جکڑا اور گھسٹتے ہوئے کھینچ کر پیچے لے آیا۔

"لائن سے آؤ۔۔۔۔ اپنی باری کا انتظار کرو۔۔۔۔" اسے بلند آواز میں تاکید کرتے ہوئے وہ واپس مڑا اور اپنی نوبت پر پانی بھرنے لگا۔

اس بچے کا یہ رویہ دیکھ کر وہ لڑکا طیش میں آگیا اور اسے مارنے آگے بڑھا ہی تھا کہ صادق سر اس کے سامنے آئے اور اس کے سینے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ کر اسے پیچے کیا اور خاموشی سے غصیلی نظروں سے اسے گھور کر منع کیا تو وہ متذبذب سا ہو کر سائیڈ پر ہو گیا۔



رات گہری ہونے لگی تو سب مناسب جگہ سرٹکا کر سونے لگے۔ صادق صاحب بھی پیر اوپر کر کے نیم دراز ہو گئے۔

شاویز نے بہت کوشش کی جاگتے رہنے کی۔ لیکن چونکہ وہ کل رات بھی نہیں سویا تھا اس لیے اس وقت اسے شدید نیند نے جکڑ لیا تھا۔ وہ زبردستی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کرتا مگر اس کا سر لڑک جاتا۔

صادق سر نے اسے اس شش و پنج میں مبتلا دیکھا تو سر جھٹک کر تھوڑا اوپر ہو کر بیٹھے اور شاویز کا سر اپنے گود میں ڈکا دیا۔ صادق صاحب کے گود میں سر رکھتے ہی وہ گہری نیند سو گیا تھا۔



صبح اس کی نیند شدید ٹھنڈ لگنے سے کھلی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ دسمبر کی اس سردی سے اسے یہ معلوم ہو گیا تھاٹرین بلوچستان کے مضافات کو عبور کر چکی ہے۔ اس کے اٹھ جانے پر صادق صاحب بھی اٹھے اور کھڑے ہو کر اپنے باڈی کو ستانے لگے جو ساری رات ایک ہی زاویے میں بیٹھے رہنے سے اکڑ گئی تھی۔

عنودگی سے باہر نکل کر اسے یاد آیا وہ صادق سر کے گود میں سر رکھ کر سویا ہوا تھا۔ خود غیر آرام دہ ہو کر بھی انہوں نے اسے نیند لینے دیا تھا۔ یک دم اسے ان پر شدید پیار آ رہا تھا۔ سرد ہواؤں کے پڑنے سے اسے کپکپی ہونے لگی۔ وہ نیچے جھکا اور اپنے بیگ میں سے دائی ماں کی رکھی جیکٹ نکال کر پہن لی۔

ایک گھنٹہ کے بعد سفر اختتام کو پہنچا۔ ٹرین اپنے منزل مقصود پر آ کر رک گئی تھی۔ وہ اسی طرح سر کے ہمراہ ٹرین سے اتر اور وہ دونوں سٹیشن سے باہر نکل آئے۔

اس نے دیکھا سامنے ہی ایک بڑی گاڑی کے ساتھ دو وردی والے نوجوان کھڑے تھے صادق سر کو دیکھتے ہی انہوں نے زور سے پیرچ کر ہاتھ کو پیشانی تک لے جا کر سلیوٹ (salute) کیا۔

"گڈ مارنگ سر۔۔۔" ایک نوجوان نے بلند آواز میں انہیں صبح بخیر سے خوش آمدید کہا۔
ان کے سلام کے جواب میں صادق سر نے بھی اسی طرز انداز میں پیشانی پر ہاتھ رکھ کر salute کیا۔

"گڈ مارنگ۔۔۔۔۔" کیسے ہو نوجوانوں "انہوں نے جوشیلے انداز میں رعب دار آواز میں کہا۔

ان سے خیریت معلوم کر کے ایک نوجوان آگے کو آیا اور سر کے ہاتھوں سے بیگزاٹھا کر گاڑی میں رکھنے لگا۔

ان کا یہ انداز شاویز کو بہت متاثر کر گیا تھا۔ اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے صادق سر کو دیکھا۔ ان کے تاثرات ان کی چال ان کے بولنے کا انداز بالکل ہی بدل گیا تھا۔ وہ کہی سے بھی اسے ہوٹل میں ملے نرم گویاٹرین میں اسے اپنے گود میں سلانے والے انسان نہیں لگ رہے تھے۔ اب جا کر وہ اسے سچ مچ کے فوجی آفسر لگ رہے تھے۔ ہر قدم پر اسے نیا نیا سر پرانزل رہا تھا۔

ان کے ساتھ تیز تیز چل کر وہ گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر اور ساتھ والے سیٹ پر بیٹھے دونوں نوجوانوں نے مڑ کر اسے مشکوک نظروں سے دیکھا لیکن صادق سر کا خیال کرتے ہوئے خاموش رہے۔ ان کی نظروں سے وہ چھنپ سا گیا۔

گاڑی کو سٹہ شہر سے ہوتے ہوئے کینٹ کے فوجی بیس جانی تھی۔ ابھی کچھ اور سفر باقی تھا۔ پتا نہیں کبھی بیس سے نکلنے کا موقع ملے یا نہ ملے تو ابھی ہی وہ کو سٹہ کا شہر دیکھ لے؛ سوچتے ہوئے وہ کھڑکی کے قریب کھسک کر باہر دیکھنے لگا۔

کراچی کے نسبت کوئٹہ کافی غیر ترقی یافتہ چھوٹا شہر تھا۔ وہاں کے لوگ بہت سادہ مزاج اور خوش اخلاق تھے۔

جب وہ کینٹ کے حدود میں داخل ہوئے تو اسے کئی سارے چیک پوسٹ نظر آئے۔ ہر چیک پوسٹ میں تعینات وردی والے اندر بیٹھے صادق صاحب کو دیکھ کر سیلوٹ کرتے اور ان کی گاڑی آگے بڑھتی جاتی۔

اس نے رخ پھیر کر صادق صاحب کو دیکھا اتنے ٹھٹھاٹ باٹ اور آہو بھگت کے باوجود بھی ان میں زرا برابر بھی غرور و تکبر نہیں تھا۔ کتنے سیدھے اور شریف انسان ہے۔ ہر سیلوٹ کا وہ

مسکرا کر سر کے خم سے جواب دیتے۔ ان کا یہ انداز زندگی دیکھ کر شاویز نے بھی یہ ارادہ بنالیا تھا کہ زندگی میں چاہے جتنی بھی بلندی آجائے وہ ہمیشہ صادق سر کی طرح سیدھا اور شریف رہے گا۔



بیس کے اندر آکر وہ مانو فلموں کی دنیا میں آگیا ہو۔ ہر طرف وردی میں ملبوس فوجی آفسران۔ کچھ ٹریننگ کرتے نوجوان۔ بڑے بڑے وسیع و عریض کمرے۔ الگ الگ تربیتی کیمپ اور سامان۔ کچھ حقیقی کچھ مصنوعی آلات۔

شاویز آنکھیں بڑی کر کے ہر ذرے کا مسرور و محظوظ ہو کر جائزہ لے رہا تھا۔

گاڑی رکی تو وہ حیرت سے آس پاس دیکھتا شاکی حالت میں نیچے اتر۔

"مشتاق۔۔۔ میرا سامان گھر چھوڑ کر آؤ۔۔۔ اور بچوں سے کہنا میں شام کو گھر آؤ گا۔۔۔"

صادق صاحب نے اس کا بیگ اٹھا کر اس نوجوان کو ان کا سامان گھر پہنچانے کی ہدایت دی تو وہ سر ہلاتا ہوا پھر سے گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔

فوجی بیس میں ٹریننگ ایریا سے نکل کر کچھ آگے کینٹ میں ہی وہاں کے آفسران کے لئے ایک یادو بیڈروم پر مشتمل گھر فراہم کئے گئے تھے۔ جہاں شادی شدہ آفسران اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ صادق صاحب کا بھی ایسا ہی ایک گھر تھا۔

"چلو ننھے نوجوان۔۔۔ تمہیں تمہارا کواٹر دکھاتا ہوں۔۔۔" شاویز کو مخاطب کرتے ہوئے وہ پھر سے تیز قدموں سے ان لمبے اور بڑے ہال نما کمرے کی جانب چلنے لگے۔

"آپ کے بچے ہیں۔۔۔" شاویز نے پہلی مرتبہ ان سے پرسنل سوال پوچھا۔

صادق صاحب نے ایک تعجبی نظر اس پر ڈالی اور پھر سے سامنے دیکھنے لگے۔ شاویز کو اپنے ایسا سوال پوچھنے کی بیوقوفی پر شرمندگی ہوئی وہ سر جھکا کر لب کاٹنے لگا۔

"بلکل ہے۔۔۔۔۔ تین بچے ہیں۔۔۔" صادق صاحب نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔

شاویز کو وہ پھر سے صبح والے صادق سر لگ رہے تھے۔

"میرے جتنے" اب کی بار اس نے بغیر جھجکے پوچھا۔

"ہمممم۔۔۔۔۔ تم سے تھوڑے چھوٹے ہیں۔۔۔۔۔ بیٹا 9 سال کا ہے۔۔۔۔۔ بیٹی 7 سال

کی۔۔۔۔۔ اور سب سے چھوٹی والی ابھی 4 سال کی ہیں۔۔۔۔۔ ایک دن تمہیں ان سے ضرور

ملو اوں گا۔۔۔" انہوں نے خوش مزاجی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

شاویز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ صادق سر کے بچوں کے بارے میں سوچ کر ابھی سے خوش ہونے لگا۔

ایک وسیع و عریض ہال کا انہوں نے ناب گھما کر دروازہ کھولا۔ اندر قطار سے دونوں طرف کچھ کچھ فاصلے سے سنگل بیڈ پڑے تھے۔ 20 سٹوڈنٹس پر مشتمل 15 اور 16 سالہ لڑکوں کا جمکٹا جو بستر پر کودتے ناچتے ایک دوسرے کو مارتے گراتے شور مچا رہے تھے؛ صادق سر کو دیکھتے ہی سب سہم گئے اور تیزی سے ایک لائن بنا کر کھڑے ہو گئے۔

صادق سر سپاٹ تاثرات بنائے اس کا بیگ اٹھائے قدم قدم چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ شاویز بھی ان کی پیروی کرتا ان کے ساتھ چلنے لگا۔

آخری قطار کے سنگل بیڈ کے پاس انہوں نے اس کا بیگ رکھا۔

"یہ تمہارا بستر ہے۔۔۔۔۔ اور وہ واشرومز۔۔۔" انہوں نے وسطی دیوار کی طرف اشارہ کر کے بتایا جہاں قطار سے چار واشرومز بنے تھے۔

ان کے رعب دار حکم کا شاویز نے موودب انداز میں سر کو جنبش دے کر جواب دیا۔

اپنے ساتھی آفسران اور سٹوڈنٹس کے سامنے وہ اس سے بھی نئے سٹوڈنٹ کی طرح قدرے سختی سے پیش آتے اور اکیلے میں دوستانہ انداز میں۔

"یہاں سے آگے کے مراحل تمہیں اکیلے طے کرنے ہیں۔۔۔۔۔ میرا کام صرف تمہیں راستہ دکھانا ہے۔۔۔۔۔ اسے پار تم نے اپنے بل بوتے پر کرنا ہے۔۔۔۔۔ انڈر سٹینڈ۔۔۔۔۔" اب کی بار انہوں نے سپاٹ انداز میں ہی قدرے نرمی سے کہا۔

"یس سر۔۔۔۔۔" اس نے نئے جذبے سے ہامی بھری۔

اسے اس کی جگہ بتا کر وہ واپس پلٹے۔ آپس میں چی مگوئیاں کرنے والے سب لڑکے سیدھے ہو گئے۔

"نیا سٹوڈنٹ ہے۔۔۔۔" and i want you all to be nice with him میں

چاہتا ہوں۔۔۔ آپ سب اس کے ساتھ اچھے سے پیش آئے" انہوں نے شاویز کو ان سب سے متعارف کروایا۔

سب اسے دیکھنے لگے۔ کچھ اچھے انداز سے کچھ بے رخی سے اور کچھ بیزاری سے۔

"اور جتنا کھیل کود کرنا ہے آج کر لو۔۔۔۔ کل سے گراونڈ میں؛ میں کسی کا کوئی بہانہ نہ

سنوں۔۔۔۔ 6am شارپ۔۔۔۔" صادق سر نے سب کو مخاطب کیا تو سب نے یک جا ہو کر تہذیب سے یس سر کا نعرہ بلند کیا۔

سب اپنے اپنے بستر کی جانب بڑھنے لگے اور صادق سر پھر سے شاویز کے جانب متوجہ ہوئے۔

لڑکوں اور بچوں کے بیچ گزارا تھا لیکن اس وقت ان لڑکوں سے اسے قدرے ڈر لگ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ صادق سر کی بات مانے گے یا نہیں۔ وہ اس سے کیسا رویہ رکھے گے؛ سوچتے ہوئے اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔



لڑکوں کے گروپ کا ایک شرارتی لڑکا اس کے پاس آیا اور اس کے گرد گول گول گھومنے لگا۔
 "اچھے سے پیش آئے ہاں۔۔۔۔۔ ایسا کیا ہے اس میں۔۔۔۔۔ جو کرنل سر اتنی حمایت کر رہے تھے۔۔۔" کبیر نے بے رخی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں پکڑی چیزیں جھڑپ کر دور پھینک دی۔

اس کے حرکت پر اس کے گروپ والے سب ہنسنے لگے۔ شاویز کو آتے ہی لڑائی جھگڑا نہیں کرنا تھا اس لیے ضبط کرتے ہوئے صرف خاموشی سے اسے گھور کر اپنے چیزوں کے پاس گیا اور جھک کر اٹھانے لگا کہ دوسرے لڑکے نے لات مار کر سب پرے کھسکا دی۔ شاویز کے آبرو تن گئے وہ دانت پر دانت جمائے ہوئے اسے گھورنے لگا۔ بولا اب بھی کچھ نہیں۔ جب وہ آگے جا کر پھر سے جھکا اور سامان اٹھانے لگا تو کبیر نے ہنستے ہوئے لات مارنے کے لیے پاؤں اٹھایا ہی تھا لیکن شاویز نے مضبوطی سے جکڑ لیا۔ کبیر ہلتا جلتا اس کے گرفت سے اپنا پاؤں آزاد کروانے لگا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا سامان اٹھایا اور اٹھتے ہوئے کبیر کا پیر اوپر کو کھینچا تو وہ ڈگمگا کر گر پڑا۔

باقی سب خاموش تماشائی بنے یہ سب دیکھتے رہے۔

کبیر اٹھا اور ناک پر غصہ جمع کرتا اسے مارنے لگا تھا۔ شاویز اسی سپاٹ انداز میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا پر اسد نے کبیر کو پکڑ کر پیچھے کر لیا۔

وہ ایک جم نما میدانی کمراتھا جہاں باڈی بنانے کے الگ الگ مشینری اور آلات پڑے تھے۔

کچھ آگے چل کر ایک اور جگہ اسد پھر سے گاٹیڈ کی طرح اسے وہاں کی خصوصیات بتانے لگا۔ وہ کچی زمین تھی اور زمین سے ایک فٹ جتنا اوپر خاردار تاریں بچھی تھی۔ اور آگے رسی کے جالے بنے تھے پھر لمبی دیوار تھی جس کو پھلانگ کر اگلے حصہ تک جانا تھا۔

"یہاں سے مین ٹریننگ شروع ہوتی ہیں۔۔۔" اس جگہ کی تفصیلات بتا کر اسد نے اس کے پاس آکر کہا۔

شاویز نے اس کے تفصیلات سمجھنے کے انداز میں سر کو جنبش دیا۔

"کہاں سے آئے ہو۔۔۔" اسد اب اسے لیئے دوسرے حصے میں جارہا تھا۔

"کراچی سے۔۔۔۔" شاویز نے سیدھے انداز میں چلتے ہوئے کہا۔

"کرنل سر کے اپنے ہو۔۔۔۔" اسد نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

پتا نہیں صادق سر مجھے یہاں کس رشتے کے غرض سے لائے ہیں؛ سوچتے ہوئے وہ اسد کو

مناسب جواب دینے کے لیے رک رک کر بات کرنے لگا۔

"کچھ ایسا ہی سمجھو۔۔۔۔" اتنا کہتے ساتھ شاویز تیز چلنے لگا تا کہ اسد اس کی شخصیت کے بارے

میں مزید سوال نہ کریں۔

ایک جگہ قریب آکر وہ رک گیا۔ وہاں بڑے نوجوانوں کی ٹریننگ کی جارہی تھی۔ ویسے تو اتوار

کادن تھا لیکن وہ جوان لڑکے پھر بھی اپنی پریکٹس میں لگے تھے۔

"کل ان کا سلیکشن ڈے ہیں۔۔۔۔ جو بھی کل ان میں سے پاس ہو جائے گا۔۔۔۔ وہ آرمی میں بھرتی ہونے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔۔۔۔" شاویز کو سپاٹ انداز میں ان لڑکوں کو اتوار کو بھی ٹریننگ کرتے حیرانگی سے دیکھتے ہوئے دیکھ کر اسد نے مختصر سی وضاحت کی۔

"تم کیوں فوجی بننا چاہتے ہو۔۔۔۔" اس نے دوستانہ انداز میں شاویز کو مخاطب کیا۔

ابھی اس کی کسی سے اتنے حد تک دوستی نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی کو بھی اپنا اصل مقصد بتا سکے۔

"ہمممم۔۔۔۔۔ بس مضبوط بننا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ دشمنوں کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔" شاوینز نے اپنے اندرونی کیفیت چپاتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں بننا چاہتے ہو۔۔۔" اس سے پہلے اسد اس سے مزید سوال کرتا شاویز نے پہلے سوال کر دیا۔ اسے بار بار موضوع گفتگو بننا برا لگ رہا تھا۔

"ہم مشرقی بچوں کی اپنی کیا چاہت ہے۔۔۔۔ اس سے کسی کو فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔ ہمیں تو بس والدین کے پسند کردہ پیشہ پر گامزن ہونا ہوتا ہے۔۔۔۔" اسد نے بے بسی سے سر جھٹکا۔

"میرے ڈیڈ آر می آفسر رہ چکے ہیں۔۔۔۔ وہ چاہتے ہیں ان کے سارے بچے بھی اسی پیشے سے منسلک ہو۔۔۔۔ میرا بڑا بھائی آر می ڈاکٹر ہے۔۔۔۔ بہن ایر فورس کی سٹڈی کر رہی ہے۔۔۔۔ تو مجھے بھی آر می آفسر ہی بننا ہے۔۔۔۔ سمپل۔۔۔۔" اس نے بے زاری سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

شاويز محض ایک پھکی مسکراہٹ بنائے اسے دیکھتا رہا۔

چلتے چلتے وہ دونوں واپس ہال میں آئے۔

اپنے بستر کے پاس آتے ہی اس کے عصاب تن گئے۔ اس کا سارا سامان بیڈ پر بکھرا پڑا ہے۔ وہ جانتا تھا یہ کام کس کا ہو سکتا ہے۔ اس نے مڑ کر تند نظروں سے کبیر کو دیکھا۔ وہ ہونٹ دانتوں میں دبائے استخزیہ انداز میں آبروریزی کرتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ میرے صبر کا بہت امتحان لے رہا ہے۔۔۔۔۔ لیکن مجھے یہاں لڑنا نہیں ہے۔۔۔۔۔" شاوینز نے دل ہی دل سوچ کر سر جھٹکا اور سپاٹ تاثرات بنائے واپس اپنا سامان بیگ میں ڈالنے لگا۔



کھانا لگنے سے دس منٹ پہلے زور سے ایک بیل بجائی جاتی تاکہ جو جہاں ہے سب چھوڑ کر ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے آجائے۔

گھنٹی بجی تو اسد نے اسے کھانے کے لیے چلنے کی رہنمائی کی۔ وہ اس کے ہمراہ ہاتھ دھو کر ان ہی کے بیڈ روم جیسے ہال نما کمرے سے بھی بڑے ایک اور ہال میں در آیا۔ وہاں جتنے بھی سٹوڈنٹس تھے ٹین ایجنٹ لڑکے یا بڑے نوجوان سب کو ایک ہی جگہ پر کھانا ملتا تھا۔ وہ اسد کے ساتھ بھاگتا ہوا ان کی قطار میں کھڑا ہو گیا۔

10 سے 15 مردوں پر مشتمل کچن کے کارکنان تیز تیز سب کو ایک برابر تقسیم شدہ کھانے کے پلیٹ پکڑ رہے تھے۔ وہاں کے روٹین کا الگ ہی نظام تھا۔ روزانہ ناشتے لنچ اور ڈنر میں ملنے والا غذا کے نام نوٹس بورڈ پر لگا دیئے جاتے پھر جیسے مرضی کھانا ہو جیسے مرضی بھوکا رہنا ہو اس کے علاوہ کوئی اور اشیاء بنانے پر سخت پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

"تمہارا آئی کارڈ کہاں ہے۔۔۔" اس آدمی نے اسے پلیٹ پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آج ہی آیا ہے۔۔۔۔۔ کل تک کارڈ بنالے گا۔۔۔" اسد نے مداخلت کر کے اس کی وضاحت دی۔

وہ موٹا آدمی سر دھری سے اسے پلیٹ پکڑا کر آگے بڑھ گیا۔

"کرنل سر سے کہہ کر۔۔۔۔۔ کل تک اپنا کارڈ بنوالینا۔۔۔۔۔ یہ لوگ بغیر کارڈ کے کھانا نہیں دیتے۔۔۔۔۔" اسد نے بیٹھتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

اس نے سر اثابت میں ہلایا اور آس پاس رش میں نظر گردانی کی تو سب کے گلے میں بلیورنگ کے ربن لگے آئی کارڈز تھے۔

وہ ابھی کھانا شروع ہی کرنے لگا تھا کہ کبیر شرارتی انداز میں بھاگتا ہوا اس کے سیٹ سے گزرا اور پانی سے بھرا گلاس اس کے پلیٹ میں انڈیل دیا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ پل بھر میں دال اور چاول مچھلی کی طرح پانی میں تیرنے لگے۔ اس نے منہ بھسورتے ہوئے اسے دیکھا وہ ہنستا ہوا بھاگ کر قطار کے دوسرے وسط میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔

"دیکھو بچے۔۔۔۔۔ یہ اکیڈمی ہے۔۔۔۔۔ تیرے باپ کا ولیمہ نہیں چل رہا۔۔۔۔۔ یہاں سٹوڈنٹس اور سٹاف کو گن کر کھانا بنایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ ایسے کوئی بھی دس دفعہ اٹھ کر آجائے کھانا مانگنے تو کیا ہم دیتے رہے۔۔۔۔۔ پلیٹ ضائع کر دی۔۔۔۔۔ تو اب بھوکے رہو۔۔۔۔۔ اور نہیں ملے گا۔۔۔" وارڈن نے سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا اور دروازہ اس کے منہ پر بند کر دیا۔

شاویز نے مایوسی سے پہلے بند دروازے کو دیکھا پھر اسد کو۔ اگر وہ خالی ہاتھ واپس گیا تو اسد شاید اپنا پلیٹ اسے پیش کریں؛ جو شاویز ہر گز نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے خاموشی سے اسد کی نظروں سے بچتے ہوئے وہ مین گیٹ کی جانب بڑھ گیا اور باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے ایک غصیلی نگاہ کبیر پر ضرور ڈالی تھی۔

"اب بس بہت ہوا۔۔۔۔۔ دوبارہ اس نے کوئی ایسی حرکت کی۔۔۔۔۔ تو میں اس کا منہ توڑ دوں گا" دل میں سوچتے ہوئے وہ بھاگتا ہوا اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔

اسے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ کل رات سٹیشن کے ہوٹل پر کھانے کے بعد سے اس نے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا اور دوپہر کا لنچ بھی کبیر کی وجہ سے ضائع ہو گیا تھا۔ اسے یک دم اپنی ماں کی بہت یاد آنے لگی جو اس کی ایک آواز پر خود بھوکا رہتی لیکن اسے ضرور کھانا دیتی۔ کافی دنوں بعد زرتاج کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھر آ گئی لیکن وہ رویا نہیں۔ اسے اب اپنے آنسو کنٹرول کرنے تھے۔ اسے مضبوط بننا تھا۔

جب لنچ سے فارغ ہو کر اسد وہاں آیا تو شاویز نے آنکھیں موند لی اور سونے کی اداکاری کرنے لگا۔ اس وقت اسے اسد سے روبہ رو نہیں ہونا تھا۔ وہ کھانے کے وقت کہاں غائب ہو گیا؛ اس جیسے سوالات کے اس کے پاس جوابات نہیں تھے۔

عصر تک وہ بے مقصد بستر پر پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر وضو کیا اور باہر آیا۔ دُور پلے گراؤنڈ میں اسد اور باقی ساتھی فُٹبال کھلتے نظر آرہے تھے۔ وہ واپس مڑ کر اکیڈمی کے گیٹ کے سامنے مسجد

میں چلا گیا۔ عصر کی نماز ادا کر کے وہ قرآن پاک لے کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنے قاری صاحب کی نصیحت یاد آگئی تھی۔ مغرب تک اس نے تلاوت کی پھر مغرب کی نماز ادا کر کے اکیڈمی میں آگیا۔

شاویز کو صبح رخصت لینے کے بعد سے صادق سر نظر نہیں آئے تھے۔ شاید وہ اپنے گھر چلے گئے تھے جیسا کہ انہوں نے صبح اس نوجوان سے کہلوایا تھا۔

اسے اپنے یتیم خانے اپنے ہوٹل اور سب سے زیادہ دائی ماں کی بہت یاد ستانے لگی۔

کیا اس نے یہاں آکر غلطی تو نہیں کر دی۔ اس سے ایک دن بھی یہاں رہا جا رہا وہ اتنے سال کیسے رہے گا۔ کیا اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی چاہیے؛ سوچتے ہوئے بھاری قدموں سے چلتا ہوا اپنے بستر تک آیا کہ اسد نے اس کے کندھے پر تھپکی ماری۔

"کہاں تھا یار۔۔۔ کب سے ڈھونڈ رہا تھا تجھے۔۔۔" اس نے پھولے ہوئے سانس سے کہا۔ وہ ابھی ابھی کھیل سے فارغ ہو کر آیا تھا۔

"مسجد گیا تھا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔" شاویز نے اپنے خیالات مہو کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے فٹبال کھیلنے بلا رہا تھا۔۔۔" وہ اسی کے ساتھ والے بستر پر نیم دراز ہوا۔

"مجھے فٹبال نہیں آتا" شاویز بھی اسی کے طرز میں نیم دراز ہوا اور ہاتھ سر کے پیچے ٹکا دیئے۔

"تو والی بال کھیل لیتے۔۔۔۔" اسد نے مسکراتے ہوئے تجویز دی۔

"مجھے کوئی کھیل نہیں آتا۔۔۔" شاویز نے سادگی سے جواب دیا۔

اس کی بات پر اسد قدرے حیران ہو کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"مطلب۔۔۔ تم نے کبھی گلی میں لڑکوں کے ساتھ کرکٹ بھی نہیں کھیلی۔۔۔" اسد نے

استخریہ ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔

"تو کرتے کیا تھے پورا دن۔۔۔۔" اس نے ہنسی روکتے ہوئے مزید اضافہ کیا۔

"ہوٹل میں مزدوری کرتا تھا۔۔۔" شاویز نے مدھم آواز میں کہا لیکن ساتھ لب بھی کاٹنے لگا جیسے اپنے بات پر پچھتا رہا ہو۔

اسد نے حیرت سے آبرو اچکا کر تعجبی انداز میں اسے دیکھا پھر اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔
"ہاں تو محنت سے کام کرتے تھے۔۔۔ اس میں شرمٰن کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔" اس نے
اس کے کندھے کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے کہا۔
"چلو۔۔۔ اب ہاتھ دھونے چلتے ہیں۔۔۔۔۔ 7 بجے ڈنر کا ٹائم ہے۔۔۔" اسد نے موضوع بدلتے ہوئے کہا اور اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے لگا۔

ڈنر کے وقت وہ بہت محتاط انداز میں بیٹھا تھا۔ اپنے سارے حس بیدار رکھے وہ تیز نظروں سے آس پاس دیکھتا رہا کہ کہیں سے آگر کبیر کوئی مستی کرنے لگے تو وہ اسے روک لے۔ اسے کسی قیمت رات کا کھانا ضائع نہیں کرنا تھا۔

کھانے کے بعد 9 بجے سب سونے چلے گئے پر وہ اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گیا۔ وہ پہلے ہی کافی وقت برباد کر چکا تھا اب اس کے لیے ایک ایک منٹ قیمتی تھا اور بنا ضائع کئے اسے اپنے پڑھائی پر لگنا تھا۔



صبح چھ بجنے سے پانچ منٹ پہلے دھڑادھڑ دوازہ بجا۔ لڑکوں نے عنودگی سے باہر نکل کر وقت دیکھا تو سب کے طوطے اڑ گئے دھکم پیل کرتے ہوئے سب فریش ہونے واشروم پر لڑ پڑے۔

ابھی وہ سب لڑ ہی رہے تھے جب فجر کی نماز ادا کر کے مین دروازے سے شاویز حیران پریشان اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس نے تعجب سے سب کو دیکھتے ہوئے ایک لڑکے کو روکا۔

"کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ یہ ہنگامہ کس بات کا مچا ہے۔۔۔۔۔" اس نے لڑکوں کے ہنگامے کو دیکھ کر پوچھا۔

"چھ بجے کرنل سر کی کلاس ہے۔۔۔ اس لیے سب میں پہلے فریش ہونے کی جلدی مچی ہے"

اس لڑکے نے پھرتی سے جواب دیا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔

دسمبر کی سردی میں سب کانپتے ہانپتے لائن سے کھلے آسمان تلے کھڑے ہو گئے۔ شاویز بھی ان کے ساتھ کھڑا تھا جب اس نے بھاری بوٹوں کی چھاپ سنی۔

کرنل صادق غفار اپنی وردی میں تیار۔ چوڑے شانے۔ سیدھی کمر۔ سینہ تھانے۔ چہرے پر سنجیدگی بنائے ان کی جانب آرہے تھے۔

سب کو جانچتے ہوئے وہ شاویز کے آگے آکر رک گئے۔ چہرے پر تاثرات تو سپاٹ تھے لیکن آنکھوں میں نرمی اور خوش دلی کو شاویز سمجھ گیا اور جواب میں ہلکا مسکرا دیا۔

واپس پلٹ کر صادق صاحب نے باقی لڑکوں کو تین دفعہ پورے گراونڈ میں دوڑ لگانے کا حکم صادر کیا اور شاویز کو وہی رکنے کا کہا۔

اس کے کہنے سے پہلے ہی صادق سر اس کا آئی کارڈ بنا کر لے آئے تھے۔ انہوں نے جیب سے نکال کر کارڈ اسے تھمایا۔

"تو نوجوان شاویز۔۔۔۔۔ کیسا رہا اب تک کا وقت۔۔۔۔۔ اڈ جسٹ ہو گئے۔۔۔۔۔" انہوں نے شریر انداز میں پوچھا۔

"کچھ وقت لگے گا پر اڈ جسٹ ہو جاو گا۔۔۔۔۔" اس نے جذبات سے سرشار ہوتے ہوئے کہا۔

"سوچ لو۔۔۔۔۔ ابھی کچھ دن ہے تمہارے پاس۔۔۔۔۔ ارادہ بدل جائے تو بتا دینا۔۔۔۔۔"

میں اگلی ٹرین سے واپس بھیجوادوں گا۔۔۔۔۔" صادق سرنے تند تاثرات بنائے اسے دیکھا۔

"ایک مرتبہ میں جو ٹھان لوں تو وہ کر کے رہتا ہوں۔۔۔۔۔ یہاں آیا ہوں تو کچھ بن کر ہی جاو

گا۔۔۔۔۔" شاویز نے پختہ ارادہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے پھر۔۔۔۔ شروع کرتے ہیں۔۔۔" وہ اسے لے کر جم ایریا میں آگئے تھے۔

وہاں ایک کارکن پہلے سے موجود تھا۔ صادق سر نے اپنی ٹوپی اور چھڑی ٹیبل پر رکھتے ہوئے اسے سامنے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سامنے آیا اور بغور انہیں دیکھنے لگا۔

"آغاز مارشل آرٹس سے کریں گے۔۔۔" کرنل سر نے آستین کہنیوں تک موڑتے ہوئے کہا تو اس نے سر اثابت میں ہلا دیا۔

مارشل آرٹس کا آغاز 600 سال پہلے چائے اور انڈیا میں ہوا۔ عموماً اس کا استعمال ذاتی دفاع (personal defence) کے لیے کیا جاتا۔ اس کے علاوہ جنگ میں؛ شکار کے لیے؛ لڑائی میں بھی مارشل آرٹس آزمایا جاتا۔

ہر میدان میں استعمال ہونے کے لیے مارشل آرٹس کے الگ الگ طریقے ہوتے ہیں۔ اسے کھیل کے طور پر بھی سیکھایا جاتا ہے۔ مارشل آرٹس ہمت بڑھانے، بااعتماد بننے، چست و تندرست اور ذہنی طور پر پُر سکون رہنے کا بھی نام ہیں۔

مارشل آرٹس کی دو بڑی اقسام ہے۔

(ایک) Unarmed بغیر ہتھیار کے)

اس قسم میں ہاتھوں اور پیروں کا استعمال کر کے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

یہ قسم لڑنے، مقابلہ کرنے؛ اور سیلف ڈیفنس میں استعمال ہوتا ہے۔

اس قسم میں

مقەزنى (karate, boxing)

لات مار (karate, taekwondo, kickboxing)

اٹھاپٹک (judo, jujutso, wrestling)

جیسے طریقہ کار آمد ہوتے ہیں۔

دوسری قسم (armed ہتھیار کے ساتھ) ہے

اس قسم میں مختلف ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں۔

جیسے تلوار زنی؛ تیر اندازی؛ چاقو سے نشانہ بندی اور ڈنڈے سے مقابلہ کرنا شامل ہے۔

مارشل آرٹس چائینہ جاپان انڈیا امریکہ اسرائیل اور جرمی میں خاص طور پر فوجی تربیت میں سکھانا لازمی قرار دیا گیا ہے۔



کرنل صادق بھی اپنے سٹوڈنٹس کو ذہنی اور جسمانی طور پر توانا بنانے لیے ٹریننگ کا آغاز مارشل آرٹس سے کرواتے۔

اس وقت وہ شاویز کو کچھ ورزشی عمال اور کراٹے کی شروعات کے عمال بتا رہے تھے۔

شاویز پوری لگن سے ان کے بتائے سارے احکامات پر عمل کرتا رہا۔ شروع شروع میں اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بار بار گر کر اٹھنا۔ گھٹنوں اور کہنیوں کی جلد چھل گئی۔ کبھی ڈنڈا چلاتے چلاتے خود کو ہی لگ جاتا۔

دو ماہ تک اس نے ہر طرح کے چھوٹ برداشت کر کے۔ گر کر اٹھ کر۔ درد سہہ کر۔ راتوں کی نیند حرام اور دن کا چین گنوا کر۔ سردی بارش بر فباری کی فکر کئے بغیر خوب محنت کی۔

مارچ کا مہینہ شروع ہوا تو اس کے سب ساتھی وہی بیس کے اسکول جانے لگے جبکہ شاویز اپنے آپ کے ساتھ ہی دسویں جماعت کی کتابیں پڑھتا رہتا۔

اسے جلد از جلد اپنی تیاری مکمل کرنی تھی کیونکہ کچھ ہی دنوں میں اسے واپس جا کر اپنے بورڈز کے امتحانات دینے تھے۔ اس نے اسی کے چلتے پچھلے دو ماہ میں سپورٹس کی کلاس نہیں لی تھی۔

ایک دن وہ صادق سر کی کلاس کے بعد بیٹھا اپنا پڑھ رہا تھا جب اس نے اپنے سامنے ایک جوان تو انا مرد کو کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا وہ 27 سالہ جوان آدمی ان کا سپورٹس کوچ تھا۔ قد کاٹ میں وہ بھی لمبے۔ چوڑے شانے۔ مضبوط باڈی کے حامل تھے۔

شاویز شرمسار ہوتا ہوا احترام سے کھڑا ہو گیا۔

"کنڈیٹ شاویز۔۔۔" ریحان احمد نے اس کے آئی کارڈ سے اس کا نام پڑھ کر مخاطب کیا۔

"آپ میری کلاس نہیں لیتے۔۔۔۔۔ سپورٹس نہیں پسندیا میں۔۔۔۔۔" انہوں نے سرد مہری سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوری سر۔۔۔۔۔ میں ایگزیمز کی تیاری کر رہا تھا۔۔۔۔۔ موقع نہیں ملا۔۔۔۔۔ امتحانات کے بعد۔۔۔۔۔ آپ کی ڈبل کلاسز لوں گا۔۔۔۔۔ شاویز نے معصومیت سے جواب دیا۔

"اسکول کیوں نہیں گئے۔۔۔۔۔" وہ قدم قدم چل کر اس کے سامنے بیچ پر بیٹھ گئے۔

"اسکول جانے کے لیے فیس نہیں ہے۔۔۔۔۔" شاویز ہاتھ میں کتاب پکڑے کھڑا رہا۔

ریحان احمد نے تعجبی انداز میں آبرو سکیڑ کر اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

"کس کے ریفرنس پر آرمی اکیڈمی میں آئے ہو۔۔۔۔۔" شاویز کے حرکات و سکنات بغور مشاہدہ کرتے ہوئے انہوں نے اسے قریب بلایا۔

"صادق سر کے ریفرنس سے۔۔۔۔" شاویز نے با اعتماد لہجے میں کہا۔

ریحان سر کر نل صادق کے نام پر سیدھے ہو گئے۔ شاویز کو لگا جیسے وہ خود بھی صادق سر سٹوڈنٹ رہ چکے ہیں۔

"ہمم۔۔۔۔ امتحانات ختم کرنے کے اگلے دن سے سپورٹس جوائن کر لینا۔۔۔۔" اسے تاکید کرتے ہوئے وہ اٹھے اور دو قدم آگے بڑھ گئے لیکن پھر رک کر واپس مڑے۔

"کیا پڑھ رہے تھے۔۔۔۔" انہوں نے شاویز کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر پوچھا۔

شاویز نے انہیں اپنا مطلوبہ سبق بتایا تو وہ واپس بیچ پر بیٹھ کر اسے پڑھانے لگے۔

شاویز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ خوشی سے محظوظ ہونے لگا۔ اسے واقعی ان دنوں کوئی پڑھائی میں مدد کرنے والا چاہیے تھا حالانکہ اس نے پچھلے ہفتے اسد سے کچھ مدد مانگی تھی لیکن اس نے اپنی ذاتی مصروفیات کی لمبی لسٹ گنوا کر اس کی مدد کرنے سے معذرت کر لی تھی

اور آج اس کو خدا کا داد ریحان احمد کے روپ میں مل گیا تھا۔ وہ ان کے قریب بیچ پر بیٹھ گیا اور پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز کر لی۔

بیشک اللہ مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ وہ اپنے سچے بندوں کی ضرور مدد فرماتے ہیں۔



دو ہفتوں تک اس نے مارشل آرٹس کے ساتھ ساتھ پڑھائی پر بھی کافی زور دیا۔ ریحان سر مزاج کے سنجیدہ تھے پر دل کے اچھے انسان تھے۔ وہ روز شاویز کی پڑھائی میں مدد کرتے رہے تھے۔

کبیر اور اس کے دوستوں سے اس کا آمناسا مناکم ہوا کرتا اس لیے انہیں شاویز کو ٹارچر کرنے کا زیادہ مواقع نہیں مل پاتے۔ صرف اسے چڑانے کے لیے کبیر کبھی جان بوج کر شاویز کے

تیار ہونے کے وقت واشروم میں گھس جاتا۔ کبھی اس کے بستر پر پانی گرا دیتا۔ کبھی اس کے کپڑوں کی استری خراب کر دیتا۔ شاویز اس کی یہ حرکات برداشت کر لیتا اور خاموشی اختیار کر لیتا۔ اس وقت اس کا سارا دھیان اپنے بورڈ کے امتحانات پر تھا۔

وہ اپنے امتحانات کے لیے دس دنوں کی چھٹی لے کر کراچی چلا گیا۔ دائی ماں اسے دیکھ کر تیزی سے اس سے گلے ملی۔ اسے بہت پیار دیا۔

22 سالہ ہمیمہ کی شادی ہو گئی تھی اور 19 سالہ شفیع اللہ ایک ٹھیکیدار کے ساتھ منشی لگ کر لاہور چلا گیا تھا۔ اس وقت دائی ماں کے پاس 4 سے 14 سال کے مابین بچے تھے۔ ہمیمہ کے حصہ کا کام کرنے انہوں نے ایک دوسری بیوہ عورت رکھ لی تھی۔

ان دس دنوں میں فارغ وقت میں اس نے دائی ماں اور یتیم خانے کے باقی بچوں کو مارشل آرٹس کے وہ سارے کرتب کر کے دیکھائے جو اس نے اکیڈمی میں سیکھے تھے۔ بچے تو مسرور

ہو جاتے اسے تالیاں بجا کر سر اہتے جبکہ دائی ماں کی آنکھیں بڑی ہو جاتی وہ اسے ڈانٹنے لگ جاتی۔

امتحانات دے کر واپسی پر وہ بہت خوش تھا۔ اب کالج کی تعلیمات شروع کرنے میں وقت تھا اس کے پاس اور اس وقت میں اس نے ریحان سر سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق سپورٹس کی ڈبل کلاسز لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ آخر انہوں نے آخری دنوں میں شاویز کی اتنی مدد کی ہے اب شاویز کی باری ہے۔

اکیڈمی سے گیا وہ خالی ہاتھ تھا لیکن واپسی پر دائی ماں نے بیگ بھر کر اسے کرنل صادق اور ان کی فیملی اور ریحان سر کے لیے تحائف بھیجوائے تھے۔

اگلے دن کلاس لے کر اس نے صادق سر سے ان تحائف کا ذکر کیا۔

"کیا ضرورت تھی زبیدہ خالہ کو اتنی تکلف کرنے کی۔۔۔۔۔" انہوں نے ان کی مہربان نوازی پر مشکور ہوتے ہوئے کہا۔

"میں لے کر آتا ہوں سر۔۔۔۔۔" شاویز اپنے بیگ کے جانب بڑھنے لگا تھا تا کہ ان کے تحائف لا کر دے سکے۔

"شاویز۔۔۔۔۔ شام کو میرے ساتھ گھر چلنا۔۔۔۔۔ پھر سب کو ان کے تحائف خود پیش کرنا۔۔۔۔۔" صادق سر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ جاتے جاتے رک گیا اور چمکتے ہوئے سر اثابت میں ہلایا۔ اتنے مہینوں کے بعد صادق سر اب اسے اپنے گھر لے جائے گے؛ سوچ کر ہی وہ مسرور ہونے لگا۔ صادق سر کے جانے کے بعد وہ تیزی سے اپنے نئے کپڑے نکال کر تیاری کرنے لگا۔

باقی سب سا تھی جو اتنی سخت کلاس لے کر اپنے بستر پر نڈھال پڑے سستار ہے تھے شاویز کو اب بھی تروتازہ خوش باش دیکھ کر حسد اور جلن میں مبتلا ہونے لگے۔



کرنل صادق کا ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے تک شادویز نہا کر سفید قمیض شلوار پہنے چھوٹے بال ترتیب سے بنائے پالش کردہ بوٹ پہنے تیار ہو کر ہاتھوں میں تحائف کا بیگ پکڑے گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔

صادق سر اپنے ہم منصبوں سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ اسے سرتاپیر اتنا تیار دیکھ کر مسکرائے اور ساتھ لیے اپنی کار میں آکر بیٹھ گئے۔

کچھ مسافت کر کے وہ ایک چھوٹے نفیس سے گھر کے پورچ میں کار سے اترا۔ چھوٹا سالان رنگ بہ رنگی گلدان۔ سامنے لاونج کا دروازہ۔ صادق سر کے کار سے اترتے ہی ان کی 4 سالہ چھوٹی

بیٹی جولان میں سائیکل چلا رہی تھی؛ بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئی۔ صادق سر نے مسکرا کر اسے گود میں اٹھالیا۔ بچی نے ہاتھ بڑھا کر ان کی کیپ اتاری اور خود اپنے ننھے سے سر پر پہن لی۔

اس بچی کی آواز سن کر باقی دونوں بچے بھی لاؤنج میں آگئے۔ ان کے پیچھے صادق سر کی جوان خوب رویوی بھی آگئی تھی شاید صادق سر نے پہلے ہی انہیں شاویز کو ساتھ لانے کی اطلاع کر دی تھی۔

شاویز مسکراتا ہوا ان کے حرکات مشاہدہ کرتا لاؤنج میں داخل ہوا اور مسز نورین صادق کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیسے ہوشاویز۔۔۔۔۔ کب سے کہہ رہی تھی ان سے۔۔۔۔۔ تمہیں گھر لائے" انہوں نے اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے خوش آمدید کہا۔

"چلو بچوں۔۔۔۔۔ ادھر آکر شاویز بھائی کو سلام کرو۔۔۔۔۔" مسز نورین نے اپنے بچوں کو مخاطب کیا۔ وہ تینوں لائن سے آکر شاویز سے ہاتھ ملا کر مصافحہ کرنے لگے۔

سب سے مل لینے کے بعد وہ فیملی اور شاویز صوفے پر بیٹھ گئے۔ شاویز نے ساتھ ہی اپنے ہاتھ میں پکڑے تحائف مسز نورین کو پیش کئے۔ انہوں نے پُر تکلف ہو کر وہ سب تھامے اور شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا۔

بچے تو تحفے دیکھ کر دبی دبی خوشی سے چہک گئے تھے۔

"شاویز۔۔۔۔۔ رات کا کھانا کھا کر جانا۔۔۔۔۔" نورین نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

شاویز نے متذبذب ہو کر صادق سر کو دیکھا۔

"انہیں کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔۔۔ اکیڈمی میں بھلے ہی یہ کرنل ہے۔۔۔۔۔ لیکن گھر کی کرنل میں ہوں۔۔۔۔۔ جو میں نے کہہ دیا وہی ہوتا ہے۔۔۔" انہوں نے شرارتی انداز میں آبرو اچکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بلکل درست کہہ رہی ہے۔۔۔۔۔ بھئی ان کے آگے میری نہیں چلتی۔۔۔۔۔ تو تمہاری کیا
چلے گی۔۔۔۔۔ ڈنر کر کے جانا۔۔۔۔۔" شاویز پھر بھی منع کرنے لگا تھا پر صادق سر نے مداخلت
کر کے بیوی کی حمایت کرتے ہوئے کہا تو شاویز مستحکم بھرے انداز میں سر کو جنبش دیتا کھانے
پر رکنے کے لیے مان گیا۔

"مہی۔۔۔۔ میں شاویز بھائی کو اپنی ڈرائنگ دکھاؤں۔۔۔" ننھی مریم اپنی ڈرائنگ بک اٹھائے اس کے پاس آئی اور اسے اپنی ڈرائنگ دکھانے لگی۔

"یہ دیکھیں۔۔۔۔۔ یہ میں ہوں۔۔۔۔۔ یہ ڈیڈی ہے۔۔۔۔۔ یہ مُمی ہے۔۔۔۔۔ یہ کلثوم
آپی۔۔۔۔۔ اور یہ۔۔۔۔۔ کامران بھائی۔۔۔۔۔" مریم ایک ایک کر کے اپنے بنائے ہوئے
کرداروں پر انگلی رکھ کر شاویز کو بتا رہی تھی۔

مسز نورین کھانے کا اہتمام کرنے کچن میں جانے لگی تو صادق سر بھی وردی تبدیل کرنے اٹھے ہی تھے کہ کامران بھاگتا ہوا ان کے ایک بازو سے جھلنے لگا اور دوسرے بازو سے کلثوم۔

ننھی مریم بھی اچھلنے لگی تو صادق سر نے اسے گود میں اٹھالیا اور گول گول گھمنے لگے۔ تینوں بچیں اپنے والد کے ہمراہ خوشی سے ہنسنے لگے۔ شاویز ان کو دیکھتے ہوئے مسکرایا اور پھر اداس سا ہو گیا۔

اگر اس کے ماں باپ ساتھ ہوتے تو اس کی بھی ایسی ہنستی کھلتی فیملی ہوتی۔ اس نے پھیکا مسکراتے ہوئے سوچا

سر کے بازوؤں سے اتارا اور مریم کو اپنی گود میں لے لیا۔ ممی کے جھڑکنے پر کامران اور کلثوم تمیز سے صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔ صادق سراپے بیڈروم میں چلے گئے۔ جبکہ نورین ننھی مریم کو ساتھ کچن میں لے گئی۔

رشتے میں کرنل صادق غفار اور ان کی بیگم نورین کزنز بھی تھے۔ صادق سر کے والدین پنجاب میں قیام پذیر تھے۔ ان کے والد پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ ان کے بڑے بھائی بھی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ بہنیں بھی اچھی جگہوں پر شادی شدہ تھیں اور خود وہ کرنل کے عہدے پر تھے۔



صادق سر کے گھر سے آکر وہ بہت ادا اس ہو گیا تھا۔ حالانکہ مسز زورین اور بچوں نے اس کی کافی خیر مقدمی کی تھی۔ اس کے ساتھ الگ الگ گیمرز کھیلے۔ بھرپور مزے مزے کا کھانا کھلایا لیکن اپنی فیملی ہونے کی خواہش امڑا مڑا کر اس کے دل کو غمزہ کر رہی تھی۔ اس کے بھی ماں باپ ہوتے بہن بھائی ہوتے۔ اور نہ صحیح تو کم از کم اس کی ماں ہی زندہ ہوتی۔

وہ اسی طرح بغیر کپڑے تبدیل کئے ہی افسردہ دل سے بستر میں آکر لیٹ گیا۔

وہ مسلسل اپنے جذبات قابو کرتا۔ اپنے آنسو پیتا آنکھیں منبھوٹی سے بند کئے لیٹا رہا۔ اپنی ماں زرتاج کو یاد کرتے ہوئے اور ان کو چہننے والے دلاور پرویز خان کو نفرت سے یاد کرتے ہوئے وہ تیز تیز سانس لیتا رہا اور اسی اثناء میں سو گیا تھا۔

وہی دوسری جانب کبیر کو جب معلوم ہوا کہ کرنل صادق شاوینز کو اپنے گھر مدعو کر کے لے گئے ہیں تو وہ جل بھن سا گیا۔ آج تک صادق سر کبھی کسی سٹوڈنٹ کو اپنے گھر نہیں لے کر گئے

تھے پھر شاویز کو ہی کیوں سوچتے ہوئے اسے شاویز سے شدید نفرت ہونے لگی۔ اس نے شاویز کو سبق سکھانے کا منصوبہ سوچ لیا تھا۔

سوتے سوتے آخری پہر اس کی ڈر کے مارے نیند کھل گئی۔ وہ کوئی بہت خوفناک خواب دیکھتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر آس پاس دیکھا سب لڑکے گہری نیند سو رہے تھے۔ ابھی رات کافی باقی تھی۔ وہ اپنے اوپر کلمہ پڑھ پھونک کر واپس سو گیا۔



15 سالہ شاویز کرنل صادق کا تو پسندیدہ تھا ہی اب کھیل کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھا کر ریحان سر کو امپریس کر رہا تھا۔

اسد ساڑھے 17 سال کا ہو کر اب ان کے گروپ سے الگ ہو گیا تھا وہ 19 uner کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا۔ شاویز کا باقی ساتھیوں میں کسی سے کوئی دوستی نہیں ہو سکی تھی وہ سب کبیر کے ساتھی تھے۔

اس دن صبح ناشتے کے بعد سے ہی شاویز کو اپنی طبیعت ناساز لگ رہی تھی۔ اس سے فٹبال کھیلا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں شدید درد ہو رہا تھا۔ ریحان سرنے اسے کواٹر میں جا کر آرام کرنے کی تجویز دی۔

وہ اپنے بستر پر پیٹ کے بل آکر لیٹ گیا۔ اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا لیکن چکر آنے کے باعث واپس لیٹ جاتا۔

اسی کشمکش سے دو چار ہوتے شاویز کو اپنے پیٹھ پر کسی وزنی چیز کا پڑنا محسوس ہوا اس نے کراہتے ہوئے رخ پیچے موڑ کر دُکھتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ کبیر استخز یہ ہنستے ہوئے حقارت بھری

نگاہوں سے اسے گھورتے اس کی پیٹھ پر چڑھ کر بیٹھا تھا۔ شاویز نے ہلنے کی کوشش کر کے اسے خود سے ہٹانے کے جتن کئے لیکن پیٹ درد سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"صادق سر اور ریحان سر۔۔۔ دونوں کا favourite بنا ہوا ہے یہ۔۔۔۔۔ میں 1 سال سے ان کا پسندیدہ بننے کے لیے دن رات جی جان لگا رہا ہوں۔۔۔۔۔ اور یہ آتے ہی ان کا ٹاپ سٹوڈنٹ بن بیٹھا۔۔۔۔۔" اتنے کہتے ساتھ کبر طیش میں آگیا اور شاویز کے دونوں ہاتھ پکڑ کے اپنے طرف کھینچنے لگا۔ پیٹ درد کے ساتھ اب کندھوں میں اٹھتی ٹیسیں۔ شاویز بری طرح جھلملا گیا۔ اپنی پوری قوت سے وہ خود کو آزاد کروانے کی کوشش کرنے لگا لیکن چکراتے سر کی وجہ سے اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

وہ اپنی پوری قوت سے دھاڑنے لگا۔ اس کی چیخوں سے گڑبڑا کر کبیر نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور اس پر سے نیچے اترا۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور اپنے کندھے سے ہلاتا ہوا اسے مارنے لگا تھا کہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

"ابھے۔۔۔۔۔ یہ کیسے نشے کی دوائی لایا تھا تو۔۔۔۔۔ اس پر تو اثر ہی نہیں ہوا۔۔۔۔۔ ابھی تک ہوش میں ہے۔۔۔۔۔" کبیر نے غصہ میں اپنے دوست کو زور سے دھکا دے مارا۔

تو اس نے مجھے نشے کی دوا دی ہے جس سے میری طبیعت خراب ہو رہی ہے؛ سوچتے ہوئے شاویز تیزی سے واشروم میں بھاگا اور سنک پر جھک کر حلق میں انگلی ڈال کر الٹی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ الٹی تو نہ ہوئی لیکن چکر آنے کی مقدار مزید تیز ہوتی گئی۔ اس کا اکلوتا خیر خواہ اسد بھی اب اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ ان سب کے مقابلے اکیلا تھا۔ اگر وہ یہاں گر پڑا تو کبیر اس کا گلا گھونٹ کر سچ میں اسے یہی مار دے گا سوچتے ہی وہ لڑکھڑاتا ہوا زبردستی خود کو

ہوش میں رکھنے کی کوشش کرتا کرتا اٹھتا ہال سے نکل کر والی بال گروانڈ کی جانب بڑھ گیا جہاں ریحان سرانڈر 19 سٹوڈنٹس کا میچ کروا رہے تھے۔ پیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے شاویز گروانڈ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس کی ہمت ختم ہو گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

"ریحان سرانڈر۔۔۔۔۔" اس نے بچی بچی طاقت ریحان احمد کو بلند آواز میں مخاطب کرنے میں لگا دی۔

سر جیسے ہی اس کی آواز پر پلٹے تھے وہ بے ہوش ہو گیا اور زمین پر گر پڑا۔ اس کے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

ریحان احمد، شاویز کی آواز پر تعجبی انداز میں مڑے کہ ٹھٹک گئے۔ بھاگتے ہوئے شاویز کے پاس آئے۔ اس کو سیدھا کیا اور کندھوں سے جھنجوڑا لیکن وہ بے حس و حرکت تھا۔ سر پھرتی سے اسے بازوؤں میں اٹھا کر میڈیکل کیمپ کے جانب بھاگے۔



جب شاویز کی آنکھ کھلی۔ اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے پہلو میں صادق سر کو متفکر انداز میں بیٹھے پایا۔ ہفتہ اور اتوار ان کی چھٹی ہوتی ہے تو یقیناً ریحان سر نے انہیں شاویز کے بے ہوش ہونے کی اطلاع دی تھی اور وہ فوراً اسے گھر کے کپڑوں میں ہی آگئے تھے۔

ڈاکٹر نے اس کا معدہ واش کروایا اور کچھ دوائیاں دے کر رخصت کر دیا۔ میڈیکل کیمپ سے اپنے کواٹر تک واپسی وہ صادق سر کے ساتھ آیا تھا۔ ایک جگہ وہ رک گیا تو صادق سر بھی رک گئے اور سنجیدہ تاثرات بنائے اسے دیکھنے لگے۔

"سر۔۔۔۔ کبیر مجھے بہت تنگ کرتا ہے۔۔۔۔۔ میرے ناشتے میں نشے کی دوا بھی اس نے ملائی تھی۔۔۔۔۔" اس نے بھی اسی سنجیدہ انداز میں صادق سر کو اپنے ساتھ ہوئے سب ٹارچرز کے متعلق بتایا۔

"جانتا ہوں۔۔۔۔۔" اس کے انکشاف پر صادق سر بے تاثر رہے تھے جبکہ صادق سر کے انکشاف پر شاویز کا رنگ فق سے اڑ گیا تھا۔

وہ شاک کے عالم میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

صادق سر نے شاویز کو حیران پریشان خود کو بغور دیکھتے ہوئے پایا تو اس کے پاس آئے۔ اس کا بازو تھام کر اپنے ساتھ بیچ پر بیٹھایا۔ سر سامنے دیکھنے لگے اور شاویز مسلسل بے یقینی سے صادق سر کو۔

اسے یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ کبیر کے خلاف ایکشن نہیں لیں رہے تھے۔

صادق سرگلا صاف کرتے ہوئے نرمی سے اس سے گویا ہوئے۔

"دیکھو شاویز۔۔۔ ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔۔۔ ایک منفی۔۔۔ ایک مثبت۔۔۔" انہوں نے ایک کے بعد دوسری انگلی اٹھائی۔

"تم کبیر کے ٹارچر کا منفی پہلو دیکھ رہے ہو۔۔۔۔۔ اور میں مثبت ڈونڈھ رہا ہوں۔۔۔۔۔" وہ نرمی سے مسکرائے۔

"اب تم سوچ رہے ہو گے۔۔۔۔۔ کسی کو تنگ کرنے میں مثبت کیا ہو گا۔۔۔۔۔" صادق سر نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا وہ اب بھی خاموشی سے ان پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"جب کبیر تمہیں تنگ کرتا ہے تو میں یہ دیکھتا ہوں تم کیار د عمل دیکھاو گے۔۔۔۔۔" اب وہ قدرے سنجیدہ ہو گئے۔

"صرف فزیکلی مضبوط بننا ہی ایک کامیاب فوجی بننے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ ذہنی طور پر بھی طاقتور ہونا چاہیے۔۔۔۔۔" صادق سراب بالکل اس کی آنکھوں میں دیکھ کر گفتگو کر رہے تھے۔

"ذہین تو تم ہو۔۔۔۔۔ no doubt۔۔۔۔۔ لیکن کب کس بات پر؛ کس عمل پر کیا رد عمل دینا ہے۔۔۔۔۔ یہ تمہاری ذہنی طاقت فیصلہ کرتی ہے۔۔۔۔۔ کبیر کے ٹارچرز۔۔۔۔۔ تمہیں مینٹلی توانا بنانا ہے ہیں۔۔۔۔۔ اگر تم مثبت انداز میں سوچو تو۔۔۔۔۔" وہ اب شاویز کو اس کے اصل طاقت سے روشناس کروا رہے تھے۔

"سوچو۔۔۔۔۔ جب تم کراچی میں تھے۔۔۔۔۔ کوئی تم سے الٹی بات بھی کہہ دیتا تم اسے مارنے پر اتر جاتے۔۔۔۔۔ اتنا غصہ تھا کہ مجھے امپریس کرنے پر فلیڈا پانی خود پر ڈال دیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن اب تم کافی حد تک اپنے غصے کو قابو کرنا سیکھ گئے ہو۔۔۔۔۔" ان کی باتیں سنتے سنتے شاویز کو واقعی احساس ہوا وہ اب ہر چھوٹی چھوٹی چیز پر ہاتھ پائی پر نہیں اترتا۔

"میں اسی لیے کبیر کے ہر عمل پر خاموش تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ میں تمہیں صرف جسمانی لحاظ سے نہیں ذہنی طور پر بھی مضبوط بنانا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ میں نے کبیر کے خلاف اسی لیے ایکشن نہیں لیا کیونکہ میں چاہتا تھا۔۔۔۔۔ تمہاری برداشت کرنے کی پاور بڑھے۔۔۔۔۔ تم میں حوصلہ پیدا ہو۔۔۔۔۔" آخری فقرے پر صادق سر پھر سے نرمی سے مسکرائے۔

”ابھی تو آگے بہت سخت مراحل پیش آئے گے۔۔۔۔۔ یہ تو صرف شروعات ہے۔۔۔۔۔

مین فیز میں تو اچھے اچھو کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔۔۔۔۔ تمہیں بہت حوصلہ مند بننا

ہے۔۔۔۔۔ شاہ سوار کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ "صادق سر نے اس کے کندھے کو

تھکتے ہوئے کہا۔ اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔

شاویز ان کی باتوں پر خوش دلی سے مسکرایا۔

"زندگی کسی کے لیے بھی اتنی سیدھی اور آسان نہیں ہے۔۔۔۔۔ ہر قدم پر کسی نہ کسی

مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ کبھی اس مشکل کا حل ہمارے پاس ہوتا ہے تو کبھی نہیں

ہوتا۔۔۔۔۔ کامیاب انسان بننے کے لیے مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ صابر اور برداشت

کرنے والا بھی بننا پڑتا ہے۔۔۔۔۔" صادق سر ایک زمرہ دار سر پرست کی طرح اسے سمجھا

رہے تھے اور شاویز خاموشی سے کان لگا کر ان کی ساری نصیحت پر غور کر رہا تھا۔

"کبیر کی شرارتوں کا مجھے اندازہ تو تھا لیکن۔۔۔۔۔ تم سے حسد میں وہ اس حد تک گر جائے گا۔۔۔۔۔ یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔۔۔ اس بات کے لیے تو ایکشن لینا ہی چاہیے۔۔۔" کرنل صادق تند تاثرات بناتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ انہیں کبیر کا شاویز کو نشہ آور شے دینے پر غصہ آرہا تھا۔

"نہیں سر۔۔۔۔۔ آپ کوئی ایکشن نہیں لیں گے۔۔۔۔۔ اب کبیر کے ہرٹا چر کا جواب میری برداشت دے گی۔۔۔۔۔ اسے مجھے جتنا distract موقف سے پھیرنا) کرنا ہے۔۔۔۔۔ کر لیں۔۔۔۔۔ میں کوئی رد عمل نہیں دکھاؤں گا۔۔۔۔۔ مجھے حوصلہ مند جوان بننا ہے۔۔۔۔۔" شاویز نے پر عزم انداز میں سر کو کوئی بھی ایکشن لینے سے روکا۔ انہوں نے اس کی غیرت مند ارادے پر فخر محسوس کرتے ہوئے شاویز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دباؤ دیا۔

"یہ ہوئی نابات۔۔۔۔ that's the spirit۔۔۔۔" اس کو داد دیتے ہوئے وہ شاویز کو آرام کرنے کی ہدایت دے کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

شاویز کو اڑ میں واپس آیا تو اس نے کبیر کو اضطراب میں دائیں سے بائیں چکر کاٹتے پایا۔ اسے لگا ہو گا شاویز کرنل صادق کو ساتھ لا کر اسے سزا دلوائے گا لیکن وہ کبیر کو نرمی سے مسکراہٹ سپرد کرتے اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔

کبیر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اس کے اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی شاویز اتنا نارمل برتاؤ کر رہا تھا کہ اندر ہی اندر کبیر کو اپنے کئے پر ندامت کا احساس ہوا۔ وہ سر جھکا کر شاویز کو آرام کرنے چھوڑ کر ہال سے باہر نکل گیا۔



16 سال سے شادیز کی مین ٹریننگ شروع ہو گئی۔ وہ اپنے مارشل آرٹس کے ساتھ ساتھ آرمی ٹریننگ پر آگیا۔ وہ صبح فجر کے بعد گراؤنڈ میں دوڑ لگاتا۔ پھر کچی زمین میں خاردار تاروں کے نیچے رینگتے ہوئے گزرتا۔ رسی پر چڑھتا۔ دیوار پھلانگتا۔ ٹھنڈے پانی کے تالاب میں تیراکی کرتا۔ اور بھی ایسے بہت کرتے تھے جو وہ صادق سر کے زیر نگرانی سرانجام دیتا رہتا۔ اکثر و بیشتر وہ مسز نورین کے اصرار پر ان کے گھر بھی چلا جایا کرتا۔

سپورٹس میں بھی اس نے کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔

اس دن کے بعد سے کبیر نے اسے تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب ان سب گروپ کا دوست بن گیا تھا۔

دائی ماں سے اس کی ہفتہ وار کال پر بات ہو جایا کرتی۔

ہر مرحلے کے ساتھ ٹریننگ مشکل ترین ہو جاتی لیکن وہ بنا تھکے ہارے اپنی محنت جاری رکھتا۔
 قد تو اس کا پہلے بھی لمبا تھا اب ایک فوجی جوان کی مانند اس کی باڈی بھی بن گئی تھی۔ شانے
 چھوڑے سینہ تھانے۔ ڈٹی آواز کے ساتھ وہ دن بہ دن ہینڈ سم نو جوان بننے کی راہ پر گامزن
 تھا۔



17 سال کا ہونے تک اس کا یہی معمول رہا اور پھر اس کا مینی ٹیسٹ (چھوٹا امتحان) ہونا تھا۔
 شاویز کے بشمول اس کے اکیڈمی سے 10 سٹوڈنٹس نے ٹیسٹ میں شرکت کی۔ ایک کھلے
 سٹیڈیم میں ان کو الگ الگ طریقوں سے آزمایا جانا تھا۔ پنجاب سندھ اور خیبر پختون خوا سے بھی

ٹیسٹ کا آغاز مارشل آرٹس کے کرتب سے کیا گیا۔ پھر سب امیدواروں کے درمیان دوڑ کروائی گئی۔ ایسے ہی سومنگ مقابلہ۔ فٹبال مقابلہ اور کچھ سولو مقابلے کروائے گئے۔ ہر مقابلہ کی آخر میں ایک ایک امیدوار جسکے سب سے کم پوائنٹس ہوتے مقابلے سے خارج کر دیا جاتا۔ تین دن پر مشتمل اس مقابلے کے ہر حصے میں شاویز پہلے یا دوسرے نمبر پر ضرور ہوتا۔ آخر میں بلوچستان کی نمائندگی کرتا شاویز اور پنجاب کی نمائندگی کرتا امیدوار میدان میں باقی رہے۔

ان کے بیچ ایک آخری مقابلہ کیا جانا تھا۔ جو کہ اکیڈمی کے مین فینر سے مماثلت میں تھا۔ ان کو تمام رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے سٹیڈیم کے مضافات کا دورہ کرتے ہوئے واپس سٹیڈیم کی

سرخ لائن تک رسائی حاصل کرنی تھی۔ جس نے سب سے پہلے سرخ لائن عبور کیا وہ جیتنے والا اعلان کر دیا جاتا۔

پسٹل کے فائر کے ساتھ آخری مقابلے کا آغاز ہوا۔ اس دن سٹیڈیم ہجوم سے بھرا ہوا تھا۔ شاویز کے اکیڈمی کے سب آفسران اس کی جیت کی دعائیں کرتے انگشت بہ دندان بیٹھے تھے۔ دوڑ کے دوران انہیں بیچ میں ڈالے جانے والے خلل کو پار کرنا تھا۔ اسی کے چلتے شاویز کی تیز نظریں سامنے آنے والی رکاوٹ کے سپیڈ اور اسے پار کرنے کے اندازے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ پھرتی سے سب رکاوٹیں پار کرتا بل مقابل امیدوار سے آگے نکل گیا۔

ایک جگہ انہیں پہاڑی کے اوپر سے چڑھ کر بھاگنا تھا جہاں سامنے سے جعلی چٹانوں کو ان کا رکاوٹ بنانے گرایا گیا۔ شاویز تو چٹان کی سپیڈ کیلکولیٹ کرتا ہوا ہلکا سا سائیڈ پر ہو گیا اور چٹان اس کے ساتھ سے گزرتے ہوئے نیچے لڑھکنے لگا پر دوسرا امیدوار جب تک خود کو چست کر پاتا نقلی چٹان اس سے ٹکرایا اور وہ ڈگمگا گیا۔ سٹیڈیم میں موجود تماشاویوں میں چیخ و پکار گونج اٹھی۔

شاویز نے خطرے کا احساس کرتے ہوئے رخ موڑ کر دیکھا تو اس لڑکے کو تشویشناک حالت میں پہاڑی کا حصہ پکڑے جھلتا ہوا پایا۔ حالانکہ شاویز چوٹی پر پہنچنے کے بہت قریب تھا لیکن اس لڑکے کی مدد کرنے اس کی جان بچانے وہ اُلٹے قدم نیچے آیا اور تیزی سے جھک کر اس لڑکے کا ہاتھ چھوٹنے سے پہلے دبوج لیا۔ تماشائیوں میں شاویز کی دلیری پر تالیاں گونج اٹھی۔ سب ان دونوں لڑکوں کو سر اہنے بلند آواز ہو کر داد دینے لگے تھے۔ شاویز نے اس لڑکے کو نا صرف اوپر کرنے میں مدد کی بلکہ ہاتھ پکڑے اسے دوڑاتا ہوا چوٹی کے سرے تک لے آیا اور پھر واپس مقابلہ جاری رکھنے کے انداز سے پیشانی پر ہاتھ ہلاتا ہوا اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے منزل مقصود کو بھاگنے لگا۔

سب سے پہلے اور سب سے کم وقت میں سٹیڈیم واپس پہنچ کر اس نے نیاریکارڈ قائم کیا اور مقابلے کی جیت اپنے نام کی۔ انعام کے طور پر اسے گولڈ میڈل اور کچھ نقدی رقم سے نوازا گیا۔

ساتھ ساتھ ISPR کی جانب سے اس کی بقایا ٹریننگ اور پڑھائی کے اخراجات فری کرنے کا حکم صادر ہوا۔ ان کی اکیڈمی اور شاویز کے ٹرینرز کرنل صادق اور کوچ ریحان کو بھی انعامات پیش کئے گئے۔

اس دن شاویز کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان سب کی جیت کی خوشی میں آرمی جنرل نے رات کے کھانے میں اسپیشل بریانی اور قورمہ تیار کروانے کا آرڈر دیا اور سب کو بغیر ناپ تول پیٹ بھر کر کھانے کی اجازت دی۔

"تم نے میرا سر آج فخر سے اونچا کر دیا۔۔۔۔۔ آج مجھے تمہیں ساتھ لانے کے فیصلے پر زرا بھی پچھتاوا نہیں ہے۔۔۔۔۔ تم نے ثابت کر دیا۔۔۔۔۔ سچے دل سے کچھ ٹھان لو تو پا کر ہی

رہتے ہو۔۔۔۔۔ بہت بہت مبارک ہو۔۔۔۔۔ تم واقعی شاہ سوار ہو۔۔۔۔۔ "کرنل صادق نے اسے سراہتے ہوئے مبارکباد پیش کی۔

شاویز جانتا تھا وہ کس بات پر اسے شاہ سوار بلارہے تھے۔ اس کے مقابلہ جیتنے سے زیادہ انہیں شاویز کے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔



اگلے ماہ 12 جماعت کے بورڈ امتحانات متوقع تھے۔ وہ پھر سے دن بھر ٹریننگ کرتا اور رات بھر پڑھائی۔ نیند پر پورا غلبہ حاصل کر کے خود کو کئی رات جاگے رکھنا بھی اس کے معمول کا حصہ بن گیا تھا۔

اکیڈمی میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئی اور ساتھ ہی کالج کے امتحانات کا وقت ہوا جاتا تھا۔ وہ بھی اپنے کالج ایگزیمینر دینے کراچی کے سفر پر چل پڑا۔ اس مرتبہ وہ یہاں سے خالی ہاتھ نہیں گیا۔ مسز نورین نے دائی ماں کے لیے اس کے ہاتھ تحائف بھیجوائے تھے۔

یتیم خانے پہنچ کر شاویز نے دائی ماں کو سر پر انز دیا اور اس سے بھی بڑا سر پر انز اپنا گولڈ میڈل دکھا کر کیا۔ دائی ماں کی خوشی سے آنکھیں بھر آ گئی تھی وہ اس کی بلائیں لیتے ہوئے اسے دعائیں دینے لگی۔

انعام کی نقدی رقم اس نے دائی ماں کو تھما دیئے۔

"شاویز۔۔۔۔۔ اب رک جا۔۔۔۔۔ کتنی تربیت کرے گا۔۔۔۔۔ اتنے سال ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ دیکھ اتنا لمبا چوڑا تو ہو گیا ہے۔۔۔۔۔" دائی ماں نے جذباتی ہو کر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"دائی ماں ابھی کچھ سال رہتے ہیں۔۔۔۔۔ آخری فیز تو اب شروع ہو گا۔۔۔۔۔ وہ سیکھے بغیر تو میری ساری ٹریننگ نامکمل ہے۔۔۔۔۔" شاویز نے انہیں دلا سہ دیتے ہوئے کہا۔

امتحانات دینے کے ساتھ ساتھ وہ فارغ وقت میں یتیم خانے کے بچے بچیوں کو مارشل آرٹس کے self defence کے کرتب سکھاتا رہتا۔

"یہ دیکھو۔۔۔۔۔ یہ یہاں لڑائی کے طریقے سیکھ رہی ہیں۔۔۔۔۔ اور میں سلائی کڑہاؤ
سیکھنے بیٹھاؤں۔۔۔۔۔ تو سب کے منہ اترے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔" دائی ماں تند و تیز آواز میں
بچیوں کو ڈانٹنے لگی۔

"دائی ماں۔۔۔۔۔ کس زمانے میں جی رہی ہو۔۔۔۔۔ آج کل تو لڑکیاں بھی فوج میں جاتی
ہے۔۔۔۔۔ اب کوئی بھی لڑکی صرف کڑہائی سلائی تک محدود نہیں رہی۔۔۔۔۔ اور میرے
خیال میں تو آج کل کے حالات میں ہر بچی کو؛ لڑکیوں کو اپنے دفاع کے لیے فائٹنگ آئی
چاہیے۔۔۔۔۔" شاویز نے کندھوں سے زبیدہ خالہ کو تھام کر اپنے سامنے کرسی پر بیٹھایا۔

"تیرے ادارے میں بھی لڑکیاں ہیں۔۔۔۔۔" دائی ماں نے گھورتے ہوئے سوال پوچھا۔

"اس سال سے آنا شروع ہو جائے گی۔۔۔۔" شاویز نے باقیوں کو رخصت ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ شاویز۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔ تیری کسی لڑکی سے دوستی ہے۔۔۔۔ تو مجھے اس کا نام اور پتہ بتادے۔۔۔۔ میں سیدھے سادھے تیری اس سے شادی کرادوں گی۔۔۔۔ بس یہ دوستی دوستی والے جھنجٹ مجھے نہیں پسند۔۔۔۔" دائی ماں نے منہ بھسورتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اسے تنبیہ کیا۔

"ہا ہا ہا۔۔۔۔ خدا کو مانو دائی ماں۔۔۔۔ میں ابھی تک 18 کا بھی نہیں ہوا۔۔۔۔ اور تم میری شادی کرارہی ہو۔۔۔۔" شاویز پورا کھکھلا کر ہنسا لیکن زبیدہ خالہ اب بھی سنجیدہ انداز میں بیٹھی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے دائی ماں۔۔۔۔ جب تک میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جاؤں۔۔۔۔ کسی لڑکی وڑکی کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔۔۔۔" شاویز نے دائی ماں کا موڈ ٹھیک کرنے ان کے کندھے کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے کہا۔
وہ اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر پیار کر کے کھانا لگانے باورچی خانے میں چلی گئی۔

شاویز ہاتھ دھو کر اکیڈمی جیسے اپنا پلیٹ لیئے دائی ماں کے سامنے آیا تو دائی ماں نے مسکرا کر اس کے پلیٹ میں سالن ڈال کر دیا۔

وہ وہی باورچی خانے کے فرش پر ہی بیٹھ کر کھانے لگا جیسے بچپن میں زر تاج کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔

"مزا آگیا دائی ماں۔۔۔ آپ کے ہاتھ کی سبزی کھا کر تو۔۔۔ ماں کی یاد آگئی۔۔۔۔۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایسا ہی ذائقہ تھا۔۔۔۔۔" اس نے نوالہ چھباتے ہوئے کہا۔ آخری جملہ کہتے ہوئے وہ مایوس ہو گیا۔

اس کی آواز سے چھلکتی افسردگی زبیدہ خالہ نے محسوس کر لی۔ وہ اس کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔

"ہاں تو یاد تو آئے گی۔۔۔ میں نے ہی تو اسے کھانا پکانا سیکھا یا تھا۔۔۔۔۔ اسے کہاں کھانا پکانا آتا تھا۔۔۔۔۔ سب مجھ سے ہی تو سیکھا تھا۔۔۔۔۔ پھر ایک جیسا ذائقہ تو ہو گا ہی۔۔۔۔۔" دائی ماں نے اس کی مایوسی کم کرنے کی کوشش کی۔

"ماں زندہ ہوتی۔۔۔۔۔ تو آج میرا گولڈ میڈل دیکھ کر کتنا خوش ہوتی۔۔۔۔۔" اس نے پھیکا پھیکا مسکرا کر سر جھٹکا۔ اس کی بھوک یک دم ختم ہو گئی تھی۔

"تم خوش ہونا۔۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے اس کا رخ اپنے جانب کیا۔ شاویز ان کا جھریوں بھرا چہرہ دیکھ کر مسکرایا اور سر کو اثابت میں جنبش دیا۔

"تو وہ بھی بہت خوش ہوتی۔۔۔۔۔ تم دونوں کی جان تو ایک دوسرے میں بستی تھی۔۔۔۔۔ مجھے تو آج بھی تم میں زرتاج کی جھلک نظر آتی ہے۔۔۔۔۔" دائی ماں نے اس کے پیشانی پر بوسہ دیا اور کھانا کھانے کی تائید کرتے ہوئے واپس اپنے کام میں جٹ گئی۔

شاویز کا دل تو نہیں کر رہا تھا لیکن دائی ماں کے خاطر اس نے زبردستی کھانا پورا کھالیا۔



اس رات وہ کافی دیر تک دائی ماں سے باتیں کرنے لگا رہا۔ باتوں باتوں میں اس نے وہ کچھ سال پہلے کی دائی ماں سے چھپائی ہوئی تصویریں انہیں دیکھائی۔ وہ اس وقت کو یاد کرتے کرتے کہی کھوسی گئی۔ پھر وہ ایک ایک کر کے ٹین ایجنزرتاج اور اس کی باقی ساتھی لڑکیوں کے نام بتانے لگی۔

شاویز اب بغور ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ ان گرلز گروپ کے پیچے چند جوان لڑکے بھی کھڑے تھے۔ دائی ماں نے دو تین کے نام بتائے لیکن ایک پر ان کے تاثرات بدل گئے۔

"کیا ہوا دائی ماں۔۔۔۔۔ کون ہے یہ۔۔۔۔۔" شاویز نے تجسس سے اس جوان خوب رومرد کو تکتے ہوئے پوچھا۔

"یہ یہاں انگریزی پڑھانے آتے تھے۔۔۔۔۔ نام یاد نہیں آرہا۔۔۔۔۔ کافی پرانی تصویر ہے۔۔۔۔۔ چل اب مجھے نیند آرہی ہے۔۔۔۔۔ تو بھی جا کر سو جا۔۔۔" دائی ماں نے جھجکتے ہوئے رخ پھیر لیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

شاویز تعجب سے ان کی پیٹھ دیکھتا ہوا اٹھا اور خاموشی سے باہر آگیا۔

"کچھ تو تھا۔۔۔۔۔ جو دائی ماں اچانک پریشان ہو گئی۔۔۔" شاویز نے سحن میں چاندنی رات میں چارپائی پر لیٹتے ہوئے سوچا۔

وہ چت لیٹا بازو سر کے نیچے رکھے آسمان میں چمکتے چاند اور تاروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی پھر تیلے انداز اور تیز نظروں نے یہ جانچ لیا کہ دائی ماں متذبذب سی ہو گئی تھی مگر کیوں؛ سوچتے ہوئے اس نے کروٹ پر کروٹ بدلتے رات گزاری۔

اکثر و بیشتر راتوں کو جاگتے رہنے سے اب اس کی نیند بالکل ختم ہو گئی تھی اب وہ کسی رات از خود سونا چاہتا بھی تو اسے نیند نہیں آتی۔

ایک ایک کر کے سب کو ایک دائرے کے اندر کھڑا کر کے ان کے پیٹھ پر ہنٹر سے ضرب کیا جاتا تا کہ وہ مار اور ضربیں سہنے کے قابل بنے۔ باقی سب جلدی نڈھال پڑ جاتے جبکہ شاویز ہر ٹریننگ میں سب سے زیادہ وقت سبق برداشت کر پاتا۔

ایسے اور بھی کئی سارے آپسی مقابلے ہوتے کبھی جسمانی اور کبھی ذہنی جوان نوجوانوں کو مضبوط اور توانا بنارہے ہوتے تھے۔

انڈر 19 میں آکر شاویز قدرے سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ہر وقت کچھ نا کچھ سوچتا رہتا اور صرف اپنی ٹریننگ کرتا۔

ایک دن اس کے اس رویے کے چلتے صادق سرنے اسے اپنے پاس روک لیا۔

"میں جانتا ہوں شاویز۔۔۔۔ اس ٹریننگ کا تمہارا مقصد کچھ اور ہی ہے۔۔۔ تمہارے اندر کی آگ دن بہ دن بھڑکتی جا رہی ہے۔۔۔" صادق صاحب نے سنجیدہ تاثرات سے کہا۔

وہ خاموش رہا تو صادق سر سر دسانس خارج کر کے پھر سے گویا ہوئے۔

"وہ رب پروردگار۔۔۔۔۔ اس سے کبھی کچھ نہیں چھپا۔۔۔۔۔ اور اس کے بارگاہ میں ہر عمل کی پکڑ ہوتی ہے۔۔۔۔۔" انہوں نے نرمی سے کہتے ہوئے شاوینز کے کندھے کے گرد بازو مائل کیا۔

"کبھی ایسا کچھ مت کرنا شاویز۔۔۔۔۔ جس سے اس دنیا میں بھلے ہی تم بچ جاو۔۔۔۔۔ لیکن روز قیامت تمہیں اللہ سبحان تعالیٰ کی پکڑ سے کوئی ٹریننگ کوئی ذہانت اور کوئی صلاحیت تمہیں نہ بچا سکیں۔۔۔۔۔" شاویز نے افسردہ انداز میں ان کی جانب دیکھا وہ متفکر تاثرات بنائے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ صادق صاحب کی باتوں میں فکر مندی صاف چھلک رہی تھی۔

ایک سال پہلے تک جس کی کفالت کی۔ اپنے ذمہ داری پر جیسے توانا اور مضبوط بنایا۔ اب صادق سر نہیں چاہتے تھے کہ وہ غلط راہ پر چل پڑے۔ اب وہ نہیں چاہتے تھے شاویز اپنی صلاحیتوں کو غلط کاموں میں صرف کریں۔

شاویز نے لمبی سانس لیتے ہوئے خود کو نارمل کیا۔

"Don't worry سر----- میں آپ کو کبھی جو دسے نا امید اور بد گمان نہیں کروں گا۔۔۔۔۔ آپ کی ساری تعلیمات مجھے یاد ہے اور ہمیشہ رہیں گی۔۔۔۔۔ میں کبھی کسی کو ناحق نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔۔۔ کسی کو بے وجہ نہیں ماروں گا۔" شاویز نے ان کے گلے مل کر انہیں یقین دہانی کروائی۔ ان کے اعتماد کو کبھی نہ توڑنے کا وعدہ کیا۔

اس کی باتوں سے مطمئن ہو کر صادق سر نے منظوطی سے اسے اپنے حصار میں لیا اور اسے کامیابیوں کی بلندیوں کو چھونے کی دعائیں دی۔



20 سال کا ہونے تک اس کی بے خوابی کی کیفیت اور شب بیداری سے بڑھتے سر درد نے اس کو کافی پریشان کر رکھا تھا۔ اور کسی رات وہ سو بھی جاتا تو ڈراؤنے خوابوں کی وجہ سے وہ پورا دن

اضطراب میں رہتا۔ اس سے نہ پڑھائی پر توجہ دی جا رہی تھی اور نہ پریکٹس پر۔ اگلے ماہ سے اس کی armed ٹریننگ شروع ہونی تھی جس میں اسے مختلف اقسام کے ہتھیار چلانا سیکھنا تھا اس لیے وہ خود کو تندرست رکھنا چاہتا تھا؛ سوچتے ہوئے وہ دو دن کے لیے کراچی گیا اور صادق سر کے بتائے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کروانے چلا گیا۔

سارا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے اسے انسومینیا (insomnia) کا شکار ہونا بتایا جس کی وجہ سے نیند نہ لینے اور ہر وقت ٹینشن میں رہنے سے اس کے سر کے آخری حصے میں درد رہتا ہے اور اس درد کی قسم کو مانگرین کا نام دیا گیا۔

ابھی اس کے تعطیلات نہیں تھے اور ایسے اچانک یتیم خانے جا کر وہ بوڑھی دائی ماں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ ان سے ملے بنا ہی صبح کی ٹرین سے واپس بلوچستان آ گیا تھا۔

صادق سر کو اس نے صرف ٹینشن کا بتایا۔ باقی انسو منیا اور مانگمرین کی بات اپنے دل میں راز رکھ لی تھی۔



ایک سال تک armed ٹریننگ میں اس نے مختلف اسلحہ چلانا سیکھے جس میں چھوٹی پستل سے لے کر بڑی گن تک؛ تیر اندازی؛ تلوار زنی؛ اور ڈنڈے سے مقابلہ کرنا شامل تھا۔ اپنے 21 سال کے آخری امتحان میں بھی وہ بہت شاندار طریقے سے کامیاب ہوا۔ آرمی پریڈ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اکیڈمی کے تعلیمات اپنے اختتام کو پہنچے۔ اب اسے واپس کراچی جا کر اپنے مقصد کی حصول کے لیے تیاری کرنی تھی۔

وہ اکیڈمی میں اس کا آخری دن تھا۔ اس نے تقریباً پورا دن اپنے ساتھیوں اور ریحان سر کے ساتھ اچھے سے گزار کر رات صادق سر کے ہاں رکنا تھا اور صبح کی ٹرین سے واپس روانہ ہونا تھا۔

صادق سر کے گھر پر کھانے پینے کے بعد جب مسنز نورین اور بچے سو گئے تب صادق صاحب اور شاویز رات کی تاریکی میں اکیلے باہر لان کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیتے لمحوں کو یاد کرتے رہیں۔

سات سال کا عرصہ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ دوستی میں؛ استاد شاگرد کے جیسے؛ کبھی پیار سے؛ کبھی ڈانٹ کر گزارا تھا۔ ایک الگ سا لگاؤ اور اپنائیت بن گئی تھی دونوں کو ایک دوسرے سے۔

"شاویز تم آرمی سلیکشن کے لیے رجوع کرو۔۔۔۔ ہمارے آرمی سسٹم کو تمہارے جیسے
ہو نہا رجوان کی اشد ضرورت ہے۔۔۔۔" صادق سر اپنے دل عزیز بیٹوں جیسے شاویز کو خود سے
دور نہیں کرنا چاہتے تھے۔

شاویز نے مایوسی سے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔ اس وقت وہ اپنے اندرونی کیفیت صادق سر پر عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے صادق سر سے بہت محبت تھی اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا لیکن اب وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ اتنے سالوں سے دل میں دبائے دلاور پرویز خان کی بربادی کے مقصد کو پورا کر سکے تو وہ اس مقصد کے بیچ میں صادق سر کی محبت کی دیوار نہیں لانا چاہتا تھا۔

"چلو آرمی نہ صحیح۔۔۔۔۔ لیکن تم یہی رہو۔۔۔۔۔ اکیڈمی میں کئی سارے خالی آسامیاں آئیں ہیں۔۔۔۔۔ تم وہاں نوکری کے لیے رجوع کرو۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے۔۔۔۔۔ تم بہت اچھے عہدے پر فائز ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔" صادق سرنے اسے روکنے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔ 45 سالہ صادق صاحب کے شاویز کے لیے والہانہ جذبات امڑا مڑ کر آرہے تھے۔

"میں آپ کے احساسات سمجھ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن آپ بھی مجھے اچھے سے جانتے ہیں نا۔۔۔۔۔ میں ضرور آرمی جوائن کر لیتا لیکن۔۔۔۔۔ دل میں دبائے مقصد کو حاصل کئے بغیر۔۔۔۔۔ میں کسی اور کام میں فوکس نہیں کر پاؤں گا۔۔۔۔۔" اس نے صادق سر کے منطوط ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

"پر آپ سے کیا وعدہ میں نہیں بھولا۔۔۔۔۔ آرمی میں رہوں یا کسی بھی اور شعبے میں۔۔۔۔۔"

میرے سارے خدمات اپنے وطن کی فلاح و بہبود کے لیے ہی ہونگے۔۔۔۔۔" شاویز نے بااعتماد لہجے میں کہا۔

"اور میں آپ سے دور تھوڑی ہو رہا ہوں۔۔۔۔۔ آپ میرے بناوٹ کا اہم حصہ ہے۔۔۔۔۔ موت کے علاوہ مجھے آپ سے کوئی شے جدا نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ میں آپ سب سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔۔۔۔۔ اور آپ سے متواتر کونٹکٹ میں رہوں گا۔۔۔" اس بات پر شاو یزدل سے مسکرایا تھا اور اسے پیار سے دیکھتے صادق سر بھی ہامی بھرنے کے انداز میں مسکرائے۔

"ٹھیک ہے پھر۔۔۔۔ جب تم نے ٹھان لیا ہے۔۔۔۔ تو میں مزید فورس نہیں کروں گا۔۔۔۔ جہاں بھی رہو۔۔۔۔ خوش رہو۔۔۔۔ اور اپنے تعلیمات کی پریکٹس کرتے

رہنا۔۔۔۔"صادق سرنے مزاج خوشگوار بناتے ہوئے اس کے بازو کو تھپتھپایا اور جیب سے ایک چابیوں کا گچہ نکال کر شاویز کے سامنے کیا۔

"کراچی میں میرے چھوٹے بھائی کا فلیٹ خالی پڑا ہے۔۔۔۔۔ تم وہاں رہ سکتے ہو۔۔۔۔۔"

صادق سر نے ساتھ ساتھ موبائل نکالا اور اس فلیٹ کی تصویریں شاوینز کو دکھانے لگے۔ وہ جو ان سے چابیاں لینے سے انکار کرنے کے لیے، مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا تصویریں دیکھنے

رک گیا۔ وہ بالکل اس کے کام کے مطابق ڈیزائن شدہ ایک بیڈروم کا فلیٹ تھا۔

"یہ میرے چھوٹے بھائی کی تفریحی گاہ تھی۔۔۔۔ اس نے مخصوص طور پر اپنے امریکی دوست کی مدد سے یہ فلیٹ مغربی طرز پر تعمیر کروایا تھا۔۔۔۔ پچھلے کچھ ماہ تک ایک میڈیکل ریکھ کرنے آتی تھی لیکن پھر اس نے کام چھوڑ دیا تو فلحال بالکل خالی ہے۔۔۔۔۔ تو تمہارے

"اسے اب وہ فلیٹ کبھی درکار نہیں ہے۔۔۔۔" صادق صاحب نے ہوا میں دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

شاویز نے تعجبی انداز میں انہیں دیکھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کا چہرہ دیکھنے کے لیے شاویز کو پورا رخ ان کی جانب کرنا پڑا۔ اچانک ہی اسے صادق سر کے چہرے پر تھکن اور مایوسی چھاتی محسوس ہوئی۔ وہ سگریٹ نوشی صرف زیادہ پریشان کن حالت میں کرتے تھے۔ اس وقت شاویز ان کی سگریٹ نوشی کرنے کی وجہ پڑھنے کی کوشش کرنے لگا تھا لیکن اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی صادق سر نے خود ہی اسے اپنے درد سے آشنا کیا۔

8 "سال پہلے میرا 26 سالہ جوان بھائی شہادت کا جام اپنے نام کر چکا ہے۔۔۔۔۔ کشمیر کے بارڈر پر وہ انڈین فورسز کے ہاتھوں شہید ہو گیا ہے۔۔۔۔۔" صادق صاحب نے پھیکا مسکراتے ہوئے کہا۔ شاویز تو مانو پلکیں تک نہ جھپکا سکا۔ وہ یک ٹک صادق سر کو دیکھتا رہا۔

"اس میں اتنا ہی جنون اور کچھ کر گزرنے کی ہمت تھی۔۔۔۔۔ اس میں بھی اتنا ہی خوش و جذبہ تھا۔۔۔۔۔ بہت محنتی بچہ تھا۔۔۔۔۔ ہم سب بہن بھائیوں میں مجھ سے بہت بنتی تھی اس کی۔۔۔۔۔ جب بھی تکلیف میں ہوتا۔۔۔۔۔ مجھ سے شیر کر تا۔۔۔۔۔" صادق سرویران آنکھوں سے ہوا سے ہلتے سامنے گلہ ان میں لگے پھولوں کو دیکھ رہے تھے۔

شاویز کی آنکھیں بھر آنے لگی۔ کیا کوئی بھی اچھا انسان دکھ درد تکلیف سے خالی نہیں؛ کیوں اس ظالم دنیا نے اس سے اس کی ماں اور صادق سر سے ان کا بھائی چھین لیا ہے؛ سوچتے ہوئے اس نے رخ پھیر لیا اور لب کاٹنے لگا۔

"جب اس کی ڈیوٹی کشمیر بارڈر پر لگی۔۔۔۔۔ اس نے مجھے فون کیا۔۔۔۔۔ کہا۔۔۔۔۔ صادی بھائی۔۔۔۔۔ میں واپس نہ آیا تو۔۔۔۔۔ رونا نہیں۔۔۔۔۔ شہید کبھی مرتے نہیں

ہیں۔۔۔۔۔ بہت جان باز فوجی تھا۔۔۔۔۔ شاہ سوار تھا۔۔۔۔۔ "صادق سر کے الفاظ ٹوٹ گئے شاید وہ بھی جذباتی ہو گئے تھے۔ شاویزنہ ان کی طرف دیکھ سکا نہ انہیں دلا سہ دے سکا۔ اسے اپنا اور صادق سر کا اپنے دل کے سب سے قریبی رشتے کو کھونے کا غم ایک برابر لگا۔ صادق صاحب نے ایک گیلی سانس اندر کھینچ کر پھر سے سگریٹ کا کش بھرا۔

"جب میں نے 7 سال پہلے تمہیں اس ہوٹل میں جنون اور کچھ کر گرنے کی ہمت سے سرشار دیکھا تو مجھے اپنا بھائی یاد آ گیا۔۔۔ اور میں خود کو تمہیں ساتھ لانے سے روک نہیں پایا۔۔۔۔۔ تمہیں ٹریننگ کرواتے وقت؛ تمہاری دلیری؛ تمہارے جذبے میں مجھے ہمیشہ اپنا بھائی نظر آتا تھا۔۔۔۔۔" صادق سر آج اپنے دل کے سارے راز افشاں کرنے لگے تھے۔ شاویز سر جھکائے خود کو رو دینے سے روکنے کی کوشش میں لگا رہا۔

"آج تمہیں کامیاب جوان دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔۔۔۔ تم نے میری محنت۔۔۔۔ ضائع نہیں جانے دی۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ ڈھیٹ بھی بہت ہو تم۔۔۔۔" کہتے ساتھ ہی صادق سر ہنس پڑے اور شاویز کے سر پر تھپکی ماری۔ ماحول میں بڑھتے تناؤ کو کم کرنے انہوں نے موضوع گفتگو بدل دیا۔

شاویز نے ہنستے ہوئے آنکھوں کے بھگے کنارے صاف کئے اور ان کے ہاتھ سے سگریٹ کا ڈبہ دبویچ لیا جو صادق سر نے دوسرا سگریٹ جلانے کی نیت سے اٹھایا تھا۔

"تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے۔۔۔۔ اس سے ہمارا نظام تنفس خراب ہوتا ہے۔۔۔۔ اور ہم ٹریننگ ٹھیک سے نہیں کر پاتے۔۔۔" شاویز نے ڈٹی آواز میں صادق سر کی نقل کرتے ہوئے ان ہی سے سیکھا جملہ دہرایا۔

صادق سر نے ہنستے ہوئے اس کا گلا اپنے بازو میں جکڑ لیا۔

"ابھی بھی اتنی طاقت ہے مجھ میں۔۔۔۔ کہ ایک ہی وار سے تمہیں نیچے پٹخ

دوں۔۔۔" صادق سر نے اس کا سراپنہ بازو میں دبائے ہوئے کہا۔ شاویز نے ہارماننے کے انداز میں ہاتھ اوپر اٹھائے تو صادق سر نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کھل کر مسکرائے۔

"I love u" صادی بھائی۔۔۔۔۔ "شٹاویز نے ان کے چھوٹے بھائی کے دیئے لقب سے انہیں مخاطب کیا اور ان کے گلے لگ گیا۔

"I love u too بیٹا۔۔۔۔۔" صادق سر نے اس کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے کہا۔

رات کافی گہری ہو رہی تھی تو شاویز نے صادق سر سے ان کے بھائی کے فلیٹ کا ایڈریس نوٹ کیا اور دونوں ساتھ اٹھتے ہوئے سونے کے لیے چلے گئے۔



وہ کراچی پہنچا تو سیدھے صادق سر کے بھائی کے فلیٹ چلا گیا۔ وہاں آرام کر کے پھر دائی ماں سے ملنے گیا۔

وہ اسے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سہا رہی تھی۔ رات تک وہی رہا اور پھر واپس فلیٹ آگیا حالانکہ زبیدہ خالہ نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے صادق سر کی مہربانی اور فلیٹ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کا سمجھا کر انہیں منالیا۔

اسے رہنے کی جگہ تو مل گئی تھی۔ اب کمانے کے لیے کسی نوکری کی تلاش کرنی تھی۔

6 ماہ تک اسے کوئی خاص نوکری نہ مل سکی۔ وہ چھوٹے موٹے باکسنگ یا کراٹے یا فائٹنگ کے مقابلوں میں حصہ لے کر جیت کے انعام سے اپنا گزارا کرتا تھا۔ اسی دوران اس نے M.A بھی پاس کر لیا تھا۔

ایک دن وہ صبح سویرے اپنا پریکٹس کر کے گھر لوٹا تھا کہ اسے صادق صاحب کی کال موصول ہوئی۔

"ایک ایڈریس ای میل کیا ہے۔۔۔۔۔ وہاں جا کر دیکھ لینا۔۔۔۔۔ مجھے لگتا ہے یہ کام تم اچھے سے کر پاؤ گے۔۔۔۔۔ اور ایسا کام تمہارے مقصد کے بیچ میں بھی نہیں آئے گا۔۔۔۔۔" انہوں نے اچھے سے حال احوال دریافت کرنے کے بعد ایک نوکری کی معلومات بتائی۔

ان سے بات کرنے کے بعد شاویز نے ای میل کھولا اور وہ مطلوبہ ایڈریس انٹرنیٹ پر تلاش کیا تو وہ آرمی کی سیکرٹ ایجنسی تھی جو خفیہ طریقوں سے نامور شخصیات کی تحقیقات کرتے، ان کے غیر قانونی پراپرٹی کی معلومات حاصل کرتے، کرپٹ حکمرانوں کی چپی چپائی دولت کا ٹھکانہ پتا کرتے اور پھر سارے ثبوت احتساب عدالت میں دے کر ان کے خلاف کارروائی کرواتے۔ جیسے کہ ISI, IMI, CIA کے ادارے ہوتے ہیں

جیسا صادق سر نے کہا اسے وہ جگہ واقعی پسند آئی تھی۔ انہیں ایک سیکرٹ ایجنٹ چاہیے تھا۔ وہاں وقت اور دفتر میں بیٹھنے کی پابندی نہیں تھی مطلب شاویز ساتھ ساتھ اپنا ذاتی کام بھی جاری رکھ سکتا تھا۔

شاویز صبح 9 بجے تک تیار ہو کر انٹرویو کے لیے جا پہنچا۔ عین وقت پر بھی پہنچ کر اس نے وہاں امیدواروں کی لمبی قطار دیکھی لیکن پھر بھی اس کا اعتماد نہیں ڈگمگایا۔

وہاں کے موودب سٹاف ممبر نے اسے ترتیب سے ٹوکن نمبر دے کر بیٹھایا۔ تھوڑی دیر میں سب کے ساتھ انٹرویو شروع ہوا۔

صبح سے دوپہر ہو گئی شاویز بیٹھے بیٹھے تھکنے لگا تھا تب جا کر اس کا نمبر آیا اور وہ دروازے پر دستک دیتا با اعتماد انداز میں چلتے اندر داخل ہوا۔

4 رکنی کمیٹی سر تا پیر اس کی ہر حرکات و سکنات بغور مشاہدہ کر رہی تھیں۔ تین مرد اور ایک خاتون پر مشتمل وہ ممبران ایک ایک کر کے اس سے سوالات پوچھنے لگے۔ شاویز نے اس سے پہلے کبھی کسی انٹرویو میں شمولیت نہیں کی تھی۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کیا پوچھا جائے گا پھر بھی وہ ان کے ہر سوال کا سکون سے اور پورے اعتماد سے جواب دیتا رہا۔

شاویز کی تیز نگاہوں کو محسوس ہوا کہ اس کے جٹ پٹ جوابات سے۔ اس کی باریک بینی سے۔ اس کے خود اعتمادی سے۔ اس کی ذہانت اور صلاحیت سے کمیٹی کے اہلکار محظوظ ہو رہے تھے۔ مزید وقت ضائع کئے بغیر شاویز کو آرمی سیکرٹ ایجنٹ کی نوکری دے دی گئی تھی۔ کچھ رسمی باتیں اور فرائض مکمل کر کے اسے پیر کے دن سے جوائننگ کرنی تھی۔

وہ جس اعتماد اور خوش مزاجی سے انٹرویو دینے گیا تھا اس سے دوگنی خوشی سے دفتر سے باہر آیا اور سب سے پہلے صادق صاحب کو کال کیا۔

"یس۔۔۔۔۔ i knew it۔۔۔۔۔ مجھے پتا تھا۔۔۔۔۔ تم اس پیشے کے لیے بالکل پرفیکٹ چوائس ہو۔۔۔۔۔ مبارک ہو۔۔۔۔۔" صادق سر کی آواز سے ان کی خوشی صاف چھلک رہی تھی۔

"تھینکیو صادق سر۔۔۔۔۔ آپ نے میرے لیے اتنا سب کیا۔۔۔۔۔ اگر میرا سگا باپ ہوتا۔۔۔۔۔ تو وہ بھی اتنا نہیں کر پاتا۔۔۔۔۔" شاویز نے مشکور اور احسان مند ہوتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

"میں نے تمہیں سگے بیٹے سے کبھی کم مانا ہے کیا۔۔۔۔۔ چلو اب دل لگا کر کام کرنا۔۔۔۔۔ اللہ تمہیں اس سے بھی زیادہ کامیابی سے نوازے۔۔۔۔۔ آمین۔۔۔۔۔" انہوں نے دل سے شاویز کو دعائیں دیں۔

شاویز کے لیے دوسرا رشتہ زبیدہ خالہ تھی جن سے وہ جلد از جلد یہ خوشخبری شیئر کرنا چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے رکشہ میں سوار ہوا اور یتیم خانے جا پہنچا۔

اس نے دل میں سوچ لیا تھا کہ پہلی تنخواہ سے وہ اس عمارت کی مرمت کروائے گا جو اس کا سب سے پہلا گھر ہے۔ اس کی ماں کا سر پناہ تھا۔



دو سال تک اس نے بہت محنت کی۔ وہ اچھے اچھے نامور شخصیات کی؛ بنا پکڑ میں آئے ساری تفصیلات اپنے ایجنسی کو فراہم کرتا رہا۔ اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے اسے جو بھی چیز درکار ہوتی۔ جیسے ہولیہ بدلنے کے لیے کپڑے یا نقلی داڑھی وغیرہ یا سفر کرنے کے لیے گاڑی بائیک سائیکل؛ سب اسے ایجنسی سے ایک آواز پر مل جایا کرتی۔

23 سالہ شواہد اب کوئی معمولی لڑکا نہیں رہا تھا۔ وہ آرمی کے لیے بہت قیمتی سرمایہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے کام سے خوش ہو کر ہر کیس کے تکمیلی پر اسے بونس دیا جاتا اور تنخواہ بھی بڑھادی جاتی۔

اسے اپنے کام کے سلسلے میں اکثر الگ الگ شہروں کا سفر بھی کرنا پڑ جاتا تھا۔ اس لیے دائی ماں سے ملنا کمتر ہوتا گیا۔

اس نے یتیم خانے کی عمارت کی مرمت بھی کروادی تھی۔ اور ہر ماہ اپنی تنخواہ سے کچھ رقم دائی ماں کو دے جاتا ساتھ ساتھ اس نے دو میڈر کھوالی تھی جو وہاں کام کاج کیا کرتیں۔ دائی ماں اب بس سربراہ کی طرح انہیں حکم دیا کرتی اور شاویز کے لیے دعائیں کیا کرتی۔



جواب کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے پاکستان میں موجود سارے سردار دلاور پرویز خان کی تلاش بھی شروع کر دی تھی۔ اسے کئی سارے اشخاص کی معلومات حاصل ہوئے لیکن ان میں سے وہ دلاور پرویز خان کون سا ہے جو اس کی ماں کا گنہگار ہے؛ یہ کنفرم نہیں کر سکا تھا جب تک کہ اسے بلال حمید ملا۔

وہ ایک ہوٹل کے لابی میں کھڑا اپنے کیس پر کام کر رہا تھا وہاں ریسپشن پر ایک درمیانہ قد کاٹ کے 50 سالہ آدمی نمودار ہوا۔ شاویز نے تعجبی انداز میں آنکھیں چھوٹی کر کے اسے سرتاپیر دیکھا۔ بلال حمید اسے شناسا سا لگا۔ اس نے اپنی ساری ذہانت کو دوڑانا شروع کیا۔ ایک یاد آنے سے اس نے موبائل نکالا۔ ایک سیف فولڈر میں اس نے اپنی ماں کی وہ تینوں تصویریں بھی سکین کر رکھی تھیں؛ ان میں سے وہ گروپ فوٹو زوم کر کے دیکھی تو مردوں کی قطار میں بلال

حمید بھی کھڑا ملا۔

وہ جینز کے ساتھ کھلی ٹی شرٹ پہنے بال بکھرے چھوڑے کلین شیو کئے لمبا سا ہینڈ سم نوجوان اٹھ کر ریسپشن کے پاس آیا اور خود کو بلال صاحب کا کلائنٹ بتا کر ان کا روم نمبر پوچھا۔

مسکرا کر سر کو خم دے کر شاویز واپس پلٹا اور گھڑی دیکھی۔ جس شخص کا تعاقب کرتے وہ یہاں آیا تھا انہیں ابھی آنے میں کچھ دیر تھی اتنے میں وہ جا کر بلال صاحب سے مل سکتا ہے؛ سوچتے ہوئے وہ لفٹ کو لپکا اور مطلوبہ منزل کا بٹن کلک کیا۔



بلال حمید پیشے سے تاجر تھے۔ اس وقت ہوٹل کے روم میں بھی وہ اپنے انٹر نیشنل کلائنٹ سے ملاقات کے لیے آئے تھے۔

جب دروازے پر دستک ہوئی تو انہوں نے اپنے کلائنٹ کے آنے کا سوچ کر دروازہ کھولا لیکن دروازے پر ایک 23 سالہ جوان لڑکا ملا۔ بلال صاحب حیرت سے کھڑے اسے دیکھنے لگے۔

"ہیلو سر۔۔۔۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔۔۔۔ لیکن میں آپ کو پہچان گیا۔۔۔" شاویز نے متعارف ہونے میں پہل کی کہ کبھی بلال صاحب دروازہ بند نہ کر دیں۔

"میں ان کا بیٹا ہوں۔۔۔۔۔ اور یہ آپ ہے نا۔۔۔۔۔" شاویز نے پھرتی سے موبائل میں وہ گروپ فوٹو دکھا کر پہلے لمبے بالوں اور خوبصورت مسکان والی زرتاج پر انگلی رکھی اور پھر مردوں کی قطار میں جو ان بلال حمید کی طرف اشارہ کیا۔

وہ تصویر دیکھ کر بلال صاحب کے تاثرات بدل گئے۔

"اچھا۔۔۔ زرتاج کے بیٹے ہو۔۔۔ آواندر آو۔۔۔" انہوں نے خوش دلی سے کہتے ہوئے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ شاویز مسکراتا ہوا ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔

"زرتاج کیسی ہے۔۔۔۔۔ وہ تمہارے ساتھ نہیں آئی۔۔۔" بلال صاحب نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میری ماں اب اس دنیا میں نہیں ہے۔۔۔" شتاویز نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

"اھوووو۔۔۔۔۔ایم سوری۔۔۔۔۔مجھے پتا نہیں تھا۔۔۔۔۔اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔۔۔۔۔بہت نیک خاتون تھی۔۔۔۔۔" بلال صاحب نے سیدھے ہو کر اس سے زرتاج کی تعزیت کی۔

شاویز صوفیہ آگے ہو کر بیٹھا تھا۔ پھیکا مسکرا کر اس نے سر کو جنبش دیا۔

"آپ اچھے سے جانتے تھے میرے ماں کو۔۔۔۔" اب کی بار اس کا لہجہ شکستہ ہو چکا تھا۔

"ہاں کئی دفعہ ملا ہوں ان سے۔۔۔۔ اچھی دوست تھی میری۔۔۔۔" بلال صاحب نے کہتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ رکھا اور صوفے کے پشت سے ٹیک لگا لیا۔

"کیا انہوں نے کبھی آپ سے۔۔۔۔۔ دلاور پرویز خان کا ذکر کیا۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ آپ انہیں بھی جانتے ہونگے۔۔۔۔۔ وہ کیا ہے کہ میں بہت بہت چھوٹا تھا جب ان سے ملا تھا تو اب وہ ٹھیک سے یاد نہیں۔۔۔۔۔ آپ کو دیکھا تو ان کی یاد آگئی سوچا ان سے بھی مل لوں۔۔۔۔۔ آپ کو تو پتا ہو گا ان کا۔۔۔۔۔" بلال صاحب کو شک نہ ہو اس لیے شاویز نے دلاور پرویز خان کے بارے میں پوچھنے کے لیے من گھڑت کہانی سنادی۔

اس کی آرمی سیکرٹ ایجنٹ کی تیز نظریں بلال صاحب کے چہرے پر مرکوز تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دلاور صاحب کا نام سن کر ان کے تاثرات بدل گئے۔

"تو یہ۔۔۔۔۔ دلاور کو۔۔۔۔۔ نہیں جانتا۔۔۔۔۔" بلال صاحب نے تاثرات نارمل کرتے ہوئے دل میں سوچا۔ شاویز کی اندر تک گڑھ جانے والی نظریں خود پر محسوس کرتے ہوئے بلال صاحب سمجھ گئے وہ ان کا چہرہ اڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، اس لیے وہ جھوٹ بول کر یا بہانہ بنا کر دلاور سے انجان نہیں بن سکتا تھا۔

"ہاں زرتاج کے ساتھ دیکھا تھا اسے۔۔۔۔۔ ملاہوں ایک آدھ دفعہ۔۔۔۔۔" انہوں نے کنکارتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

شاویز نے موبائل میں دلاور پرویز خان کے نام سے سیف کئے کچھ اشخاص کی تصاویر دکھائی۔

"ان میں سے کونسے وہ دلاور ہے۔۔۔۔" شاویز نے ایک ایک کر کے تصویر سوائپ کرتے

ہوئے پوچھا۔

بلال صاحب آگے کو ہوئے اور تعجبی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کہی یہ مجھے آزما تو نہیں رہا۔۔۔۔۔ یہ واقعی زرتاج کا بیٹا ہے کہ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ نین

نقش تو زرتاج جیسے ہی ہے۔۔۔۔" بلال صاحب نے شاویز کو بغور دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں

سوچا پھر آگے ہو کر تصویروں کی جانب متوجہ ہوئے۔

"یہ ہے دلاور پرویز خان۔۔۔۔۔ اب تو بہت بڑے صنعت کار بن گیا ہے۔۔۔۔۔ ملٹی نیشنل

بزنس مین ہے۔۔۔۔۔" انہوں نے دلاور پرویز خان کی تصویر کی طرف پوائنٹ کر کے جتانے

والے انداز میں بتایا۔ شاویز کا رنگ بدل گیا وہ حیران پریشان کبھی بدلا صاحب کو دیکھتا کبھی اپنے موبائل میں اس تصویر کو۔

"آپ کو پکا یقین ہے۔۔۔۔ ٹھیک سے یاد کریں۔۔۔۔" شاویز کو لگا عمر کے لحاظ سے ان کو غلط
 فہمی ہوئی ہے یا نظر کا دھوکہ ہوا ہے۔

"ہاں مجھے پکا یقین ہے۔۔۔ یہی دلاور ہے۔۔۔ اُس گروپ فوٹو میں بھی ہے۔۔۔ دیکھو۔۔۔" انہوں نے شاویز کو اس کی پہلے دکھائی ہوئی تصویر کی طرف متوجہ کیا۔

شاویز نے پھرتی سے انگلیاں چلا کر وہ نوٹونکال کر دیکھی تو وہ وہی جوان دلاور پرویز خان تھے جس کا بلال صاحب ذکر کر رہے تھے۔

"بہت پریشان کیا ہے دلاور نے زر تاج کو۔۔۔۔۔ بہت دکھی رہی ہے وہ اس کی وجہ سے۔۔۔۔۔ تم اس کے سامنے نہ جاو تو اچھا رہے گا۔۔۔۔۔ پتا نہیں جب اسے معلوم ہو گا کہ تم زر تاج کے بیٹے ہو تو وہ تمہارے ساتھ کیسے پیش آئے۔۔۔۔۔" بلال صاحب نے جعلی ہمدردی سے شاویز کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے تھپکا۔

شاویز اپنے جذبات قابو کئے ہوئے ان کی گفتگو سنتا رہا۔

"تو اس لئے دائی ماں ان کے بارے میں بتاتے ہوئے جھجک گئی تھی۔۔۔" شاوینز نے چند سال پہلے کی دائی ماں سے ہوئے اس فوٹو پر تبصرہ یاد کیا۔

اس کارنگ بدلتا دیکھ کر بلال صاحب حیران ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتے شاويز فوراً سے اٹھا اور ان سے الوداع کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔



اس سے یہ حقیقت برداشت نہیں ہو پارہی تھی۔ کبھی کبھی جو جیسا بنتا ہے ویسا ہوتا نہیں ہے؛ یہ مثال شاویز کو اس وقت دلاور خان کو پہچان کر سمجھ آ رہا تھا۔

اپنے غضب کو کم کرنے وہ واشر روم میں بھاگا اور ٹھنڈے شاور کے نیچے آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ آج ایک مرتبہ پھر اسے زرتاج کی شدت سے یاد آرہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی تکلیف دہ موت اس کے آنکھوں میں فلم کی طرح گھوم رہے تھے۔



وہ کئی دنوں تک اسی کشمکش سے دوچار تھا کہ وہ کیا کریں۔ کیا وہ صادق سر سے بات کریں۔ یا وہ دائی ماں سے مشورہ کریں۔

ایک دن وہ مشہور مال کے کافی شاپ میں بیٹھا تھا جب اس نے سامنے دلاور پرویز خان اور ان کی فیملی کو دیکھا۔

وہ سب وہاں ایک شاپ کے افتتاحی تقریب میں شرکت کرنے آئے تھے۔ شاویز کی تیز نظریں مسلسل دلاور پرویز خان اور اس کی فیملی پر جمی ہوئی تھی۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس ہینڈ سم اور سحر انگیز شخصیت کے حامل دلاور صاحب اب آگے کو گئے اور کھینچی لے کر رہن کاٹا۔

پورا ماحول تالیوں کے شور سے گونچ اٹھا۔ دلاور صاحب کی بیگم اور دو ٹین اتج بچیں بھی تالیاں بجا کر ان کو سراہ رہے تھے۔ وہی دوسری جانب شاوینز کافی پینا بھول گیا تھا وہ تنے ہوئے اعصاب سے اس ہنستی کھلتی خوشی سے سرشار فیملی کو دیکھتا رہا جو ابھی اپنے نئے شاپ کے بارے میں میڈیا سے بات کر رہے تھے۔

"میری ماں کو آنسو دینے والے کی خوشیاں بہت کم مدت کی ہے۔۔۔۔۔ جتنا ہنسنا ہے آج ہنس لو
دلا اور صاحب۔۔۔۔۔ بہت جلد میں تمہاری یہ ہنسی۔۔۔۔۔ آنسوؤں میں بدلنے والا
ہوں۔۔۔۔۔" شاویز نے فیصلہ کن انداز میں سوچا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔



اب اسے دلاور پرویز خان کے خلاف منصوبہ بندی کرنی تھی۔ وہ لگاتار اسی سوچ میں مشغول رہا کہ وہ کیا کریں۔ کیا وہ ان کے خلاف کوئی جھوٹا کیس بنا کر ان کی جائیداد ضبط کروائے۔ لیکن پھر اسے صادق سر کی نصیحت یاد آ جاتی۔ وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے کبھی اپنے پیشے کا غلط استعمال نہیں کریں گا۔ اور وہ جھوٹا کیس بنانے کا خیال جھٹل دیتا۔

کیا وہ ان کے بچوں کو اغوا کر وائے۔ پر نہیں ظلم دلا اور نے کیا تھا سزا ان کے بچوں کو کیوں ملے۔ لیکن ایسا سوچتے سوچتے وہ طیش میں آ جاتا۔ وہ بھی تو معصوم بچہ تھا پھر اسے کیوں سزا ملی۔ کم عمری میں ہی وہ کیوں دلا اور کی وجہ سے یتیم ہو گیا۔

شاویز نے اسی طرح اپنی تحقیقات اور جانچ پڑتال جاری رکھی کہ جب اسے کہی سے بھی دلا اور صاحب کی کوئی بھی کمزوری ملے؛ وہ اس کا استعمال کر کے ان کو تکلیف پہنچا سکے۔

کافی محنت کر کے بھی شاویز کو دلا اور صاحب کے خلاف کوئی کمزوری کوئی ناجائز بات تو معلوم نہ ہو سکی لیکن راشد ہاشمی کا ان سے برخلاف تعلق پتا چل گیا۔ تب اس نے سوچا وہ راشد ہاشمی کو اپنا مہرہ بنا کر دلا اور پروار کرے گا۔ راشد ہاشمی کی ہسٹری نکالنے کے بعد اس کے معلومات میں یہ بھی اضافہ ہوا کہ ان کا نام تو ایجنسی کے بلیک لسٹ میں شامل ہے اور اس کا اگلا کیس وہی ہیں۔

شاویز کے ہونٹوں پر استخزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب اسے راشد ہاشمی سے اپنا کام نکلوانا اور بھی آسان لگ رہا تھا۔



شاویز بہت محتاط انداز میں دلاور کے خلاف منصوبہ بندی کر رہا تھا۔
اسے کسی صورت پکڑا نہیں جانا تھا اور نہ ہی اپنے ایجنسی کی نظروں میں مشکوک ہونا تھا۔
اسے کب کس دن کیا کرنا ہے۔ یہ سب تیار کرتے کرتے اسے مزید دو سال لگے۔ ساتھ ساتھ
وہ اپنی جاب بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ 25 سال کا ہو کر اس نے منظر عام پر آنا مناسب
سمجھا۔ اس نے اپنے جاب کے تعلقات استعمال کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لیا حالانکہ وہ

M.A کرچکا تھا پھر بھی اس نے سحر بنت دلاور کی کلاس میں داخلہ لیا۔ اس طرح وہ اس کے ساتھ رہ سکتا تھا اور موقع دیکھ کر اس پر وار کر سکتا تھا۔

جب اس نے مارکیٹ میں اپنے خفیہ تعاقب کار کے روپ میں سحر کا پیچھا کیا تو وہ خوف و ہراس میں مبتلا ہو گئی۔ شاویز نے سوچا یہ تو صرف پیچھا کرنے سے ہی ڈر گئی اس لیے اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ جبکہ صائم دلاور کو ڈرا کر پریشان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شاویز ان کے سامنے دوست بنا رہتا لیکن پیٹھ پیچھے ان کے ہر حرکات پر نظر رکھتا۔

جنگل میں کیمپ کی رات وہ حسب عادت جاگ رہا تھا اور کھلے آسمان تلے بیٹھا ہوا تھا جب اس نے سحر کو جگنو کے پیچھے جاتے دیکھا۔ اس کے دماغ میں ایک شرارت ابھری۔ وہ پھرتی سے اپنا خفیہ بلیک اپر پہن کر دوسرے سمت سے جنگل کے اندر گیا اور یک دم سحر کے سامنے آگیا۔

جیسا اس نے سوچا تھا وہ بہت زیادہ ڈر گئی اور بے دھیانی میں جنگل کے خطرناک حصے کی جانب بھاگنے لگی جہاں سے آگے انسان کا جانا سختی سے منع تھا۔

شاویز دلا اور صاحب اور ان کی فیملی سے اپنے زخموں کا بدلہ ضرور لینا چاہتا تھا لیکن وہ بے وجہ کسی کی جان کو خطرے میں ڈالنے کا طرفدار نہیں تھا اس لیے اس نے اپروہی اتار کر پھینکا اور شاویز بن کر سحر کو بچانے دوڑ پڑا۔

اسی طرح صائم کے ایکسیڈنٹ کے دن جب صائم زخمی ہو گیا وہ تب تک اپنی کار وہی روکے کھڑا رہا جب تک کہ اس کے زخموں کی نوعیت کی تصدیق کر لی۔ پھر روانہ ہو گیا

وہ اپنی کار پارک کر کے گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ اسے صائم کی کال موصول ہوئی۔ وہ چاہتا تو نظر انداز کر سکتا تھا لیکن شاویز جانتا تھا صائم اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں بلائے گا اور شاویز

کے اندر کے اچھے انسان سے صائم کو زخمی حالت میں تنہا چھوڑ دینا گوارا نہیں ہو سکا اور وہ ہسپتال جا پہنچا۔

اسے نہ سحر کو ڈرانے کا دکھ تھا۔ نہ صائم کو زخمی کرنے کی تکلیف۔ بس افسوس اس بات کا تھا کہ ان سب کے چلتے اس نے جانے انجانے عارفہ کا دل توڑ دیا تھا۔

صائم کو گھر لاتے وقت اس نے پہلی بار دلاور پرویز خان کے گھر میں قدم رکھا۔ اس احساس کو نام دینے کے لیے شاویز کے پاس مناسب لفظ نہیں تھا۔ اسے پہلی دفعہ لگامانہ وہ جیل میں آگیا ہو۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا لیکن مسز دلاور کا اسرار تھا کہ وہ دلاور صاحب سے مل کر جائے۔ وہ خود بھی ایک مرتبہ انہیں روبہ رو دیکھنا چاہتا تھا۔ اور پھر وہ لمحہ آگیا۔ دلاور صاحب سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ ایک پل کو اس کے دل میں خیال آیا کیا

واقعی وہ کسی عورت پر ظلم کر سکتے ہیں۔ لیکن اگلے ہی پل اسے اپنی ماں کا ان کا نام لے کر سسکنا یاد آیا اور دل میں اٹھتا درد تیز ہو گیا تو وہ وہاں سے بھاگ آیا۔

بے ترتیب سانس لیتے ہوئے وہ جب گھر کے اندر داخل ہوا تو اس سے اپنے جذبات قابو نہ ہو سکے تھے۔

موجودہ دن

بہت دیر تک رو رو کر ہلکان ہو جانے کے بعد اس نے ہاتھ کی بند مٹھی کھولی تو خون کی دھار رک چکی تھی لیکن زخم بہت گہرا تھا۔ وہ بہت محتاط انداز میں ہاتھ کو زیادہ حرکت دیئے بغیر کہ خون پھر سے جاری نہ ہو، ہاتھ منہ دھونے واشر و م چلا گیا۔ فریش ہو کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا اور کچن کی دراز سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کر ہاتھ پر پٹی کرنے لگا۔



شواہد نے آگے بڑھ کر کچھ بٹن دبائے تو وہ دلاور صاحب کی آواز سن پایا۔

"ہاں ذاکر۔۔۔۔۔ کمپنی کی افتتاحی تقریب ایک ہفتہ آگے بڑھا دو۔۔۔۔۔ سب انوائٹڈ

مہمانوں کو مطلع کر دینا۔۔۔۔" وہ اپنی سیکرٹری کی بات سننے لگے۔

"ہاں سب خیریت ہے۔۔۔۔۔ بس صائم کا ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔۔۔۔۔ ایسے میں،

میں کوئی پارٹی نہیں کر سکتا۔۔۔" شاویز ٹانگ پر ٹانگ جمائے ہوئے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

"ہاں ہاں۔۔۔۔۔ شکر ہے زیادہ زخمی نہیں ہوا۔۔۔۔۔ پارٹی اگلے ہفتے تک ملتوی کر لو۔۔۔۔۔ ہاں

تب تک صائم بھی چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔۔۔" انہوں نے حکم صادر کر کے کال

کاٹ دی۔

شاویز کچھ لمحے اسی طرح بیٹھا اپنے پلان میں تبدیلیاں کر رہا تھا۔ پھر کرسی پر آگے کو ہوا اور بغیر ٹرانسمیٹر کے ہی راشد ہاشمی کو کال ملا کہ پلان میں تبدیلی کی اطلاع دی۔ اسے اتنی تپ چڑھی تھی کہ نہ اسے ٹرانسمیٹر کی پروا تھی نا آواز ٹریس ہونے کا خوف۔



ایک ہفتے تک صائم کا پیر بہتر ہو گیا تھا۔ وہ بغیر مدد کے چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پٹی اتر چکی تھی اور پھیکی رنگت بحال ہو گئی تھی۔

ہفتہ کے دن دلاور صاحب کے گھر صبح سے ہی بھاگ دوڑ لگی تھی۔ انہیں چار بجے خاص مہمانوں کے ہمراہ کمپنی سائیڈ پر افتتاح کرنے پہنچنا تھا۔ اور پھر رات کو شہر کے سب سے عالی شان ہال

آج اگر سب کچھ پلان کے مطابق ہوا تو یہ اس کی سب سے بڑی چیت ہوگی؛ سوچتے ہوئے اس کے آبرو تن گئے اسے دلاور پرویز خان پر شدید غصہ آنے لگا۔ الماری کا پھٹ بند کر کے وہ گاڑی کی چابی اٹھائے گھر سے نکل گیا۔



شام ہونے والی تھی۔ وہاں سے رخصت ہو کر سب وہی سے ہال کے جانب روانہ ہو گئے۔

تب وہاں چند سیکیورٹی اہلکاروں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ شاویز نے موقع دیکھ کر آس پاس عقابی نظروں سے دیکھتے ہوئے کمپنی کے احاطے کی جانب بڑھ گیا۔

دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے وہ یک دم اس پر چڑھ کر اندر پھلانگ گیا۔ چوکیدار نے اسے دیکھ کر شور مچانا چاہا پر اس سے پہلے ہی شاویز نے تیزی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور گردن میں انجیکشن چبا کر اسے بے ہوش کر دیا۔

کیمرے کی آنکھ سے بچ کر اندھیرے میں چلتے وہ گیٹ تک آیا۔ راشد ہاشمی کے آدمی گیٹ کے پار اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ شاویز نے گیٹ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ ڈیجیٹل

لاک تھا صرف سیکیورٹی اہلکاروں کے fingerprint سے کھل سکتا تھا۔ وہ طیش میں دیوار پر لات مارتا ہوا ایک سائیڈ سے خفیہ انداز میں چلتے ہوئے سیکیورٹی کمرے کے دروازے تک آیا۔

ایک ہی جھٹکے میں اس نے دروازہ دکھایا۔ جب تک اسکرین کے آگے بیٹھے اہلکار ہڑبڑا کر کھڑے ہوئے شاویز نے نشہ آور سوئی ان دونوں پر ایک ایک کر کے شوٹ کر دی اور وہ دونوں زمین بوس ہو کر بے ہوش ہو گئے۔

پھر شاویز نے آگے بڑھ کر سب کیمروں کے وائر نکال پھینکے۔ سارے اسکرین ایک ساتھ تاریک ہو گئے۔ شاویز ان میں سے ایک اہلکار کو گھسیٹتے ہوئے باہر لایا اور اس کا انگوٹھا ڈیجیٹل لاک کے حصہ پر رکھا۔ ایک سبز لکیر اس کے انگھوٹے پر سے گزری اور چند ہی سکینڈ میں گیٹ کھل گیا۔

راشد ہاشمی کے آدمی ہاتھوں میں پٹرول کے دبے لیے کمپنی میں داخل ہوئے اور شاویز کے اشارے پر الگ الگ ہو کر سب جگہ پٹرول چھڑکنے لگے۔

جب تک وہ لوگ کمپنی میں پیٹرول پاشی کر رہے تھے شاویز چوکیدار اور دونوں سیکورٹی اہلکاروں کو احاطے سے باہر لے گیا۔

وہ صرف کمپنی کو جلانا چاہتا تھا کسی کو جانی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

پورے کمپنی کو پیٹرول سے تر کر کے وہ غنڈے باہر آئے۔ شاویز نے سر کے جنبش سے اجازت دی تو ان میں سے ایک نے لکڑی کے ڈنڈے پر کپڑا لپیٹ کر شعلہ بھڑکایا اور فوراً سے کمپنی کے طرف اچھال دیا۔ ایک لمحے میں اس کی آنکھوں کے سامنے آگ بھڑک گئی۔ جیسے جیسے کمپنی کے ہر گوشے میں ایک ایک کر کے آگ لگتی گئی ویسے ویسے شاویز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی گئی۔

اس نے باقیوں کو رخصت کیا پر خود وہی رک رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ جب دلاور صاحب کو خبر ہوگی اور وہ بھاگے بھاگے آئے گے تو وہ وہی رک کر دلاور پرویز خان کی آہ و بکا اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ وہ نفرت اور حقارت سے اس لمحے کو تصور کر کے ہی محظوظ ہو رہا تھا۔



شہر کے سب سے بڑے اور عالی شان ہال میں اس وقت پارٹی اپنے زور و شور سے جاری تھی۔ سب ہاتھوں میں مشروبات کا گلاس تھا مے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ کچھ وہاں موجود براہ راست موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ عارفہ سحر کے ساتھ ساتھ ٹہلتی بہانے بہانے

سے اسے لیے entrance گیٹ کے پاس آ جاتی جہاں جاوید بلیک سوٹ میں ملبوس ہاتھ میں پولیس کا وائر لیس پکڑے حفاظتی انتظامات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

عارفہ سحر کو اس سے بات کرنے آگے د کھیل دیتی لکین وہ گڑ بڑا کر واپس الٹے قدم اندر بھاگ جاتی اور عارفہ سر پکڑ کر اس پر غصہ کرتی رہ جاتی۔

عابدہ بیگم اپنے ہم۔ منصبوں اور سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ میں مشغول تھی۔ صائم اپنے دوستوں کے بیچ پیر لمبا کئے بیٹھا تھا۔ اس نے شاویز کو بھی مدعو کیا تھا لیکن وہ out of town ہونے کا بہانہ کر کے معذرت کر گیا تھا۔

دلاور صاحب مہمانوں کی خیر مقدمی کرتے ہوئے ہنستے مسکراتے ہر مہمان کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں کچھوارے تھے جو وہاں موجود میڈیا والے بھی اپنی کیمروں میں ریکارڈ کر رہے تھے۔

ابھی دلاور صاحب اپنے ایک ہم منصب بزنس مین کے کندھے پر ہاتھ رکھے کچھ گفتگو فرما رہے تھے کہ ان کا سکرٹری ذاکر پسینہ صاف کرتا ہوا اپنے تاثرات نارمل رکھنے کی کوشش کرتا ان کے پاس آیا اور کان میں کچھ سرگوشی کی۔ دلاور صاحب کے آبرو و تعجب سے پھیل گئے وہ مہمان سے معذرت کرتے تیز قدموں سے اس کے ساتھ ساتھ باہر کی جانب بڑھ گئے۔

عورتوں کے گھیرے میں کھڑی خوبصورت اور دلکش تیار شدہ عابدہ بیگم بھی دلاور صاحب کو پریشان ہوتے سکرٹری کے ساتھ باہر نکلتے دیکھ کر گھبرا گئی اور ان کے پیچھے چل پڑی۔

سب مہمان ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران پریشان چی مگوئیاں کرنے لگے۔

اسی اثناء سب میڈیا رپورٹرز کے موبائل بھی بجنے لگے۔

ہال میں اچانک پریشانی کا سماء بندھ گیا تھا موسیقار نے حالت گھمبیر ہوتے دیکھ کر موسیقی روک دی۔

"کیا ہوا اذا کر۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔۔ ایسی ایمر جنسی میں باہر کیوں بلایا۔" دلاور صاحب نے ایک کونے میں آکر سکرٹری ذاکر کو مخاطب کیا۔ عابدہ بیگم بھی روہانسی ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ انہیں اس طرح تشویش میں دیکھ کر جاوید بھی بھاگ کر ان کے سمت آیا۔

"سر۔۔۔۔۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ اصل میں۔۔۔۔۔ کمپنی میں۔۔۔۔۔ آگ لگ گئی ہے۔۔۔۔۔" ذاکر نے لب کاٹتے ہوئے افسردگی سے سر جھکائے ہوئے ٹوٹے لفظوں میں خبر ان کو بیاں کی۔

عابدہ بیگم نے منہ پر ہاتھ رکھ لیے وہی دلاور صاحب نے ہاتھ ناگہانی میں سینے پر رکھ لیا اور جاوید تو مانوسانس لینا بھول گیا۔

سب مہمان اور میڈیا والے بھی حقیقت جاننے باہر آ گئے۔ سحر اور صائم تیزی سے عابدہ بیگم کو سنبھالنے قریب آئے۔ دلاور صاحب سے کچھ کہا نہیں گیا وہ اپنی ساری قوت لگا کر ہال کی سیڑھیاں اترنے لگے۔ ان کا رخ اپنی گاڑی کے جانب تھا۔

"خان انکل رکیں۔۔۔۔۔" ان کے پیچھے جاوید بھی ان کو پکارتا ہوا بھاگا۔

"مما کیا ہوا۔۔۔" سحر نے خوف زدہ سی ہو کر ماما سے پوچھا۔ عارفہ اور اس کے والدین بھی عابدہ بیگم کو سنبھالنے قریب آ گئے تھے۔

"بیٹا کمپنی میں آگ لگ گئی ہے۔۔۔۔۔" عابدہ بیگم کہتے کہتے وہی بیٹھ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ سحر کے بھی آنسو جاری ہو گئے تھے۔ صائم پاپا کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن پٹی بندھے پیر کی وجہ سے وہ بھاگ نہ سکا۔ تو وہی رک کر ماں اور بہن کو دلاسا دینے لگا۔

ہو گئے اور آگ کے قریب جانے لگے کہ جاوید نے انہیں بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ خود کو اس کے حصار سے آزاد کروانے کی کوشش کرنے لگے لیکن جاوید نے بلند آواز میں انہیں جھنجھوڑ دیا۔

"ہوش سے کام لیں۔۔۔۔۔ پلیز خان انکل۔۔۔۔۔ حوصلہ رکھیں۔" دلاور صاحب نے مایوسی سے جاوید کو دیکھا اس نے دل گرفتگی سے نفی میں سر ہلایا۔

دلاور صاحب کمپنی کے ڈھیر ہوتے عمارت کے طرف دیکھ کر جذباتی ہو گئے اور وہی زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رونے لگے۔ اسی دوران فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی پہنچی۔ تیز تیز پائپ برابر کیا اور آگ بجانے پانی کی بوچھاڑ کر دی۔

جاوید پیشانی پر ہاتھ رکھے لب مینچھے بھیگی آنکھوں سے روتے ہوئے دلاور پر ویز خان کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے انہیں چپ نہیں کروایا بلکہ رونے دیا تا کہ دل کا درد آنسوؤں کے ذریعے بہہ جائے۔

دوسری جانب دور چھپ کر کھڑے شاویز نے ان کو بے بس دیکھتے ہوئے سکون کی لمبی سانس لی اور آنکھیں بند کر کے وہ لمحہ اپنے یادوں میں قید کر لیا۔ جب دل کے ٹکڑے ہوتے ہیں تب کیسا محسوس ہوتا ہے یہ دلاور کو احساس ہو گیا ہو گا؛ سوچتے ہوئے شاویز تنے آبرو لیے وہاں سے دبے قدموں روانہ ہو گیا۔



اب مزید دلاور صاحب کا وہاں کوئی کام نہ تھا۔ جاوید انہیں سنبھالے ہوئے گھر لے آیا تھا۔ عابدہ بیگم اور بچے بھی آچکے تھے۔ دلاور صاحب کی سرخ پڑتی آنکھیں ان کا رو کر ہلکان ہونے کا راز صاف بیان کر گئی تھی۔ وہ تینوں ان کے پاس آئے لیکن جاوید نے خود ہی انہیں

کمرے تک لے جانے کا اشارہ کیا۔ میاں کی یہ حالت دیکھ کر عابدہ بیگم پھر سے زار و قطار رونے لگی۔ صائم اپنے پیر کا زخم بھولے پاپا کا ہاتھ پکڑ کر جاوید کے ساتھ مل کر انہیں کمرے تک لایا اور بیڈ پر بیٹھا دیا۔

"پاپا۔۔۔۔۔" سحر نے گیلی سانس اندر کھینچ کر انہیں مخاطب کیا پر وہ اب بھی نظریں جھکائے خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے۔

سحر پھر بھی ان کے پہلو میں بیٹھی ان کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی جبکہ صائم اور جاوید عابدہ بیگم کو دلاسہ دینے لگے تھے۔ اچانک دلا اور صاحب کو متلی ہونے لگی وہ کھانستے ہوئے اٹھے اور تیزی سے واشروم میں چلے گئے۔ عابدہ بیگم بھی ان کے پیچے چلی گئی تاکہ مدد کر سکے۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔۔۔۔۔" جاوید ڈاکٹر کو کال کرنے کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان کی حالت سنبھلتے دیکھ کر جاوید نے رخصت لی اور اپنے گھر کو روانہ ہو گیا۔
جاتے جاتے سحر نے اس کی پشت کو دیکھا۔ اسے اپنے پاپا کی اتنی مدد کرتے دیکھ کر سحر کے دل
میں جاوید کے لیے چاہت میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔



وہ اپنے بیڈروم میں راکنگ چیئر پر پُر سکون بیٹھا چیئر جھلارہا تھا کہ اس کا فون بجنے لگا۔
اس نے کال اٹھائی تو راشد ہاشمی کا قہقہہ سنا۔

"ہاہاہاہاہا۔۔۔۔۔بھئی واہ۔۔۔۔۔مزا آگیا۔۔۔۔۔کمال کر دیا تم نے۔۔۔۔۔پہلی بار مجھے کوئی واردات کر کے خوشی محسوس ہوئی ہے۔۔۔۔۔میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔میرے فارم ہاؤس پر آو۔۔۔۔۔ساتھ میں جشن منائے گے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مل لوں گا۔۔۔۔۔ ضرور ملوں گا۔۔۔۔۔ جب ایسے ہی ایک ایک کر کے دلاور پرویز خان کی ساری صنعتوں کو آگ کی نظر کر دیں گے۔۔۔۔۔ تب ایک ساتھ سب کامیابیوں کا مل کر جشن مناؤں گا۔۔۔۔۔" اس نے استخز یہ مسکرا کر کہا۔

"دلاور کو برباد کرنے کے تیرے اس مشن میں، میں تیرے ساتھ ہوں۔۔۔۔۔ اگلا واردات کب کہاں کیسے کرنا ہے۔۔۔۔۔ یہ پلان کر کے بتا دینا۔۔۔۔۔" راشد ہاشمی کی آواز سے ان کی خوشی صاف چھلک رہی تھی۔

"حوصلہ رکھو۔۔۔۔۔ راشد صاحب۔۔۔۔۔ جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ ابھی کچھ دن
انڈر گراؤنڈ ہی رہو۔۔۔۔۔ تھوڑا یہ غم تھم جائے پھر دوسرا جھٹکا دیں گے۔۔۔۔۔" اس نے سر
چیر کی پشت سے ٹکایا۔

شاویز کو کئی دنوں بعد کسی بھی دوائی کے بغیر نیند آرہی تھی۔ اسے لگایہ وہ سکون کی نیند ہوگی جو
وہ اتنے سالوں سے چاہتا ہے۔ اس سے پہلے نیند اڑ جاتی وہ کال بند کر کے اٹھا اور اونڈھے منہ
بیڈ پر لیٹ گیا۔



رات کے تاریکی میں اسے اپنے سرہانے کسی کی رونے کی آواز سنائی دی۔ شاوینز نے عنودگی میں آنکھیں کھولی تو زرتاج اس کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھی۔

ماں ماں کر کے شاوینز نے اسے مخاطب کیا لیکن وہ چہرے پر ہاتھ رکھے ہوئے روئے جارہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر زرتاج کو چھونا چاہا پر وہ اچانک بہت دور ہو گئی۔ شاوینز نے بیڈ سے اتر کر اس کے پاس بھاگنا چاہا لیکن اس کے ہاتھ پیرزنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ بلکتا ہوا چلا چلا کر ماں کو پکارنے لگا۔ ہاتھ پیر چلاتے ہوئے وہ خود کو آزاد کروانے کی کوشش کرنے لگا۔ زرتاج مسلسل روئے جارہی تھی۔ شاوینز کو اس کی سسکیوں سے تکلیف ہونے لگی وہ خود بھی رونے لگا اور اسی اثناء میں اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ گڑبڑا کر بیڈ سے اچھل پڑا۔ اس کی سانس رکنے لگی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرا تو اس کا گال آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

اس نے اففف کرتے ہوئے سر پکڑ لیا اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

"تم رو کیوں رہی تھی ماں۔۔۔۔۔ آج تو میں نے تمہیں رلانے والے کی ساری خوشیاں پامال کر دی۔۔۔۔۔ آج تو میں نے اسے موت کے قریب لا کھڑا کیا۔۔۔۔۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا ماں۔۔۔۔۔ تم رو کیوں رہی تھی۔۔۔۔۔" شاویز نے گیلے رخسار کو صاف کرتے ہوئے سوچا۔

خواب میں بھی زرتاج کے سسک سسک کر رونے نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔ وہ بے چینی سے اٹھا اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا واشروم میں داخل ہو گیا۔



ایک ہفتے تک ان کے گھر سوگ کا سماء چھایا رہا پھر آہستہ آہستہ زندگی بحال ہوتی گئی۔

دلاور صاحب اپنے دفتر جانا شروع ہو گئے تھے اور یونیورسٹی میں مڈ ٹرم امتحانات کا آغاز ہو گیا تھا۔

وہ امتحان کا پہلا دن تھا۔ سب ہاتھ میں کتاب پکڑے آخری نظر سبق دوہرا رہے تھے۔

شاویز جینز اور ٹی شرٹ پہنے بال اور ہکلی داڑھی اسٹائل سے بنائے تیزی سے سٹوڈنٹس کے جمکے میں در آیا۔

"ہائے سحر۔۔۔۔۔ تمہارے پاپا کی کمپنی کے حادثے کا سنا۔۔۔۔۔ بہت افسوس

ہوا۔۔۔۔۔" شاویز نے ہمدردی بھرے لہجے میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

سحر نے مدھم مسکرا کر سر کو جنبش دے کر افسوس قبول کیا۔ عارفہ سر جھکائے ان کی گفتگو

نظر انداز کئے ہوئے کھڑی تھی۔

گھنٹی بجتے ہی سب دم پھیل کرتے ہوئے ہال کے اندر گھسے اور کمرے امتحان میں اپنے متعین سیٹ پر جا بیٹھے۔



صائم اور سحر امتحان دے کر جلدی گھر لوٹے تھے۔ صائم بھی آج کل سحر کے ساتھ گاڑی میں آنا جانا کر رہا تھا۔

شام میں وہ پوری فیملی لاؤنج میں اکٹھے بیٹھے تھے کہ جاوید پوریج کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ پہلے متذبذب سا ہو کر سب کو دیکھا پھر دلا اور صاحب کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔

"سب خیریت تو ہے جاوید۔۔۔۔ پریشان لگ رہے ہو۔۔۔" دلاور صاحب نے رخ اس کی جانب کر کے پوچھا۔

عابدہ بیگم نے ملازمہ سے اس کے لیے چائے منگوائی۔ سحر اور صائم خاموش بیٹھے رہے۔

"خان انکل میں حادثے کی اگلی صبح پھر سے سائٹ پر گیا تھا۔۔۔۔ مجھے کمپنی کا چوکیدار اور سیکیورٹی والے وہاں سے فاصلے پر بے ہوش ملے۔۔۔۔" جاوید نے تسلی سے بات کا آغاز کیا۔ دلاور صاحب پوری توجہ سے اسے سن رہے تھے۔

"انہیں ہوش میں لانے کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ آگ حادثاتی طور پر نہیں لگی تھی۔۔۔۔ بلکہ کسی نے جان بوج کر لگائی تھی۔۔۔" اس نے سنگین تاثرات بنائے ہوئے کہا۔

اس کا انکشاف سن کر ان سب کے اوسان خطا ہو گئے وہ شاک کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔" دلا اور صاحب کو مانوا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے بھی پہلے یقین نہیں آیا۔۔۔۔۔ میں ان تینوں کو اپنے ساتھ forensic

examination کے لیے لیں گیا۔۔۔۔۔ وہاں بھی یہی تصدیق ہوئی کہ انہیں صرف

انجیکشن سے بے ہوش کیا گیا اور جانی نقصان سے بچانے کے لیے دور لے جایا گیا تھا۔۔۔"

جاوید پرو فیشنل انداز میں انہیں تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

"پرکس نے کیا ہے یہ سب۔۔۔" اب کی بار سوال پریشان کھڑی عابدہ بیگم کی طرف سے ہوا۔

"سیکیورٹی سسٹم تو سارا کمپنی کے ساتھ ہی جل گیا۔۔۔۔۔ ان میں سے ایک سیکیورٹی اہلکار کے موبائل میں سسٹم کنکیشن کے ذریعے بس گیٹ کھلنے سے پہلے کا صرف یہ ایک کلپ ریکارڈ ہوا ہے۔۔۔۔۔" جاوید اب لیپ ٹاپ پر جھک کر انہیں وہ کلپ دکھانے لگا۔

اس کلپ میں نقاب پوش لڑکے کی پشت تھی۔ لونگ کوٹ کی ٹوپی نے ہر زاویے سے اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔

اب اور یہ راز چھپائے رکھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ جاوید کو نظر انداز کرتے ہوئے دلاور صاحب کی جانب رخ کر کے بولنے لگی۔ اس نے ایک ایک کر کے اپنے ساتھ ہوئے سارے حادثے بیان کئے۔

"سحر۔۔۔۔۔ اتنا سب ہو گیا اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔" ناچاہتے ہوئے بھی دلاور صاحب کی آواز بلند اور سخت ہو گئی۔ سحر چھنپ سی گئی۔

عابدہ بیگم نے آگے آکر ان کے بازو کو پکڑا۔ دلاور صاحب نے پہلے انہیں دیکھا اور پھر ان کی نظروں کے سمت میں سنجیدہ کھڑے جاوید کو۔

"خان انکل کا مطلب تھا۔۔۔۔۔ اگر تم بتا دیتی تو ہم الرٹ ہو جاتے۔۔۔۔۔ درپیش خطرے کی روک تھام کے لیے قدم اٹھاتے۔" دلاور صاحب کے تند لہجے کی وضاحت جاوید نے پیش کی۔

"پاپا اس کی ایک بلیک لینڈ کروزر کار بھی ہے اور اس کے پاس گن بھی ہے۔۔۔۔۔ یہ کوئی عام پریشان کرنے والا آوارہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ سیریس کر منل ہے۔۔۔" سحر نے مدافعتی انداز میں اس تعاقب کار کے بارے میں مزید اضافہ کیا۔

"کیا اس کار کے شیشے بھی پورے بلیک ہے۔۔۔" صائم نے سحر سے تعجبی نظروں کا تبادلہ کیا۔ اس نے سر اثابت میں ہلایا۔

دلاور صاحب ایک نظر سحر کو دیکھتے پھر صائم کو۔

"پاپا۔۔۔۔۔ میرا ایکسیڈنٹ بھی حادثاتی نہیں تھا۔۔۔۔۔ یہ بلیک لینڈ کروزر جان بوج کر میرے
بانک کے سامنے آگئی تھی۔۔۔۔۔" صائم نے مایوسی سے کہا۔

دلاور صاحب کو یہ تمام باتیں سمجھنے میں وقت لگ رہا تھا جبکہ جاوید کا تیز پولیس والا دماغ فوراً سے سمجھ گیا۔

"اس کا مطلب۔۔۔۔۔ سحر کو تنگ کرنے والا۔۔۔۔۔ صائم کا ایکسیڈنٹ کروانے والا۔۔۔۔۔ اور کمپنی میں آگ لگانے والا۔۔۔۔۔ ایک ہی بندہ ہے۔۔۔۔۔" وہ انگلی اٹھائے چکر کاٹتے ہوئے خود گوئی سے کہے جا رہا تھا۔

"پر یہ کون ہے اور کیوں میری فیملی کے پیچھے پڑا ہے۔" دلاور صاحب بے بسی سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"یہ جو کوئی بھی ہے۔۔۔۔۔ صرف آپ سب کو اذیت پہنچانا چاہ رہا ہے۔۔۔۔۔" جاوید کہتے ہوئے دلاور صاحب کے ساتھ آکر بیٹھا اور ان کا کندھا تھپتھپا کر دلا سہ دیا۔

"مجھے تو اس نے کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔" عابدہ بیگم حیران پریشان آبدیدہ ہو گئی تھی۔

"کیونکہ جب آپ کے بچوں کو یا آپ کے شوہر کو تکلیف پہنچتی ہے۔۔۔۔۔ آپ automatically پریشانی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ اس لیے وہ آپ کو indirectly اذیت پہنچا ہی رہا ہے۔۔۔۔۔" جاوید نے شانے اچکا کر سمجھایا۔

"لیکن یہ چاہتا کیا ہے۔۔۔۔ ہمیں نقصان پہنچا کر کے اسے کیا مل رہا ہے۔۔۔۔" دلاور صاحب بے چارگی سے بول پڑے۔

"یہی تو مجھے بھی سمجھ نہیں آرہا۔۔۔۔ لیکن ایک بات صاف ہو گئی ہے۔۔۔۔ مارکیٹ میں آپ کا کوئی نیا دشمن اٹھ آیا ہے خان انکل۔۔۔۔ آپ سب کو اب بہت محتاط رہنا ہو گا۔۔۔۔" اس نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ایک مرتبہ پھر سے وہ کلپ چلا کر دیکھنے لگا لیکن کالے پوشاک میں اس لمبے چوڑے لڑکے کی پشت کے علاوہ کوئی سراغ نہیں ملا۔



ایک ماہ تک جاوید مسلسل اسی انوسٹیکیشن میں لگا رہا۔ اس نے شہری کپڑوں میں دواہلکار صائم کے ساتھ لگا دیے تھے اور دو کو دلا اور صاحب کے ساتھ۔ اور خود سحر کی سیکیورٹی میں رہتا۔ قدرت نے سحر اور جاوید پر خود ہی ایک دوسرے کا ساتھ مصلحت کر دیا تھا۔ چونکہ سحر نے اس تعاقب کار کو نزدیک سے دیکھا ہوا تھا وہ اسے پہچان سکتی تھی اس لیے جاوید سحر سے کچھ فاصلے پر چلتا تا کہ اس تعاقب کار کو شک بھی نہ ہو اور جاوید اسے پکڑنے میں کامیاب ہو سکے۔

یونیورسٹی کے آتے جاتے جاوید اس کی کار میں بیٹھا ہوتا۔ شاویز آج کل یونیورسٹی کم آیا کرتا تھا۔ عارفہ کو اس کی یاد نہ آئے اس لیے سحر اس کا ذکر نہیں کرتی اور عارفہ تو ویسے بھی اس کا نام تک لینے سے گریزاں تھی۔

اس دن بھی سحر یونیورسٹی سے نکل کر سڑک کے کنارے چل رہی تھی اور وہی دوسرے جانب جاوید گاڑیوں کے پار دوسرے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔

شاویز نے سحر کو اکیلا چلتا پا کر اس کے پیچے جانے کا سوچا لیکن اس کی چال کچھ مشکوک سی لگی۔ وہ چلتے چلتے بار بار رخ موڑ کر دوسری جانب دیکھتی۔ شاویز نے تیز تر از نظروں سے اس کے رخ کے سمت میں دیکھا تو اسے وہاں کانوں میں ایئر پوڈ لگائے محتاط انداز میں چلتا ہوا جاوید نظر آیا۔

شاویز کے آبرو تن گئے۔ تو یہ منصوبہ بندی کی ہے ان لوگوں نے؛ سوچتے ہوئے شاویز تند تاثرات بنائے دوسرے سڑک پر آکر چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ جاوید کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر

چلنے لگا۔ سحر اپنے دھن میں چلتی رخ موڑ کر شرماتے ہوئے جاوید کو دیکھنے لگی تھی کہ ٹھٹک گئی۔

وہ سہم کر اپنی جگہ ساکت کھڑی ہو گئی۔

جاوید نے کنکھیوں سے اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑتے دیکھا تو اسے کال ملائی۔

سحر نے بے یقینی سے موبائل کان سے لگایا۔

"کیا ہوا سحر۔۔۔۔" اسے کال پر جاوید کی آواز سنائی دی۔ اس سے کچھ بولا تک نہیں گیا۔ شاویرز

اپر کی ٹوپی سے چہرہ اچھپائے جاوید کے آوٹ سے آگے بڑھ گیا۔

"سحر۔۔۔۔۔"

"جاوید۔۔۔۔۔ وہ ابھی آپ کے پیچھے سے گزرا ہے۔۔۔۔۔" دوسری دفعہ جاوید نے تندہی سے

سحر کو مخاطب کیا تو اس نے لرزتے آواز میں جواب دیا۔

جاوید نے پھرتی سے ملا تشی نظروں سے آس پاس دیکھا تو دور ہجوم میں اسے اپر پہنے تیز رفتار

سے چلتا مرد دیکھائی دیا۔

"تم سحر کو گھر چھوڑ آؤ۔۔۔" جاوید اپنے ساتھی پولیس والے کو پکارتے ہوئے ہجوم کی جانب

بھاگنے لگا۔

شاویز نے بنا پلٹے ہی جاوید کو اپنے جانب بھاگ کر آتا محسوس کیا تو منہ پر ماسک پہن کر اس نے

بھی دوڑ لگادی۔

اب لوگوں کے رش کو چیرتا ہوا وہ آگے تھا اور جاوید اس کی رفتار سے خود کو ملاتے ہوئے پیچھے۔

جاوید نے رک کر اپنی گن نکالی اور اسے بلند آواز میں رکنے کا کہتے ہوئے ہوائی فائر کیا۔ شاویرز نے رفتار ہلکی کر دی اور ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے۔

جاوید اس کا نشانہ بنا کر دبے پاؤں چلتے قریب جانے لگا۔

"کون ہو تم۔۔۔۔۔ اس طرف منہ کرو۔۔۔۔۔" جاوید سنجیدہ انداز میں کہتے ہوئے تیز چلنے لگا۔

اس سے پہلے کہ جاوید اسے دبوج پاتا شاویرز سڑک پر کھڑے بس پر کود پڑا اور کھمبے پر لٹک کر سامنے بلڈنگ پر چھلانگ لگادی۔

جاوید منہ کھولے پھٹی آنکھوں سے اس نقاب پوش جوان کو ایک بلڈنگ سے دوسرے پر
پھلانگتا ہوا اپنی نظروں سے دور ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔ لوگوں کو خوف و ہراس میں مبتلا نہ کرنے کی
خاطر اس نے دوبارہ فائر نہیں کیا۔

جب وہ تیزی سے بھاگتا پوری طرح آنکھوں سے او جھل ہو گیا تو جاوید نے ہوا میں پیر پٹھا اور
ناکامی لیے مڑ گیا۔



دلاور صاحب گھر کے لاؤنج میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہے تھے۔ عابدہ بیگم اور سحر
مضطرب سی بیٹھی تھیں۔

جب جاوید غصے سے لاؤنج میں داخل ہوا۔

"کیا ہوا جاوید۔۔۔۔۔" اسے طیش میں اندر داخل ہوتے دیکھ کر دلاور صاحب مزید پریشان ہو گئے تھے۔

"ہاتھ سے نکل گیا۔۔۔۔۔ باسٹرڈ۔۔۔۔۔" جاوید نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے دھیانی میں گالی نکالی پھر خواتین کے موجودگی محسوس کر کے چھنپ سا گیا اور خاموش ہو گیا۔

اسے آتے دیکھ کر جو ایک آس دلاور صاحب میں جاگی تھی وہ پھر سے مایوسی میں تبدیل ہو گئی۔

"بہت شاطر ہے۔۔۔۔۔ اتنی تیز رفتار سے بھاگنا اور ایسے پھرتی سے کرتب کرنا۔۔۔۔۔ یہ کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ یقیناً اس نے کوئی خاص تربیت حاصل کر رکھی ہے۔۔۔۔۔ he is something different۔۔۔۔۔" جاوید سوچتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"لمبا قدم۔۔۔۔۔ چوڑی باڈی۔۔۔۔۔ مضبوط muscles۔۔۔۔۔ محنت مشقت سے تنے ہاتھ۔۔۔۔۔ تیز رفتار۔۔۔۔۔ شاطر دماغ۔۔۔۔۔ یہ کسی راہ چلتے غنڈے کی خصوصیات نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ آخر یہ ہے کون۔۔۔۔۔" وہ ہاتھوں کی مٹھی باندھے۔ پیشانی اس پر ٹکائے۔ آنکھیں بند کر کے اس کے فزیکل زاویے یاد کر رہا تھا۔ آخر میں ایک لمبی سانس خارج کر کے وہ اٹھا۔

"آپ فکر نہ کریں خان انکل۔۔۔۔ بہت جلد میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔۔۔۔" جاوید نے دلاور صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے انہیں دلا سہ دیا۔

دلاور صاحب اور ان کی فیملی جاوید کے تعاون سے مشکور ہوتے ہوئے تسلی ہوئی اور سب نے سر اثابت میں ہلا کر اس کی تسکین وصول کی۔



وہ پھولے سانس لیتے ہوئے اپنے فلیٹ میں دلاخل ہوا۔ دروازہ لاک کر کے اپرا تار پھینکا اتنی تیز دھوپ میں اپر پہن کر بھاگتے ہوئے اسے گرمی لگ گئی تھی۔ میز پر ٹانگیں پھیلا کر وہ صوفے پر سستانے بیٹھ گیا۔

"جاوید تو کیا۔۔۔۔۔ پوری پولیس فورس بھی تم مجھے ڈھونڈنے لگا دو دلاور پرویز خان۔۔۔۔۔
جب تک میں خود نہ چاہوں۔۔۔۔۔ تم مجھ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔۔۔" شاویز نے استخزیہ
ہنستے ہوئے خود کلامی کی۔

"میری وہ جھلک بھی میں نے اپنی مرضی سے دکھائی تھی۔" شاویز نے اس ویڈیو کلپ کے
بارے میں یاد کرتے ہوئے کہا۔

"تاکہ تمہیں پتا لگے۔۔۔۔۔ تمہارا کس سے پالا پڑا ہے۔۔۔۔۔" اب کی بار اس کی آواز میں سختی
در آئی تھی۔

وہ صوفے سے اٹھا اور کمرے میں آکر پینٹ میں پھنسانی گن نکال کر ٹیبل پر رکھی۔ وہ چاہتا تو
اس وقت اپنی گن نکال کر جاوید پر جوابی حملہ کر سکتا تھا لیکن وہ گن اسے سیفٹی کے لیے ایجنسی
کے جانب سے ملی تھی اور وہاں سے مہیا کی گئی گن کا ڈیزائن عام اسلحہ سے کچھ مختلف ہوتا ہے جو

صرف آرمی یا پولیس سے وابستہ لوگ ہی محسوس کر پاتے ہیں؛ اگر وہ جاوید کے سامنے اپنی گن نکالتا تو وہ اس گن کا ماڈل پہچان جاتا؛ اس لیے شاویز نے اپنے پاس گن ہونا بھی ظاہر نہیں کیا۔



مسلسل ناکامی کی وجہ سے جاوید کو پہلی بار شکست خوردہ محسوس ہوتا۔ وہ دلاور صاحب کے رو بہ رو کم آیا کرتا حالانکہ ان کی فیملی نے کبھی جاوید کو یہ چیز ظاہر نہیں کروائی۔

یونیورسٹی کا دوسرا سمسٹر شروع ہو گیا تھا۔ صائم سحر عارفہ تینوں ہی اپنے معمول کی زندگی میں آگئے تھے۔ جاوید کی آج کل ڈیوٹی انتخابی ریلی کے حفاظتی انتظامات پر نظر رکھنے لگائی گئی تھی۔ اس لیے وہ سحر کے ساتھ خود نہیں آسکتا تھا تو اس نے اپنا ایک اہلکار لگا دیا تھا۔

صائم کو ان دنوں کمپیوٹر کا کوئی خاص اسائنمنٹ ملا تھا۔ وہ کافی دنوں سے شاویز کو ریکویسٹ کر رہا تھا کہ بنانے میں اس کی مدد کر دیں اور بالآخر شاویز آج دلا اور صاحب کے غیر موجودگی میں ان کے گھر اس کی اسائنمنٹ بنانے کے لیے آنے پر مان گیا۔

وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے ملا تیشی نظروں سے آس پاس دیکھتا ان کے لاونج میں داخل ہوا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ بوڑھی زبیدہ خالہ بڑے صوفے پر بیٹھی تھی۔ عابدہ بیگم کچن میں ملازمہ کے ساتھ ان کے لیے چائے کا اہتمام کرنے لگی تھی۔

شاویز تنے ہوئے اعصاب سے ان کے پاس آیا۔ اسے آتے دیکھ کر دائی ماں بھی تعجب اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات سے گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو دائی ماں۔۔۔" شاویز نے ان کا بازو جھنجھوڑ کر دانت پر دانت جمائے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔ تم کیسے جانتے ہو ان لوگوں کو۔۔۔" دائی ماں نے اس کا سوال نظر انداز کر کے متفکر انداز میں ہلکی آواز میں پوچھا۔

ان کا دل ڈوبنے لگا۔

"یا اللہ۔۔۔۔۔ کہی شاوریز کو دلاور کے بارے میں پتا تو نہیں چل گیا۔۔۔۔۔" بوڑھی دائی ماں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ کہی اسے سچائی معلوم ہو گئی تو؛ سوچتے ہوئے زبیدہ خالہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"میں تو صائم سے ملنے آیا تھا پر تم۔۔۔۔۔ یہاں کیسے۔۔۔۔۔" شاویز کو غصہ آنے لگا۔ وہ ہر حد کوشش کر کے دائی ماں کے سامنے اپنا طیش قابو رکھنے کے جتن کر رہا تھا۔

زبیدہ خالہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کوئی بہانہ سوچنے لگی۔

وہ دونوں ابھی اسی شش و پنج میں مبتلا تھے کہ دلاور صاحب دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے رک گئے۔

وہ غور سے زبیدہ خالہ اور شاویز کو اضطراب میں ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے دیکھنے وہی رک گئے تھے۔

"یہ لڑکا کون ہے۔۔۔۔۔ کب سے میرے بچوں کے ساتھ ہے۔۔۔۔۔ بس کچھ ہی ماہ سے۔۔۔۔۔ یہ کون ہے کہاں سے آیا ہے۔۔۔۔۔ خاندان کیسا ہے۔۔۔۔۔ ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔۔۔۔۔" انہوں نے شاویز کو بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔

دلاور صاحب سر تا پیر شاویز کو مشاہدہ کرنے لگے۔ انہیں جاوید کی اس تعاقب کار کے بارے میں کہی باتیں یاد آئی۔

لمبا قد۔ چوڑی باڈی۔ مضبوط بازو۔ تنے ہوئے ہاتھ۔ عام مردوں سے الگ۔

جو جو خصوصیات جاوید نے بیان کئے تھے وہ سب دلاور صاحب کو شاویز میں موجود ملے۔ وہ طیش میں آگئے اور تیز قدموں سے آگے آکر شاویز کے شرٹ کا کالر دبوچ لیا اور اس کا رخ اپنے جانب کیا۔

"تم ہی ہونا وہ۔۔۔۔۔ تم ہی کر رہے ہو یہ سب۔۔۔۔۔" انہوں نے پوری قوت سے غراتے ہوئے کہا۔

ان کی غضب ناک آواز سن کر عابدہ بیگم گھبرا کر کچن سے باہر آگئی وہی دوسرے جانب سحر اور صائم بھی پریشان حالت میں کمرے سے باہر آگئے اور لاؤنج میں بھاگ آئے۔

"کیا چاہتے ہو تم۔۔۔۔۔ کیوں میری فیملی کے پیچھے پڑے ہو۔۔۔" تند و تیز نگاہوں سے شاویز کو گھورتے ہوئے وہ تقریباً دھاڑے تھے۔

شاویز پر سکون انداز میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے جا رہا تھا۔

دلاور بہت نرم مزاج انسان تھے۔ عابدہ بیگم اور بچوں نے کبھی انہیں اس قدر طیش میں نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ سب بہت سہم گئے۔ وہی زبیدہ خالہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ شاویز نے ایسا کیا کر دیا ہے کہ دلاور اس پر ایسے بھڑک اٹھا ہے۔

"ہاہا۔۔۔ ویل ڈن مسٹر دلاور۔۔۔ واقعی جتنا تمہارے بارے میں سنا تھا۔۔۔ تم اس سے کئی زیادہ سمارٹ نکلے۔۔۔ تمہارا وہ سو کالڈ چمچا جاوید۔۔۔ پولیس کا دماغ لے کر بھی اب تک مجھے guess نہیں کر پایا۔۔۔ اور تم نے اس عمر میں بھی فوراً پکڑ لیا۔۔۔ بھئی داد دینی پڑے گی تمہاری۔۔۔" شاویز نے ان کے ہاتھ جھپٹ کر اپنا کالر چھڑایا اور چند قدم دور جا کر دلاور صاحب کی ذہانت پر تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔

"شاویز۔۔۔ یہ کس ٹون میں بات کر رہے ہو تم میرے پاپا سے۔۔۔" سحر کو جاوید کی برائی سن کر جتنا غصہ آیا تھا اتنا ہی شاویز کا اپنے پاپا سے بد تمیزی سے بات کرنے پر۔

شاویز اس کی بات کو مکمل نظر انداز کر گیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ آج وہ اپنے دشمن کے بالکل روبہ رو تھا۔ آج اسے دلاور پرویز خان کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ آج پانی اس کے سر سے اوپر ہو چلا تھا نہ وہ اب پکڑے جانے کے خوف میں تھا اور نہ کسی خطرے سے تشویش میں۔

"ہاں میں نے ہی کیا ہے وہ سب۔۔۔۔۔ سحر کو دھمکانا۔۔۔۔۔ صائم کا ایکسیڈنٹ۔۔۔۔۔ اور تمہاری کمپنی کو جلا ناسب میں نے کیا۔۔۔۔۔" اس نے اعلانیہ صورت میں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے اعتراف کیا۔

دلا اور صاحب کاشک یقین میں بدل گیا۔ عابدہ بیگم اور سحر بے یقینی سے سانس روکے کھڑی رہی جبکہ صائم کے آبرو تن گئے۔

سحر لرزتے ہاتھوں سے موبائل پر جاوید کا نمبر ملانے لگی۔ اس کی انگلیاں منجمد ہو گئی تھیں اس سے موبائل کا لاک تک نہیں کھولا جا رہا تھا۔ تیز تیز نمبر ملتے ہی اس نے خوف سے بھیگی آنکھوں کے ساتھ فون کان سے لگایا۔ بیل تو جا رہی تھی لیکن جاوید کا ل اٹھا نہیں رہا تھا۔ جاوید اس وقت ریلی میں ہوئے جھڑپ کو روکنے کی کوشش میں لگا تھا اسے اپنے فون کا دھیان ہی نہ تھا۔

"کیوں کر رہے ہو تم یہ سب۔۔۔۔ کیا چاہیے تمہیں۔۔۔۔" دلاور صاحب نے مدافعتی انداز میں پوچھا۔ انہیں شاوہر معمولی بلیک میلر لگا جو پیسوں کے لیے بزنس مین کو یا اس کی فیملی کو تنگ کیا کرتے ہیں۔

"مجھے بدلہ چاہیے۔۔۔۔۔ آج تمہارے منہ پر میں تمہیں کہتا ہوں۔۔۔۔۔ میں تمہیں برباد کر کے رہوں گا دلاور پرویز خان۔۔۔۔۔ اور تم کچھ نہیں کر پاؤ گے۔۔۔۔۔" شاویز نے چیلنج دینے کے انداز میں کہا

دلاور صاحب آگے بڑھے اور سوٹ کے جیب سے گن نکال کر شاویز کے سینے پر تان لی۔

"اس سے پہلے میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" انہوں نے غراتے ہوئے کہا۔ سب کے

اوسان خطا ہو گئے۔

عابدہ بیگم نے چیخ رو کئے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ سحر تو بت بنی کھڑی رہی آج تک اس نے کبھی اپنے پیپا کو کسی سے سخت لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا اور آج وہ انہیں کسی پر گن تانے مارنے کی بات کرتے سن کر بے حس ہو گئی۔ جبکہ صائم بے تاثر تھا۔

سحر نے جلدی سے خود کو کمپوز کیا اور پھر سے جاوید کو کال کرنے لگی۔ وہ نہیں چاہتی تھی غصے میں اس کے پاپا کے ہاتھوں کسی کا قتل ہو جائے۔ بیل مسلسل بج رہی تھی لیکن جواب نہ آتا۔

شاویز ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے طنزیہ انداز میں دلاور صاحب کو دیکھ رہا تھا کہ زبیدہ خالہ ہڑبڑا کر قریب آئی اور دلاور کا گن پکڑا ہاتھ تھام لیا۔

"خدا کے لیے دلاور۔۔۔۔۔ ایسا گناہ مت کرنا۔۔۔۔۔ ورنہ آج ایک باپ کے ہاتھوں بیٹا قتل ہو جائے گا۔۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے کانپتے کانپتے التجائی انداز میں کہا۔

لاؤنج میں موجود سب ہی کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ مانوسر پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے سناٹا سا چھا گیا۔

"دائی ماں یہ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔ یہ میرا باپ نہیں ہے۔۔۔۔۔" شاویز کا تحمل ڈگمگا گیا وہ دائی ماں پر چلا پڑا۔

"یہی تیرا باپ ہے شاویز۔۔۔۔۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر شاویز کو تھامنا چاہا لیکن وہ نفی میں سر ہلاتے پیچھے ہو گیا۔

دلاور صاحب کی گن پر گرفت سست پڑ گئی تھی۔ عابدہ بیگم سحر اور صائم تینوں کو سانپ سو نگھ گیا تھا ان سے کوئی رد عمل دیا ہی نہیں گیا۔ وہ سب پھٹی نظروں سے زبیدہ خالہ کے آنسوؤں سے تر چہرے کو دیکھنے لگے۔

"نہیں۔۔۔۔ یہ جھوٹ ہے۔۔۔۔" شاویز نے اضطراب میں ان کی بھیگی آنکھوں میں دیکھ کر تصدیق مانگی۔

"یہ سچ ہے۔۔۔۔ اور تم جانتے ہو۔۔۔۔ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔۔۔۔" بوڑھی دائی ماں نے زور دے کر کہا۔ تیز تیز بولتے انہیں سانس چڑھنے لگی تھی۔

شاویز نے لب مینچھ لیئے۔ وہ واقعی جانتا تھا کہ دائی ماں جھوٹ نہیں بولتی۔ اس نے اپنے جذبات قابو کرنے سے پکڑ لیا اور سب سے الگ ایک کونے میں دیوار کی جانب رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"زبیدہ خالہ۔۔۔۔۔ ہوش میں تو ہے آپ۔۔۔۔۔ یہ میرا بیٹا کیسے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے شاویز کے بہ نسبت قدرے نرمی سے زبیدہ خالہ کو مخاطب کیا۔ ابھی ان کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ زبیدہ خالہ کے زبان سے نکلنے والے الفاظ سے دلاور صاحب کے قدم لھڑکرا گئے۔

"شاویز۔۔۔ تمہارے اور زرتاج کا بیٹا ہے دلاور۔۔۔۔۔" دائی ماں نے کانپتے زبان سے کہا۔

شاویز نے ان سب کے سامنے اپنی ماں کا نام لیئے جانے پر آنکھیں سختی سے میچھ لی۔ اس سے یہ حقیقت برداشت نہیں ہو پارہی تھی۔

سُن عصاب کھڑی عابدہ بیگم نے مضطرب سی رخ موڑ کر دلاور صاحب سے کچھ کہنا چاہا لیکن
 زرتاج کا نام سن کر ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ ان کامیاں اس نام
 سے واقف ہے۔

مطلب ان سے پہلے دلاور کی زندگی میں کوئی اور عورت تھی جس سے ان کا ایک بیٹا بھی ہے؛
دل میں سوچتے ہوئے عابدہ بیگم نے شاویز کی پشت کو دیکھا اور صوفے پر بیٹھ کر رونے لگی۔

سحر ماما کو ٹوٹا دیکھ کر دل گرفتگی سے دلاور صاحب کے پاس آئی اور ان کا بازو جھنجھوڑا۔

"پاپا۔۔۔۔۔ یہ سب جھوٹ ہے نا۔۔۔۔۔ کہیئے نا۔۔۔۔۔ یہ صرف اس اماں اور شاویز کی ملی
بھگت ہے۔۔۔۔۔ یہ ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔۔۔۔۔ پلیز پاپا۔۔۔۔۔ کہیئے۔۔۔۔۔" سحر
نے آبدیدہ آواز میں پاپا سے سوال کیا۔

دلاور پرویز خان کی ساری ہمت بکھر گئی تھی۔ انہوں نے اداس نظروں سے سحر کو دیکھا۔ اپنی
جوان 23 سالہ بیٹی کو اپنی 26 سال پہلے کردہ غلطی کی وہ کیا صفائی پیش کرتے۔ انہوں نے
مایوسی سے اپنا بازو سحر کے گرفت سے آزاد کروایا اور نظریں چراگئے۔

عابدہ بیگم جو سانس روکے ان کے جانب دیکھ رہی تھی پھر سے رونے لگی۔ دلاور صاحب کی اس حرکت نے مانو ان کے سارے شک و شبہات کو حقیقت میں تبدیل کر دیا تھا۔

عورت چاہے کسی بھی عمر، کسی بھی زمانے کی ہو۔ شوہر کی بے وفائی۔ اس کا کسی اور عورت کے ساتھ ملوث ہونا برداشت نہیں کر سکتی۔

سحر اپنے خالی ہاتھ کو تکتے ہوئے ماما کے ساتھ صوفے پر نڈھال سی بیٹھ گئی اور صائم، اسے بنا پوچھے ہی سب سوالات کے جوابات مل گئے تھے۔ خود کو رونے سے روکنے وہ جبرے سخت کئے ہوئے دوسرے جانب کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

دلاور صاحب دلی کیفیت کو ٹٹولتے افسردہ کھڑے شاویر کی پشت دیکھنے لگے۔ ماضی کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ وہ نام جو سب سے پہلے ان کے دل پر چپ گیا تھا اسے وہ کیسے بھول سکتے تھے۔ زرتاج

سال قبل ##### 26

زرتاج کے والد تو اس کے پیدا ہوتے ہی فوت ہو گئے تھے۔ وہ اور اس کی ماں اس کے ماما کے ساتھ رہتیں تھیں۔ جب زرتاج 15 سال کی ہوئی اور اس کی ماں بھی انتقال کر گئی تو ماما نے اسے زبیدہ خالہ کے یتیم خانے میں ڈال دیا۔

وہی دوسری جانب سرداروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے دلاور پرویز خان میٹرک پورا کر کے آگے کی تعلیمات کے لیے شہر کے کالج میں شامل ہوا اور لڑکوں کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔

دن میں کالج کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ شام میں یتیم خانے کے بچوں کو فی سبیل اللہ کار خیر کی نیت سے فری میں انگلش پڑھانے یتیم خانے آیا کرتا۔ وہاں اس کی اور زرتاج کی ملاقات ہوئی۔

زرتاج 17 سال کی ہوئی تو اس کے ماما سے اپنے کام کاج کروانے کے غرض سے واپس لے گئے۔ وہ خوبصورت سی پیاری مسکان والی لمبے بالوں والی لڑکی اپنے ماما کے سارے گھر کے کام کاج کرتی۔ جھاڑو پونچھا لگانا کپڑے دھونا اور استری کرنا کبھی کبھار روٹی پکانا سالن بنانا۔ برتن دھونا سب اکیلی اسی کے ذمہ تھا۔

زرتاج کو پڑھائی کا بہت شوق تھا وہ بہت ذہین تھی۔ وہ اپنے ماما کے ساتھ واپس اسی شرط پر گئی تھی کہ وہ اسے یتیم خانے پڑھنے بھیجا کریں گے۔

وہ ہر روز دوپہر تک سارے کام ختم کر کے صاف ستھری ہو کر پڑھنے یتیم خانے آ جایا کرتی۔
 زبیدہ خالہ کی بھی وہ دل عزیز تھی۔

اپنے ذہانت سے وہ خود سے چار سال بڑے 22 سالہ دلاور کو پسند آنے لگی۔ زرتاج کو ایک دفعہ پڑھ کر سبق یاد ہو جاتا جو دلاور کو اسے سراہنے پر مجبور کر دیتا۔ ٹین ایتج دلاور کے مستحکم اور سحر انگیز رویے پر فدا ہونے سے زرتاج بھی خود کو روک نہیں پائی۔ اب دونوں کی ایک دوسرے کے لیے دلچسپی بڑھتے بڑھتے دوستی میں تبدیل ہو گئی۔

کلاس شروع ہونے سے پہلے اور ختم ہونے کے بعد بھی وہ دونوں کافی دیر بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے۔

دلاور پرویز خان سرداروں کے خاندان میں سے تھا۔ وہاں اپنی مرضی سے کوئی پانی تک نہیں پی سکتا تھا ایسے میں دلاور نے دادا اور والد کے علم میں لائے بغیر زرتاج سے دوستی کر لی تھی۔

زرتاج کی سہیلیوں سے تو ان کی دوستی چھپی نہ چھپ سکی تھی جب کہ دلاور کے صرف ایک دوست بلال حمید کو ان کی دوستی کا علم تھا۔ وہ بھی اس نے دلاور کو کسی لڑکی کے ساتھ گھومتے دیکھ لیا تھا اور مجبوراً دلاور کو بلال سے اپنی اور زرتاج کی دوستی کا اعتراف کرنا پڑا تھا۔

دو سال تک یہ رشتہ ایسی چلتا رہا کہ 20 سالہ زرتاج کے لیے اس کا ماما ایک رشتہ لے آیا۔ اس وقت موبائل فون رکھنا صرف امیروں کی بس کی بات ہوا کرتی۔ اس لیے وہ دلاور کو آگاہ نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی ماما کے لائے رشتہ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔



ایک رات وہ ماما می کے سو جانے کے بعد اپنے چند جوڑے کپڑے کچھ نقدی اور اپنی ماں کے زیور بیگ میں ڈال کر رات کے آخری پہر گھر سے نکل گئی۔

صبح فجر کا سما تھا کہ ہاسٹل میں دلاور کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ عنودگی کے حالت میں آنکھیں مسلتا ہوا بیڈ سے اٹھ کر دروازے پر آیا اور دروازہ کھولا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا۔ ہاسٹل کے ملازم کے ہمراہ زرتاج چادر اوڑھے کندھے پر بیگ ڈالے متذبذب سی کھڑی تھی۔

"یہ میڈم آپ سے ملنے کی ضد کر رہی تھی۔۔۔۔" ملازم نے دلاور کو متوجہ کیا۔

دلاور نے سر اثابت میں ہلایا اور ملازم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے زرتاج کو کمرے کے اندر لے آیا۔

"زرتاج۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو۔۔۔" دلاور اسے اس طرح بیگ لیے دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔

"میں نے ماما کا گھر چھوڑ دیا دلا اور۔۔۔۔۔ وہ میری کہی اور شادی کروا رہے تھے۔۔۔۔۔" زرتاج نے دل گرفتگی سے کہا اور اداس سی اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

25 سالہ جوان دلاور شاہک سہا ہو گیا۔

"کیا۔۔۔۔۔ زرتاج تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ انہیں منع کر دیتی۔۔۔۔۔ یا مجھے بلا لیتی۔۔۔۔۔ پر گھر چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔" دلاور اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیجنا چاہتا تھا۔

کی یہ باتیں اسے مایوس کر رہی تھیں۔

کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔

نے پر امید انداز میں پوچھا اور ہاتھ بڑھا کر دلا اور کے ہاتھ پر رکھا۔

"زرتاج۔۔۔۔ تم جانتی ہو۔۔۔۔ میں سیٹل نہیں ہوں۔۔۔۔ ابھی تک میں آغا جان اور بابا جان پر منحصر ہوں۔۔۔۔۔ اور تمہیں میرے خاندان کا بھی اچھے سے معلوم ہے۔۔۔۔۔ میری ابھی اپنی مرضی سے شادی کرنے کی حیثیت نہیں ہے۔" دلاور نے دادا اور والد کا نام لے کر زرتاج کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

"پر میں تو یہی سوچ کر آپ کے پاس آئی ہوں دلاور۔۔۔۔ کہ آپ مجھ سے شادی کریں گے۔۔۔۔۔ میرا سہارا بنے گے۔۔۔۔" زرتاج نے اشک بار آنکھوں سے دلاور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

دلاور کو زرتاج کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تکلیف ہونے لگی وہ نظریں چرا کر اپنا ہاتھ زرتاج کے نرم ہاتھوں سے نکال کر اٹھ گیا۔

"یہ بہت ر سکی ہے۔۔۔۔۔ میرے گھر پر پتا چلے گا تو سردار اختر خان اور پرویز خان اپنی عزت اور اپنا بھرم برقرار رکھنے۔۔۔۔۔ میرے اور تمہارے ساتھ کیا کر گزرے گے یہ تم سوچ بھی نہیں سکتی۔۔۔۔۔" دلاور نے درپیش مسائل کے اندیشے سے واقف کرتے ہوئے بے بسی سے کمریہ ہاتھ رکھ لیئے۔

زر تاج کچھ لمحے خاموش رہی پھر آنکھیں بند کر کے سارے آنسو اپنے اندر اتارے اور گیلی سانس اندر کھینچ کر کھڑی ہو گئی۔ پیروں میں رکھا بیگ اٹھالیا اور دروازے کے جانب بڑھ گئی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ میں آپ کے لیے پریشانی کا باعث نہیں بننا چاہتی۔۔۔۔ میں واپس چلی جاتی ہوں۔۔۔۔ ماما کو جس سے میری شادی کروانی ہے۔۔۔۔ کروادیں۔۔۔۔ میں آپ کی محبت دل میں دبا کر کسی اور کے نام ہو جاؤں گی۔۔۔۔" زرتاج نے لرزتے آواز میں کہا۔

"اگر یہ نہ کر سکی تو۔۔۔۔۔ سمندر میں کود کر جان تو دے ہی سکتی ہوں۔۔۔۔۔" آخری فقرہ کہتے ہوئے وہ مایوس ہو گئی اور رونے لگ گئی۔

اس نے دروازہ کھولنے دروازے کے ناب پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دلاور نے اسے بازو سے پکڑ کر اس کا رخ اپنے جانب کیا۔

دلاور اسے دونوں کندھوں سے تھامے ہوئے تھا۔ زرتاج اس سے نظریں ملانے سے کترار ہی تھی وہ بھیگے رخسار لیے نیچھے دیکھے جا رہی تھی۔

دلاور اپنی محبت کے آگے ہار گیا۔ اس نے مضبوطی سے زرتاج کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

"تمہیں کہی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ مجھے تھوڑا وقت دو۔۔۔ میں کچھ کرتا ہوں۔۔۔" دلاور نے اپنے پرکشش انداز میں اسے تسلی دی۔ وہ مطمئن سی ہو کر مسکرا دی۔



ماحول کا تناؤ کچھ کم ہوا تو رات بھر کی تھکی ہاری زرتاج وہی ہاسٹل کے کمرے میں دلاور کے بیڈ پر لیٹ کر تھوڑی دیر کے لیے سو گئی۔

دلاور آج یونیورسٹی نہیں گیا۔ وہ اضطراب میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہا تھا۔

کیا وہ زرتاج سے شادی کر لے۔ یا وہ اسے اپنے ساتھ گاؤں لے جائے۔ آغا جان اور بابا جان کو کیا جواب دیں۔ کس منہ سے وہ یہ کہے کہ وہ زرتاج سے محبت کرتا ہے۔ پر اس طرح وہ اسے ہاسٹل میں نہیں رکھ سکتا۔ نہ وہ بغیر کسی آمدنی کے الگ گھر میں رہ سکتا ہے اور رہے بھی تو کس نام سے۔ بنانا کاح کے وہ زرتاج کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ آخر ہے تو وہ سردار قبیلے کا؛ سوچتے سوچتے وہ بے بسی سے سر پکڑ کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا۔ رخ موڑ کر سوئی ہوئی زرتاج کے چہرے کو دیکھا۔ ایک پل کے لیے اسے زرتاج سے محبت کر کے اسے آس اور امید میں مبتلا کرنے پر اسے افسوس ہوا لیکن اگلے ہی پل اس نے سر جھٹک کر خیال بدل دیا۔ آگر وہ ناہوتا تو کوئی اور ہوتا اور وہ پتا نہیں کس شخصیت کا حامل ہوتا۔ معصوم زرتاج کو اپنی باتوں میں پھنسا کر اس کی زندگی خراب کر دیتا؛ سوچتے ہوئے دلاور کو زرتاج کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ کسی اور کو زرتاج کی زندگی سے کھینے نہیں دے سکتا۔ اب جو بھی کرنا ہو گا اسے ہی کرنا ہو گا۔ وہ فیصلہ کرنے کے انداز سے اٹھا۔

زرتاج کو جگایا۔ اس کا بیگ کندھے پر ڈالا اور اسے ساتھ لیے، مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے کمرے سے باہر آیا اور محتاط انداز میں اسے باقی لڑکوں کی نظروں سے بچاتے ہوئے کوریڈور میں تیز تیز چلنے لگا۔

زرتاج چادر اوڑھے ہوئے اس کے آٹ میں چھپ کر خوفزدہ سی دلاور کے ساتھ چلتے چلتے رک گئی۔

دلاور کا دوست بلال حمید ان کے سامنے آگیا تھا۔ زرتاج نے ایک نظر اسے دیکھا پھر نگاہیں جھکا دی۔ دلاور اور بلال ہلکی سرگوشی کے انداز میں بات کرنے لگے۔

شاید وہ زرتاج کو وارڈن کے نظروں سے چھپا کر ہاسٹل سے نکالنا چاہتے تھے اس لیے بلال بھی ان کے ساتھ زرتاج کے سامنے چلنے لگا۔

گیٹ سے باہر نکل کر دلاور اور زرتاج کی سانس میں سانس آئی۔ رکشے میں سوار ہو کر زرتاج نے دلاور کے چہرے کو دیکھا تو فکر مندی اضطراب پریشانی سب کے ملے جلے ایثار جھلک رہے تھے۔ زرتاج کو بہت افسوس ہوا کیونکہ اس نے اپنی وجہ سے دلاور کو مشکلات سے دوچار کر دیا تھا۔ احساس ندامت میں دب کر زرتاج سے یہ تک نہ پوچھا گیا کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ اس نے رخ پھیر کر دل میں فیصلہ کیا کہ اگر دلاور اسے سمندر پر لے جا کر کودنے کا بھی کہہ دے تو وہ خوشی خوشی کود جائے گی۔



رکشے سے وہ دونوں زبیدہ خالہ کے یتیم خانے کے سامنے اترے۔

تو کیا دلا اور مجھے زبیدہ خالہ کے پاس چھوڑنے آئے ہے؛ سوچتے ہوئے زر تاج نے دلاور کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور پھر خاموشی سے سامنے دیکھنے لگی۔

اسی طرح خاموش چلتے ہوئے وہ دونوں اندر آئے۔ زبیدہ خالہ انہیں دیکھ کر خوش ہوتی ہوئی ان کے پاس آئی۔ انہیں پیار کر کے بیٹھک میں بیٹھایا۔

"زبیدہ خالہ اس شہر میں، میں آپ کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا۔۔۔۔۔ آپ کے علاوہ میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔۔۔" حال احوال دریافت کر لینے کے بعد دلاور نے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

"ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔" اس نے بنا وقت ضائع کئے مدد کی بات کی۔

زبیدہ خالہ اس کی بات پر خوش دلی سے مسکرائی۔

پھر انہوں نے لمبی سانس لیتے ہوئے ان کی مدد کرنے کی ہامی بھری۔

زر تاج اور دلاور نے مسکرا کر ایک دوسرے کو مسرت ہوتے ہوئے دیکھا۔



شام تک زر تاج نے خالہ کے ساتھ مل کر یتیم خانے کے کونے میں ایک بڑا کمر اصاف کروایا۔

بیوہ زبیدہ خالہ نے زر تاج کو اپنے سرخ جوڑے میں تازا پھولوں کے بنائے زیور پہنا کر دلہن کے روپ میں تیار کیا۔

زر تاج ویسے بھی پیاری سی تھی اور سرخ جوڑے میں اس کے چہرے پر اور نور چھا گیا تھا۔

مغرب کے نماز کے بعد مسجد کے مولوی صاحب کو بلا کر زبیدہ خالہ کی گواہی میں ان کا نکاح

پڑھایا گیا۔

قبول ہے

قبول ہے

قبول ہے۔

کہہ کر دلاور نے زر تاج کو اور زر تاج نے دلاور کو اپنے شوہر اور بیوی کے روپ میں اپنانے کی منظوری دے دی۔

زر تاج کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آگئی تھیں۔ آخر اس کی محبت کامیاب ہو گئی تھی وہ دلاور کے نام ہو گئی تھی۔

زبیدہ خالہ نے ان دونوں کے پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے انہیں ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ پھر وہ زرتاج کو لیئے کمرے میں چلی گئی۔

دلاور نے زرتاج کی حفاظت کرنے، اسے غلط باتوں میں پڑنے سے بچانے کے لیے اس سے نکاح تو کر لیا تھا لیکن گھر والوں کو دھوکہ میں رکھ کر اب اسے زرتاج کو اپنانے میں جھجک ہو رہی تھی شہر میں پڑھتا ہی صحیح لیکن تھا تو وہ ایک سردار ہی۔

بیشک اسے زرتاج سے بہت پیار تھا لیکن آغا جان اور بابا جان کو انجان رکھنے کا اسے افسوس ہو رہا تھا اور اس کیفیت نے اسے اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ رات ہونے تک وہی بیٹھک میں بیٹھا رہا۔

زرتاج نئی دلہن بنی بیڈ پر ٹانگیں اوپر کر کے گھٹنوں کے گرد بازو مائل کئے ہوئے بیٹھی دروازے کو دیکھتی دلاور کا انتظار کرتی رہی پروہ نہیں آیا۔

جب سب سو گئے دلاور بھاری قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے در تک تو آیا لیکن اندر جانے سے اسے خوف لگ رہا تھا۔

اگر اس کی فیملی کو اس کے اپنی مرضی سے شادی کر لینے کی حرکت کی خبر ہوئی تو وہ کیا کریں گے؛ یہ سوچ اسے پریشان کرنے لگی تھی۔

زرتاج کو کھڑکی کے پار اضطراب میں ٹہلتے دلاور کا سایہ نظر آرہا تھا۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ گئی تھی اس لیے اسے مزید پریشانی سے نکالنے کے لیے اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ بند کر دی اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔

کمرے کی لائٹ بند ہونے کے کافی دیر بعد جب دلاور کو یہ محسوس ہوا کہ اب تک اس کی نئی دلہن سو گئی ہے۔ اس نے بنا آواز کیے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں چلتا اندر داخل ہوا۔

زرتاج اس کی آہٹ سن رہی تھی لیکن سونے کی اداکاری کرتے آنکھیں موندھے ہوئے تھی۔

دلاور اسی طرح خاموشی سے سامنے پڑے میز اور کرسی کے جانب آیا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پیر میز پر دراز کر دیئے۔

رات کے اندھیرے میں بھی اسے سوئی ہوئی زرتاج کا منور چہرہ اپنے جانب راغب کر رہا تھا۔

اس کا دل بار بار مچھل اٹھتا۔ آخر وہ اس کی منکوحہ تھی۔ کچھ گھنٹے پہلے اس نے زرتاج سے پورے شرعی حیثیت سے اللہ رسول کو گواہ مان کر نکاح کیا تھا۔ وہ پورے حق سے اس کی بیوی تھی۔

زرتاج کے سراپے کو دیکھتے ہوئے دلاور کا کئی دفعہ اس کے پاس جانے کا دل کیا لیکن پھر وہ رخ موڑ کر اپنے جذبات قابو کرنے لگا۔

وہی دوسری جانب زرتاج ہر حد کوشش کرتی اپنے تاثرات نارمل رکھے ہوئے تھی تاکہ دلاور کو اس کے جاگے ہونے کا شک نہ ہو۔



رات کے کس پہر دلاور کی کرسی پر ہی بیٹھے بیٹھے آنکھ لگی تھی اسے احساس نہ ہوا۔

صبح اپنے کندھے پر کسی کے جنبش پر وہ نیند سے جاگا۔ اس نے زبردستی آنکھیں کھولیں۔ پہلے مہندی لگے اس ہاتھ کو دیکھا پھر سراٹھا کر اس چہرے کو۔

زرتاج صبح کی روشنی جیسے تروتازہ خوش باش گیلے بالوں سے۔ چمکتی آنکھوں سے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بنائے اسے جگہ ہی تھی۔

"آپ کو یونیورسٹی جانا ہو گا۔۔۔۔۔ چلے اٹھ کر فریش ہو جائے۔۔۔۔۔ میں ناشتہ لاتی ہوں۔۔۔۔۔" زرتاج نے مسکراتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ناخفگی ناگلہ شکوہ ناحق کی مانگ نارات کے رویے پر شکایت، زرتاج بنا کچھ ظاہر کئے اس کی بیوی ہونے کا حق ادا کرنے لگ گئی تھی۔ خوشی خوشی وہ اس کے خدمت میں جٹ گئی تھی۔

وہ فریش ہو کر آیا تو زرتاج میز پر لوازمات سجائے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ دلاور کرسی پر آکر بیٹھا۔ زرتاج نے اس کے آگے چائے پیش کی۔

"تم بھی اپنے لیے ڈالو۔۔۔" دلاور نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔

زر تاج نے چہکتے ہوئے اس کے ہدایت کی تکمیل کی اور خود بھی اس کے ساتھ ناشتہ کرنے لگی۔

کھانے کے بعد وہ گیٹ تک آیا تو زر تاج بھی اس کے ساتھ گیٹ تک آئی۔

"پھر ملتے ہیں۔۔۔" اس کا بازو تھپتھپا کر دلاور گیٹ کے پار نکل گیا۔

زر تاج کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس کا دل اچانک بجھ گیا۔ وہ افسردہ سی واپس اندر کو پلٹی۔ پتا نہیں کونسی سوچ اس کو اندر سے کھانے لگی تھی کہ اس نے زبیدہ خالہ کی آواز سنی۔

"دلاور چلا گیا۔۔۔۔ ایک دو دن کی چھٹی لے لیتا۔۔۔۔ نئی نئی شادی کی ہے۔۔۔۔"

زبیدہ خالہ نے ہنہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان کے امتحانات ہونے والے ہے۔۔۔۔ اس لیے آج کل پڑھائی کا بوج زیادہ ہے۔۔۔۔"

چھٹی نہیں کر سکتے۔۔۔۔ رات جلدی آنے کا کہا ہے۔۔۔۔" زرتاج نے اپنے کمرے میں

جاتے ہوئے دلاور کی حمایت میں کہا۔

زبیدہ خالہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی لیکن زرتاج نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا وہ ان کی

باتیں سن کر ان سنی کر رہی تھی۔ اس وقت وہ بس اکیلا رہنا چاہتی تھی۔



اس رات زرتاج آدھی رات ہونے تک گیٹ کے پاس دہلیز کے سیڑھیوں پر گھٹنوں کے گرد بازو مائل کئے ہوئے بیٹھی تھی۔ ویران آنکھوں سے وہ اپنے ہاتھوں کی مہندی دیکھنے لگی۔

دل ہی دل وہ دلاور کے ساتھ زیادتی کرنے پر پچھتا رہی تھی۔ وہ اس سے اس طرح شادی کرنے پر راضی نہیں تھا۔ صرف اس کی خاطر وہ مان گیا تھا تو اب بدلے میں اسے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

وہ کبھی آسمان میں چمکتے چاند اور تاروں کو دیکھتی کبھی چاندنی میں اپنے ہاتھوں کی گہرے رنگ کی مہندی۔

اسے دلاور کی محبت پر کوئی شک نہیں تھا لیکن اس سے بھی زیادہ وہ ایک تابعدار بیٹا تھا اس لیے یہ رشتہ اپنانے میں اسے مشکل ہو رہی تھی۔

زرتاج سر جھٹک کر اٹھی اور کمرے میں چلی گئی۔ اتنی رات کے بعد دلاور نہیں آئے گا وہ جانتی تھی اس لیے مزید انتظار کرنا بیکار تھا۔



اگلے دن دلاور اپنے ویسے کے غرض سے بڑی بریانی کی دیگ اور بوتلیں لے کر آیا۔ یتیم خانے کے سب بچوں اور کارکنان نے دل بھر کر خوش ہو کر کھایا۔

زرتاج دلاور کی اس مہربانی سے محظوظ ہوئی۔ وہ باورچی خانے کے ساتھ کھڑی اسے بچوں کو کھانا بانٹتے دیکھ رہی تھی۔ اس کی دل میں دلاور کے لیے پیار اور عزت اور بڑھ گئی۔ شادی جیسے

بھی کی تھی۔ اس نے چاہے زرتاج کو اپنایا تھا یا نہیں لیکن اس نے سنت نبوی کے مطابق ولیمہ کی رسم ضرور پوری کی۔

عشاء تک دلاور وہی یتیم خانے میں رہا۔ اس کے جاتے وقت زرتاج اپنے کمرے میں تھی۔ وہ اس سے رخصت لینے کمرے میں آیا تو زرتاج الماری سیٹ کر رہی تھی۔ دروازے کی کھلنے کی آواز پر اس نے بنا مڑے دلاور کا اندر آنا محسوس کر لیا تھا۔

دلاور نے قریب آکر اسے کندھے سے تھام کر اس کا رخ اپنے جانب کیا۔ زرتاج نظریں نیچھے کئے کھڑی رہی۔

"زرتاج۔۔۔۔۔ میں تمہارے ساتھ بہت نا انصافی کر رہا ہوں نا۔۔۔۔۔" دلاور نے بے بسی سے کہا۔

"نہیں دلاور۔۔۔۔۔ میں نے جو چاہا وہ آپ نے مجھے دے دیا۔۔۔۔۔ مجھ سے نکاح کیا مجھے اپنا نام دیا۔۔۔۔۔" زرتاج نے اپنے ہاتھ دلاور کے بازو پر رکھے۔

"مجھے آپ سے اور کچھ نہیں چاہیے۔۔۔۔۔ میں پوری زندگی صرف آپ کے نام کے ساتھ ہی گزار دوں گی۔۔۔۔۔" اس نے مسکرا کر دلاور کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اتنا پیار کرتی ہو مجھ سے۔۔۔۔۔" دلاور نے شرارتی انداز میں آبرو اچکا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

ہو رہا تھا تو اپنی نوجوان بیوی کا جیسے اس سے پیار اور اپنائیت کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے تھا۔ کتنی پارسا ہے یہ؛ سوچتے ساتھ ہی دلاور نے زر تاج کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

نازک سی زر تاج لمبے چوڑے دلاور کے حصار میں سماء سی گئی۔ اس کے لیے یہ تسکین ہی کافی تھی کہ وہ اس وقت دلاور کے دل کے اتنے قریب ہے کہ اس کی دھڑکنیں سن سکتی ہے۔

دلاور آنکھیں موندے زر تاج کو بانہوں کے حصار میں مضبوطی سے تھامے اسی طرح کھڑا رہا۔ کچھ لمحے خاموشی سے گزرے پھر اس نے جھک کر زر تاج کے گردن کو چوما۔ زر تاج کسمسائی گئی۔ مدہوشی میں دلاور کے لبوں نے آہستہ آہستہ اس کی گردن سے رخسار تک کا فاصلہ طے کیا۔ زر تاج کے رخسار چوم کر دلاور نے آنکھیں کھول کر زر تاج کے چہرے کو دیکھا۔ وہ آنکھیں موندے تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ اس کی سانسوں کی گرمی نے دلاور کو پورا اپنے قبضے میں کر لیا اور اس نے جھک کر زر تاج کے لرزتے لبوں سے لب پیوست کر دیئے۔

آج تو اس کے چہرے کی چمک دگنی ہو گئی تھی۔ دلاور نے شریر انداز میں اس کے کمر میں بازو ڈال کر اسے اپنے قریب کیا۔ زرتاج کسماسی گئی۔ گڑبڑا کروہ زبیدہ خالہ کو دیکھ دیکھ کر خود کو دلاور کے حصار سے آزاد کروانے لگی۔ شرمساری سے اس کا رنگ سرخ پڑنے لگا۔

دلاور شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے اسے چھوڑنے کے ارادے میں تو نہیں تھا لیکن زبیدہ خالہ کو پلٹتے دیکھا تو ایک جھٹکے کے زرتاج کو چھوڑ دیا اور آگے آکر خالہ سے حال احوال پوچھنے لگا۔



شام کے وقت دلاور ہشاش بشاش ہو کر خوشگوار مزاج میں ہاسٹل پہنچا تو دوستوں کے گروپ نے اسے گھیر لیا۔

"یاد دلاور۔۔۔۔۔ تم تو آج کل نظر ہی نہیں آتے۔۔۔۔۔ کہاں گم رہتے ہو۔۔۔۔۔" ایک دوست نے منہ بھسورتے ہوئے کہا۔

"کچھ وقت دوستوں کو بھی تو دو۔۔۔۔۔ ایسی بھی کوئی ذاتی مصروفیات آن پڑی ہے۔۔۔۔۔" دوسرے دوست نے تیز نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ کہاں اب ہمیں وقت دینے والا ہے۔۔۔۔۔ اس کا دل تو کہی اور لگ گیا ہے۔۔۔۔۔" بلال نے استخزیہ ہنستے ہوئے کہا۔

دلاور نے بلال کی بات پر اسے آنکھیں دکھائی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باقیوں کو اس کے اور زرتاج کے ریلیشن کا پتا چلے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ اب سارا وقت تم لوگوں کو دیا۔۔۔۔۔ چلو کہی
باہر چلتے ہیں۔۔۔۔۔" دلاور نے معاملہ سنبھالنے کے غرض سے انہیں گھومنے چلنے کی آفر دی جو
ان تینوں نے قبول کر لی اور سب گھومنے نکل گئے۔



زرتاج نے بھی وہ دن بہت خوشی خوشی گزارا۔ رات وہ نئے کپڑے پہن کر اپنے شوہر کی راہ
دیکھنے لگی۔ دلاور کے انتظار میں اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔

دلاور نے بہت کوشش کی دوستوں کے بیچ سے اٹھنے کی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح سے اسے روک لیتے۔

ایسا کرتے کرتے انہیں ہاسٹل واپس آتے آتے آدھی رات ہو گئی۔

"اب کہاں چل دیا۔۔۔۔" دلاور ہاسٹل کے گیٹ سے ہی واپس جانے لگا تھا کہ ایک دوست نے ٹوک دیا۔

"وہ۔۔۔۔ ایک رشتہ دار ہسپتال میں داخل ہے۔۔۔۔۔ رات اس کے ساتھ رکنا ہے۔۔۔۔۔ بہت بیمار ہے۔۔۔۔۔ اور اکیلا ہے بے چارہ۔۔۔۔۔ تو بابا جان نے مجھے اس کے ساتھ رہنے کی ہدایت دی ہے۔۔۔۔۔" دلاور نے تیزی سے بہانہ بنایا اور ان کا رد عمل سنے بغیر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

وہ یتیم خانے جانے کے بجائے پہلے مارکیٹ چلا گیا جہاں سے اس نے کپڑے جوتے چادر ایک سونے کی چین اور بھی بہت تحفے لیے۔



زرتاج کی انتظار کرتے ہوئے آنکھ لگ گئی تھی۔ اس کی نیند تب کھلی جب اسے ایک نرم اور خوشبودار چیز اپنے گال پر پڑتی محسوس ہوئی۔

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تو دلا اور مسکراتے ہوئے اس کے سرہانے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا گلدستہ پکڑے بیٹھے تھے۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور ان کے ہاتھ سے گلدستہ لیں کر تازا پھولوں کی خوشبو سونگھنے لگی۔

"سوری۔۔۔ آنے میں دیر ہو گئی دوستوں کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔۔۔ آنے ہی نہیں دے رہیں تھے۔۔۔" دلاور نے ہنہ کرتے ہوئے کہا اور جھک کر اسے باقی شاپنگ دکھانے لگا۔

"اتنی دیر ہو گئی تھی۔۔۔ تو کوئی بات نہیں تھی۔۔۔ کیوں تکلف کیا۔۔۔ آج ہاسٹل میں سو جاتے۔۔۔" زرتاج اتنی ساری شاپنگ دیکھ کر مسرور ہونے لگی۔

"ہممم۔۔۔ کہہ تو ٹھیک رہی ہو۔۔۔ لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا۔۔۔ ایک ہی رات میں تمہاری عادت سی ہو گئی۔۔۔" دلاور نے دل فریبی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

زرتاج ان کی رومانٹک باتوں سے بلش کرنے لگی اور ان کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ پکڑ کر دیکھنے لگی۔

"یہ سب میرے لیے لائے ہیں۔۔۔۔" اس نے سوٹ کھول کر دیکھتے ہوئے موضوع گفتگو بدل دی۔

وہ ایک ایک کر کے سب چیزیں دیکھتے ہوئے چہک اٹھی تھی۔ بیڈ پر سے اتر کر وہ بار بار کپڑے جوتے شال چادر اپنے ساتھ لگا کر کبھی آئینہ میں سر تا پیر خود کو دیکھتی کبھی کیسی لگ رہی ہوں؛ کہہ کر دلاور سے اس کی رائے پوچھتی اور وہ اس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ پاتا۔ ساری شاپنگ پھر سے سیٹ کر کے اس نے چیزیں الماری میں رکھنا شروع کیا۔

دلاور بیڈ پر سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور وہ سونے کی چین اس کے آگے لہرائی۔

وہ بھاری اور قیمتی چین دیکھ کر زرتاج کی گہری آنکھیں پھیل گئی۔

"دلاور۔۔۔ اتنا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔" اس نے معصومیت سے آنکھیں
جھپکاتے ہوئے کہا۔

"ہماری شادی کا تحفہ ہے۔۔۔" محبت بھرے انداز میں کہتے ہوئے دلاور نے اپنے ہاتھوں سے
وہ چین زرتاج کو پہنایا اور اس کے چہرے کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بناتے ہوئے اس کی پیشانی پر
بوسہ دیا۔



دلاور نے اس دن دوستوں کے تبصروں کے بعد سے زر تاج کے پاس دن میں جانے کا وقت مقرر کیا۔ یونیورسٹی سے وہ یتیم خانے چلا جاتا اور عشاء تک وہی رہتا پھر واپس ہاسٹل آ جاتا اور رات وہی سوتا۔

اس نے پڑھائی کے اخراجات بڑھا کر بابا جان سے اپنا خرچہ بھی ڈبل کروا دیا تھا جس سے آدھے سے زیادہ حصہ وہ زر تاج کو دے دیا کرتا۔

زر تاج نے جب سے دلاور سے نکاح کیا تھا مانو پروان چڑھ گئی ہو۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا۔ صحیح معنوں میں وہ اس کے شوہر ہونے کا ہر فریضہ سرانجام دے رہا تھا۔

تین ماہ تک زندگی حسین گزر رہی تھی کہ ایک دن دلاور نے یونیورسٹی سے اپنے پیچھے کسی کو تعاقب کرتے محسوس کیا۔ وہ کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے اپنی بابت کارخ بدل گیا۔ یتیم خانے کی گلی میں جانے کی بجائے وہ موڑ کاٹ کر دوسری سڑک پر آگیا اور گھومتا پھرتا ہاسٹل آگیا۔

اس دن وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ کیا وہ اس کے بابا جان کا مخبری تھا یا زر تاج کے ماما کا کوئی جاسوس جو اس کا تعاقب کر رہا تھا؟ سوچتے ہوئے وہ پورا دن ہاسٹل میں ہی رہا۔

زر تاج رات گئے تک جب دلاور نہ آیا تو پریشان ہو گئی تھی۔ وہ مضطرب سی سحن میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہی تھی اور مسلسل دلاور کی خیریت سے ہونے کی دعائیں کرتی رہی۔

"زرتاج۔۔۔۔ آجائے گا دلاور۔۔۔۔ کیوں پریشان ہو رہی ہے۔۔۔۔ مصروف ہو گیا ہو گا۔۔۔۔ جا کر سو جا۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے آواز لگائی۔

زرتاج بے حد پریشان تھی اسے الگ الگ وہمات ستائے جا رہے تھے۔ دل میں وسوسے ہونے لگے۔

"یا اللہ۔۔۔۔ دلاور ٹھیک ہو۔۔۔۔ وہ خیریت سے ہو۔۔۔۔ انہیں کوئی مشکل درپیش نہ ہوئی ہو۔۔۔۔ کوئی خطرہ نہ پڑ گیا ہو۔۔۔۔" اس نے آسمان کے جانب ہاتھ اٹھا کر روتے ہوئے دعا مانگی اور بے دلی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔



ان دنوں دلاور نے یتیم خانے جانے سے دوری برتی۔ اس نے ڈاک کے ذریعے ایک خط
زرتاج کو ارسال کیا۔

"زرتاج کئی دنوں سے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی میری حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے
ہیں۔ وہ میرے باباجان کا خبری بھی ہو سکتا ہے اور تمہارے ماما کا جاسوس بھی۔ اس لیے میں
وہاں آنے سے گریزاں ہوں تاکہ مزید کوئی مسئلہ نہ بنے۔ تم بھی زرا احتیاط برتنا جب تک میں
خود نا آؤں اگر میرا نام لے کر بھی تمہیں کوئی بلانے آئے تب بھی تم کسی کا اعتبار مت کرنا۔
زبیدہ خالہ کو بھی مطلع کر دینا کہ محتاط رہے۔ جب مجھے لگے معاملہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ میں اگلے
ہی پل تمہارے پاس آ جاؤں گا۔

I miss you and i love you

Dilawar parwaiz..."

ایک ہفتے تک معاملہ سنبھلنے کے بعد دلاور اس دن پھر سے تحفے تحائف لیے ہنستا مسکراتا یتیم خانے آیا۔

دہلیز کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے بلند آواز میں زرتاج کو صدا لگائی۔ وہ جو باورچی خانے میں اداس بیٹھی تھی دلاور کی پر جوش آواز سن کر کھل اٹھی اور بھاگتے ہوئے باورچی خانے سے باہر آگئی۔

تیزی سے دلاور کے قریب آکر وہ اس کے ہانہوں میں لپٹ گئی۔ دلاور نے مضبوطی سے اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ زرتاج یک دم جذباتی ہو گئی اور سسکتے ہوئے رونے لگی۔

زبیدہ خالہ کے قدموں کی چھاپ اس جانب آتے سنی تو آنسو صاف کرتے ہوئے زر تاج دلا اور
کے حصار سے الگ ہوئی۔

"دلاور۔۔۔۔۔ سب خیریت تو ہے نا۔۔۔۔۔ ہم بہت پریشان ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ زرتاج نے تو رورو کر برا حال کر لیا تھا۔۔۔۔۔" انہوں نے اس کے بازو پر فکر مندی سے ہاتھ رکھا۔

"سب خیریت ہے خالہ۔۔۔۔۔" دلاور نے مسکرا کر انہیں دلا سہ دیا۔



زبیدہ خالہ کو ان کے تحائف پیش کر کے وہ زرتاج کے ہمراہ کمرے میں آیا۔

"میری تو آپ کے بغیر جان نکل گئی تھی دلاور۔۔۔۔ بہت روئی ہوں میں۔۔۔۔" وہ ایک مرتبہ پھر دلاور کے کندھے پر سر رکھ کر فریاد سنانے لگی۔

"جانتا ہوں۔۔۔۔ سمجھتا ہوں۔۔۔۔ میں بھی تم سے دور ہو کر بہت بے چین رہا
ہوں۔۔۔۔" دلاور نے اس کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے کہا اور اسے ساتھ لیئے بیڈ پر آ کر
بیٹھ گیا۔

زرتاج نے سر جھٹک کر سکون کی سانس لیتے ہوئے سر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

"کیا بات ہے دلاور۔۔۔۔۔ آپ پریشان لگ رہے ہیں۔۔۔" زرتاج نے دلاور کے چہرے پر پھیلی مایوسی محسوس کر لی تھی۔

"مجھے گاؤں جانا ہو گا زرتاج۔۔۔۔۔ بابا جان نے بلوایا ہے۔۔۔۔۔" دلاور نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"کیا۔۔۔ انہیں ہمارے بارے میں پتا چل گیا کیا۔۔۔" زرتاج نے متفکر انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ انہیں کچھ نہیں پتا۔۔۔ بس آغا جان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔۔۔ اس لیے سب کو ملنے بلوایا ہے۔۔۔ مجھے بھی جانا پڑے گا۔۔۔" دلاور نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ واپس تو آئے گے نا۔۔۔ مجھے چھوڑ تو نہیں دینگے۔۔۔ مجھے بھول تو نہیں جائے گے۔۔۔" زرتاج کا رنگ یک دم سے پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کا دل ڈگمگا رہا تھا۔

"کیسے باتیں کر رہی ہو۔۔۔ تم بیوی ہو میری۔۔۔ چھوڑوں گا کیوں۔۔۔ اور بھولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔" دلاور نے اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ ہم نے کچھ غلط نہیں کیا۔۔۔ پورے شرعی طور پر شادی کی ہے۔۔۔ ہمارا رشتہ اللہ کے رضا سے بنا ہے۔۔۔ آگے بھی وہ مدد فرمائے گے۔۔۔ ان پر یقین رکھو۔۔۔" دلاور نے مسکرا کر تسکین دلائی۔ زرتاج نے دل گرفتگی سے تسلی ہوتے ہوئے سر اثابت میں ہلایا۔

"کب تک لوٹے گے۔۔۔" زرتاج نے آنکھوں کے بھیگے کنارے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہممم قریباً ایک ہفتہ لگے گا۔۔۔ میرا انتظار کرو گی۔۔۔" دلاور نے نرمی سے اس کے

رخسار پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں اپنی آخری سانس تک آپکا انتظار کروں گی۔۔۔۔" زرتاج اپنے رخسار پر رکھے دلاور کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مسکرائی۔

اس رات دلاور وہی رہا۔ رات بھر دونوں باتیں کرتے رہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ بتائے
لمحے یاد کرتے رہے۔ صبح زرتاج نے اسے ہستے مسکراتے رخصت کیا اور وہ اپنی منزل کی
طرف روانہ ہو گیا۔



دلاور کو قریبی سٹیشن سے باباجان کی گاڑی لینے آئی۔ وہ گاؤں کے حدود میں داخل ہوا تو سب
بچے بوڑھے جوان جھک کر اس کی خیر مقدمی کرنے لگے۔

اس کے بڑی حویلی میں سب نوکر چاکر تیزی سے کام کرتے نظر آ رہے تھے۔

دلاور کے بابا جان پرویز اختر خان ہاتھ پیچھے باندھے سنجیدہ کھڑے تھے جبکہ دلاور کی اماں اسے دیکھ خوشی سے پھولے نہیں سماء رہی تھی۔

دلاور، ان کا اکلوتا نرینہ اولاد تھی۔ اس کی دونوں چھوٹی بہنیں 16 سے 17 سال کی عمر میں شادی کر کر رخصت کر دی گئی تھی۔

دلاور حویلی کے در کے سامنے کار سے اتر اور تیز قدموں سے سلام کرتا ہوا اندر آیا۔ اماں نے تو خوش دلی سے اس کا استقبال کیا اسے سینے سے لگایا پیار کیا دعائیں دیں۔ لیکن بابا جان نے سنجیدہ انداز میں ہی صرف اس کا کندھا تھپتھپایا۔ دلاور کو کچھ کھٹک محسوس ہوئی۔

"اماں۔۔۔۔ آغا جان کی طبیعت کیسی ہے۔۔۔۔" دلاور نے باپ کے بے تاثر رویے کو نظر انداز کر کے اماں سے داد کا احوال پوچھا۔

"بیٹا۔۔۔ وہ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ چلو تم منہ ہاتھ دھو کر چائے ناشتہ کرو۔۔۔۔۔ پھر مل لینا ان سے بھی۔۔۔۔۔" اماں اسے ساتھ لیئے آگے چل دی۔ دلاور نے جاتے جاتے مڑ کر بابا جان کے نظروں سے چھلکتا غصہ جانچ لیا تھا۔ اس کی چھٹی حس خطرے کا اشارہ دینے لگی۔

"اماں۔۔۔۔۔ سب خیریت تو ہے۔۔۔۔۔ بابا جان غصے میں لگ رہے تھے۔۔۔۔۔" دلاور نے ڈاننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں ایسی لگ رہا ہے۔۔۔۔۔ وہ کیوں غصہ ہونگے۔۔۔۔۔ چلو تم یہ کھاو۔۔۔۔۔ میں تیرے لیے دوسرا پراٹھا بول کر آتی ہوں۔۔۔۔۔" اماں نے جھجکتے ہوئے اس کی بات ٹال دی اور کچن میں چلی گئی۔



اماں کے ہاتھوں سے زبردستی تین پراٹھے کھا کر وہ حویلی کے پیچے کے لان میں آگیا جہاں
سردار اختر خان اپنے ہجرے میں بیٹھے ٹھاٹ دکھاتے ہوئے مونچھے تانے ہاتھ میں حقہ کی
پائپ پکڑے دلاور کو دیکھ رہے تھے۔

آس پاس ان کے تعینات جنگجو بندے موودب انداز میں سینہ تانے کھڑے تھے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے آغاز جان۔۔۔۔۔" دلاور نے سب کی تنقیدی نظریں خود پر گڑھی محسوس کی تو فوراً گلہ کرتے ہوئے ان کی مخبری سے انکاری ہو گیا۔ وہ اس وقت اس درجے پر نہیں تھا کہ آغا جان سے زرتاج کا ذکر کرتا۔

سردار اختر خان نے تیز نگاہوں سے پہلے دلاور کو گھورا پھر اس کے سائیڈ پر کھڑے پرویز خان کو۔

"پھر تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔" ویسے بھی ہم نے تمہارا فاروقی صاحب کی بیٹی سے رشتہ طے کر دیا ہے۔۔۔۔۔" سردار اختر نے بلند آواز میں دلاور کو حکم سنایا۔

دلاور کے تو مانو پیروں تلے زمین نکل گئی۔ وہ سانس روکے اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

"ان کی بیٹی بھی شہر سے پڑھ لکھ کر آئی ہے۔۔۔۔۔ تمہاری اماں مل چکی ہے۔۔۔۔۔ اسے پسند آگئی ہے۔۔۔۔۔ اگلے جمعہ کو تمہاری شادی کروانے کا فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔۔" آغا جان نے حقہ کا کش بھرتے ہوئے کہا۔

دلاور نے بے یقینی اور تعجب سے رخ پھیر کر پردے کی آٹ میں کھڑی اپنی اماں کو دیکھا وہ سر جھکا گئی تھی۔

تاثرات نارمل کرتے ہوئے دلاور کنکارا۔

"آغا جان۔۔۔۔۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے۔۔۔۔۔ پہلے میں پڑھائی تو پوری کر لوں۔۔۔۔۔"

ماسٹرز کی ڈگری حاصل کر لوں۔۔۔۔۔ پھر شادی بھی کر لوں گا۔۔۔۔۔" دلاور اپنے جانب سے انہیں قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"پڑھائی مکمل کرنے سے کون روک رہا ہے۔۔۔۔۔ باقی کی شادی کے بعد کر لینا۔۔۔۔۔" آغا جان ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

"مگر آغا جان۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔"

دلاور کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ بابا جان نے اسے زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ وہ لھڑکرا گیا۔ بے بسی سے اس نے گال پر ہاتھ رکھ لیا۔

تلوار۔۔۔۔۔ میں بھول جاؤں گا کہ تم میری اکلوتی نرینہ اولاد ہو۔۔۔۔۔" بابا جان نے سارے حدود و دبالائے طاق رکھ کر اسے جھڑک دیا۔

دلاور بے دلی سے پیر پٹختا ہوا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے اندر چلا گیا۔

دلاور کے پیچے اس کی اماں بھی اس کے کمرے میں آگئی اور اسے سمجھانے لگی۔

"کیوں اپنے دادا اور باپ کے خلاف جارہا ہے۔۔۔۔۔ آج تک کوئی ان کی بات رد کر پایا ہے کیا۔۔۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"کب تک چلے گا ایسے۔۔۔۔۔ آخر اس گاؤں کو آغا جان اور بابا جان کی غلامی سے کب آزادی ملے گی۔۔۔۔۔ کیوں یہاں کسی کو اپنے حق کے لیے بولنے نہیں دیا جاتا۔۔۔۔۔" دلاور کی آواز میں افسردگی بھرا غصہ تھا۔

"دلاور۔۔۔۔۔ سرداروں کا یہی رسم و رواج ہے۔۔۔۔۔ اور تم اب اپنے بڑوں کے آگے کچھ نہیں بولو گے۔۔۔۔۔ تمہیں میری قسم ہے۔۔۔۔۔" اماں نے اب کی بار اسے تند آواز میں سمجھایا۔

وہ سرد سانس خارج کرتے ہوئے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"دلاور۔۔۔۔۔ عابدہ اچھی لڑکی ہے۔۔۔۔۔ میں ملی ہوں اس سے۔۔۔۔۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گی۔۔۔۔۔" اماں نے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"میری خوشیوں کی یہاں کسی کو پروا ہوتی۔۔۔۔ تو ایک مار کر حاکمیت نہ جتاتا۔۔۔ اور
دوسرا قسم دے کر مجبور نہ کرتا۔۔۔۔" دلاور نے بے رخی سے رخ موڑ کر کہا۔ اس وقت
اس کا غصہ اماں کے پیار سے ٹھنڈا نہیں پڑنے والا تھا۔



زرتاج کی کچھ دنوں سے طبیعت نہ ساز تھی۔ اسے لگا دلاور کے جانے کے غم سے اس کی
طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔

اس دن اسے صبح سے ہی بہت کمزوری ہو رہی تھی تو زبیدہ خالہ اسے محلے کے کونے میں زنانہ کلینک پر لے گئی۔ ڈاکٹر نے اس کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد انہیں خوشخبری کی نوید سنائی۔
زرتاج امید سے تھی۔

زبیدہ خالہ نے تو وہی اسے سینے سے لگا کر دعائیں دیں۔

زرتاج نے سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے اسے اولاد جیسے نعمت سے نوازا۔ اب
زرتاج کو بے صبری سے دلاور کے لوٹنے کا انتظار تھا تا کہ وہ جلد از جلد اس سے یہ خوشخبری
شیئر کریں۔



تین چار دن تک دلاور خاموش رہا تھا۔ جب تک ان کے حویلی میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہو گئی۔

اس دن وہ صبح سے اضطراب میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہا تھا۔ آخر اس نے ایک مرتبہ پھر سے آغا جان سے بات کرنے کی کوشش کرنے کا سوچا۔

وہ محتاط سا چلتا ہوا اپنے کمرے سے باہر آیا۔ آغا جان بڑے صوفے پر بیٹھے تھے ساتھ میں بابا جان بھی تشریف فرما تھے۔ آج تا یا جان بھی ان کے ہاں آئے ہوئے تھے۔

دلاور موودب انداز میں ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے آیا۔ آغا جان نے گردن اکڑا کر غرور سے سرشار نظروں اسے دیکھا۔

باباجان اس کے جانب آئے۔ جہاں تایاجان نے ان کو روک لیا وہی آغا جان نے بھی ہاتھ اٹھا کر انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

"حوصلہ رکھ پرویز۔۔۔۔۔ سر تو کٹے گا۔۔۔۔۔ لیکن اس کا نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ اُس کا۔۔۔۔۔ جس کے لیے یہ ہم سے بغاوت کرنے پر اتر آیا ہے۔۔۔" آغا جان اپنے کندھوں کی چادر درست کرتے ہوئے بالکل دلاور کے روبہ رو آگئے اور رعب دار آواز میں کہا۔

دلاور کی آنکھیں پھیل گئی دل ڈگمگانے لگا۔ اسے پہلی دفعہ خوف سا لگا۔ اپنے لیے نہیں زرتاج کے لیے۔ وہ پکلیں جھپکاتے ہوئے نظریں نیچی کر گیا۔

"نام اور پتا بتاؤ اس کا۔۔۔۔۔ یہی گھسیٹ کر لے آئے گے۔۔۔۔۔ اور تمہاری آنکھوں کے سامنے اس کے ٹکڑے کر دیں گے۔۔۔۔۔ اس بد چلن کی وجہ سے تم ہم سے سرکشی کر رہے ہو۔۔۔۔۔ اسے اس بے حرمتی کی سزا ضرور ملے گی۔۔۔۔۔ بتاؤ کون ہے وہ۔۔۔۔۔" آغا جان نے دلاور کا جبراً مضبوطی سے دبوچ لیا اور انگارہ پڑتی نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر غراتے ہوئے کہا۔

دلاور نے لب مضبوطی سے مینچھ لیے کہ کہی تکلیف کی شدت کی وجہ سے غلطی سے بھی اس کے منہ زرتاج کا نام نہ نکل جائے۔

"آغا جان یہ ایسے نہیں بولے گا۔۔۔۔۔ آپ اس خبیث کو میرے حوالے کریں۔۔۔۔۔" بابا جان اپنے بیٹے کا اپنے آغا جان کے ساتھ بار بار زبان لڑانے پر تپ کر رہ گئے تھے۔

آغا جان نے ایک تند و تیز نظر بابا جان پر ڈالی تو وہ خاموشی اختیار کر گئے۔ پھر انہوں نے اپنے خاص بندے کو آواز لگائی۔

وہ بھاگتا ہوا آیا اور ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر ان کی خدمت میں پیش ہو گیا۔

"حکم سردار آغا۔۔۔۔۔" شیر زمان نے سپاٹ انداز میں پوچھا۔

"شہر جاو۔۔۔۔۔ اور اس لڑکی کو ڈھونڈ کر لاو۔۔۔۔۔" آغا جان نے با اعتماد لہجے میں اسے حکم صادر کیا۔

دلاور کی سانس رکنے لگی دھڑکن تیز ہو گئی وہ خوف و ہراس میں مبتلا ہو گیا۔

کے کہتے ہوئے آغا جان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اپنی دلی کیفیت کو قابور کھنے کی کوشش کرتا وہ سر جھکا کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"پرویز خان۔۔۔۔۔ بارات نکلانے کی تیاری کرو۔۔۔۔۔" کچھ لمحے خاموشی سے گزرنے کے بعد آغا جان نے اسے کچھ کہنے کے بجائے بابا جان کو مخاطب کیا اور اس کے پہلو سے گزر کر آگے چل دیئے۔

انہوں نے شیر زمان کو بھی واپس روک لیا تھا جس کا مطلب تھا انہوں نے دلاور کی معافی قبول کر لی۔

ان کے جانے کے بعد دلاور بھاری قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے بیچ تک آکر اس کی ہمت جواب دے گئی وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

"مجھے معاف کر دینا زرتاج۔۔۔۔۔ میں مجبور ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے ساتھ سے زیادہ۔۔۔۔۔
 مجھے تمہاری زندگی عزیز ہے۔۔۔۔۔ میرے پاس ان کی غلامی کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں
 ہے۔۔۔۔۔ تمہاری جان بچانے کے لیے مجھے ان کا حکم ماننا پڑے گا۔۔۔۔۔" دلاور نے دل
 گرفتگی سے سوچا۔ اس کی آنکھیں بھر آگئی تھیں اور چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔



ایک ہفتہ پورا ہونے تک بھی جب دلاور واپس نہیں آیا تو زرتاج کو اس کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ
 مضطرب رہنے لگی۔ اس نے دلاور پر ویز خان کے نام خط بھی لکھا لیکن ارسال کرنے سے ڈرتی
 تھی کہ کہی دلاور سے پہلے خط اس کے باپ دادا کو نہ مل جائے۔ وہ دلاور کے دوستوں میں بھی

"جی میں شہر سے۔۔۔۔۔ دلاور کا دوست بول رہا ہوں۔۔۔۔۔ زرا دلاور سے بات کرا

دیں۔۔۔۔۔" بلال نے تاثرات نارمل رکھے ہوئے کہا۔

فون کا سپیکر ان تھا اس لیے مخالف سمت سے آنے والی ملازم کی آواز زرتاج بھی سن سکتی تھی۔

"جی سب حویلی والے دوسرے گاؤں گئے ہیں۔۔۔۔۔ آج دلاور صاحب کی شادی ہے۔۔۔۔۔

وہاں کے فاروقی صاحب کی بیٹی کے ساتھ۔۔۔۔۔" ملازم نے موودب انداز میں انہیں وہاں کہ

صورت حال سے روشناس کیا۔

زرتاج کا منہ کھل گیا۔ وہ بنا پلکیں جھپکائے منجند کھڑی رہی۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا۔۔۔۔۔" بلال نے زرتاج کے چہرے کا رنگ زرد پڑتے دیکھ کر دوبارہ

تصدیق کرنا چاہی۔

"بھلا جھوٹ کیوں بولوں گا۔۔۔۔۔ صبح ہی دلا اور صاحب بارات کے ہمراہ روانہ ہوئے ہیں۔۔۔۔۔" ملازم نے برامان کرو ضاحت دی۔

زرتاج سے اس کے آگے کچھ سنا نہیں گیا وہ اٹے قدم دکان سے باہر کو بھاگی۔ اسے اپنے پیچے بلال کی پکار سنائی دی لیکن وہ بنا مڑے سڑک پر بھاگتی رہی۔

یتیم خانے پہنچ کر وہ بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ لاک کر کے اوندھے منہ بیڈ پر لیٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

"آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں دلاور۔۔۔۔۔ آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔" نا چاہتے ہوئے بھی زرتاج کے دل سے آہ نکل رہی تھی۔ بے دلی سے وہ اٹھ بیٹھی ملازم کی کرہٹ بھری آواز اس کے سماعتوں میں گونجنے لگی۔ ایک مرتبہ پھر آسنو جاری ہو گئے۔ دل میں اٹھتے درد کو دبانے اس نے منہ تکیے میں چپا لیا اور بلند آواز آہ وبکا کرتی رہی۔

روتے ہوئے نا جانے اسے کتنا وقت گزر گیا۔ آخر زبیدہ خالہ نے تشویش میں اس کے کمرے کا دروازہ پیٹا۔ زرتاج کے حواس بحال ہوئے تو نڈھال سی بے دم قدموں سے وہ دروازے تک آئی۔

خالہ نے اس کا زرد رنگ سوجی ہوئی آنکھیں مایوس چہرہ دیکھا تو روہانسی ہو گئی۔

"یا اللہ زرتاج۔۔۔۔۔ یہ کیا حال بنا لیا ہے۔۔۔۔۔ کیا ہوا سب خیریت تو ہے۔۔۔۔۔ تم دلاور کو فون کرنے گئی تھی نا۔۔۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہے۔۔۔۔۔" خالہ نے ایک ہی سانس میں اس سے کئی سارے سوال پوچھ ڈالے۔

زرتاج نے ویران آنکھوں سے زبیدہ خالہ کے متفکر چہرے کو دیکھا اور ان سے لپٹ کر پھر سے رونے لگی۔

"زرتاج کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ خدا را میرا دل ڈوب رہا ہے۔۔۔۔۔ کیوں اتنا رورہی ہے۔۔۔۔۔" بتا تو سہی۔۔۔۔۔ "خالہ نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"خالہ۔۔۔۔۔ آج دلاور کی شادی ہے گاؤں میں۔۔۔۔۔" زرتاج نے سسکیاں لیتے ہوئے لرزتے آواز میں کہا۔

زبیدہ خالہ حیران پریشان ہو کر سر کو پیٹنے لگی۔ آخر انہوں نے ہی تو دلاور کے وعدوں پر یقین کر کے ان دونوں کی شادی کروائی تھی۔ اس وقت انہیں زرتاج پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ دل ہی دل وہ خود کو ان سب کا قصور وار ماننے لگی۔

زرتاج کو چپ کرواتے ہوئے خالہ کو اچانک اس ننھی زندگی کا خیال آیا۔

"بس کر زرتاج۔۔۔۔۔ چلو شاباش چپ ہو جا۔۔۔۔۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔۔۔۔۔ چلو اٹھو۔۔۔۔۔ چل کر کھانا کھالیں۔۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ سکتے ہوئے آنسو صاف کرتے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"دیکھ ایسی تیری طبیعت خراب ہو جائے گی۔۔۔۔ اور جو ہوا۔۔۔۔ اُس میں اس معصوم جان کا قصور جو تیرے اندر پل رہی ہے۔۔۔۔ اپنا نہ صحیح تو کم از کم اس بچے کی ہی پروا کر لے۔۔۔۔ ایسی حالت میں بھوکا نہیں رہتے۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے اسے اس کے امید سے ہونے کا احساس دلایا۔

وہ جو مایوس بیٹھی تھی یک دم سے اس کے دل میں ممتا کی چاہت جاگی۔ وہ خالہ کا سہارا لے کر اٹھی اور ان کے ساتھ کچن میں آگئی۔



دو ہفتے مزید گزر گئے دلاور کی کوئی خبر نہیں آئی۔ ناکوئی خط آیا نہ فون اور نہ خود۔
زرتاج ہر وقت خاموش اور ادا رہنے لگی۔

موسم بہار سے گرمی میں تبدیل ہونے لگا۔ ایک صبح وہ صحن میں سیڑھیوں پر گھٹنوں کے گرد بازو مائل کئے ہوئے گرم سم سی بیٹھی تھی کہ اچانک اس نے دہلیز پر شور سنا وہ حیران پریشان ہو کر سیدھی ہو گئی۔ اس نے زبیدہ خالہ کو اپنے جانب بھاگ کر آتے دیکھا۔

"کیا ہوا خالہ۔۔۔۔۔" اس نے انہیں بازوؤں سے تھام کر پوچھا۔

"تو اندر جا کر چپ جا۔۔۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔" زبیدہ خالہ سرگوشی کے انداز میں کہتے ہوئے اسے کمرے کے اندر لے جانے لگی۔

"لیکن ہوا کیا۔۔۔۔۔" وہ ماؤف دماغ سے مڑ کر باہر جھانکنے لگی۔

"تیرا ماما اور وہ آدمی جس سے وہ تیری شادی کروانے والے تھے۔۔۔۔۔ وہ تجھے ڈھونڈتے ہوئے آئے ہیں۔۔۔۔۔ بہت غصے میں ہے۔۔۔۔۔ تجھے جان سے مارنے کی بات کر رہے ہیں۔۔۔" زبیدہ خالہ نے اسے کمرے میں بیٹھاتے ہوئے کہا۔ زرتاج سہم سی گئی۔

"تم یہی رہنا۔۔۔۔۔ دروازہ بند کر دینا۔۔۔۔۔ باہر مت آنا۔۔۔۔۔ میں انہیں سنبھالتی ہوں۔۔۔۔۔" زبیدہ خالہ حواس باختہ ہو کر اسے ہدایت دیتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

ان کے جاتے ہی زرتاج تیزی سے اٹھی اور دوازے کو کنڈی لگا دی۔ کھڑکیاں برابر بند کر دیئے۔ زیر لب دعائیں پڑھتے ہوئے اس نے اپنے پیٹ کے گرد ہاتھ مائل کر دیئے۔

اسے شدت سے دلاور کی یاد آنے لگی۔ اگر اس وقت وہ یہاں ہوتے تو ضرور اس کی حفاظت کرتے۔ اور اب تو وہ اکیلی بھی نہیں تھی اس کے ساتھ ایک اور معصوم زندگی جڑ گئی تھی جس

Visit For More Novels : www.urdu-novelbank.com Page 597
E-mail pdfnovelbank@gmail.com WhatsApp [03061756508](https://wa.me/03061756508)

ایک ماہ تک گاؤں میں رہنے کے بعد اس نے واپس شہر آنے کا سوچا اور اس معاملے میں وہ آغا جان سے بات کرنے پہنچا۔

"تم اب کراچی نہیں رہو گے۔۔۔۔۔" آغا جان نے ناشتہ کرتے ہوئے مصروف انداز میں جواب دیا۔

"آغا جان میرے امتحانات ہونے والے ہیں۔۔۔۔۔ میں مزید یہاں نہیں رک سکتا۔۔۔۔۔" دلاور نے شکست خوردہ آواز میں سر جھکائے ہوئے کہا۔

"ہم تمہیں اور بہو کو امریکہ بھیج رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں کے یونیورسٹی میں تم دونوں کا داخلہ کروادیا ہے۔۔۔۔۔ بہو بھی گریجویشن کرنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔" آغا جان نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

دلاور نے سپاٹ انداز میں تھوڑے فاصلے پر کھڑی عابدہ کو دیکھا۔ 20 سالہ عابدہ نے سر پر ڈوپٹہ لیئے بڑوں کے بیچ احتراماً شوہر سے نظر ملانے سے کتراتے ہوئے نگاہیں نیچی کر رکھیں تھیں۔

"اپنے خاندان کی لڑکیوں کو جہاں پانچویں جماعت تک نہ پڑھایا۔۔۔۔۔ وہاں یہ بہو کو امریکہ سے گریجویشن کروانے چلے ہیں۔۔۔۔۔" دلاور نے ہنہ کرتے ہوئے بے رخی سے سوچا اور سرد سانس خارج کی۔

"چلیں پھر۔۔۔۔ میں کم از کم ہاسٹل جا کر اپنا بقیہ سامان تولے آؤں۔۔۔۔" دلاور نے ڈانگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی آغا جان نے شیر زمان کے ہاتھوں منگو الیا ہے۔۔۔۔ تم بس امریکہ جانے کی تیاری کرو۔۔۔۔" اب کی بار جواب بابا جان کی جانب سے ملا۔

وہ بے بسی سے جی بابا جان کہتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کے زرتاج سے ملنے کے سارے راستے بند کر دیئے گئے تھے۔

اب تو وہ امریکہ جا کر ہی زرتاج سے رابطہ کر پائے گا جہاں اس کے دادا اور باپ کی حاکمیت نہیں ہوگی؛ سوچتے ہوئے دلاور نے کچھ عرصہ اور ایسے گزارنے کا فیصلہ کیا۔



پانچ ماہ کی پریگنسی میں اب زرتاج سے اپنی حالت وہاں کی بچیوں اور محلے کی عورتوں سے چپائی نہیں جارہی تھی۔ چونکہ اس کا دلاور سے نکاح صرف زبیدہ خالہ کے حضور میں ہوا تھا اور باقی دنیا سے خفیہ تھا۔ اس لیے سب اسے بن بیاہی پریگنٹ سمجھ رہی تھی۔ یتیم خانے کے اندر ہو یا باہر ہر جگہ اسے اپنے اوپر تنقیدی نگاہیں اٹھتی محسوس ہوتی۔ وہ ہر وقت کمرے کے اندر بند ہو کر روتی رہتی۔

اس مدت میں وہ اپنی آپ بیتی دلاور کے نام خط میں بیان کرتی رہتی لیکن پھر روتے ہوئے وہ خط الماری کے کونے میں چھپا لیتی۔

یونیورسٹی کے امتحانات ہونے والے تھے۔ زرتاج کو ایک امید سی ہوئی کہ دلاور امتحان دینے تو ضرور آئے گے اس لیے وہ ایک دن پھر سے دلاور کی ملنے کی آس لیے یونیورسٹی کا رخ کر گئی۔ وہاں حسب معمول اسے بلال تو مل گیا لیکن دلاور نہیں ملا۔

زرتاج نے مایوسی سے بلال کو ایک مرتبہ پھر اس کے حویلی پر کال کرنے کی ریکویسٹ کی۔ اور بلال کے ہمراہ وہ ٹیلیفون کے دکان پر گئی۔

نمبر ملاتے ہوئے بلال نے غور سے اس کے حرکات مشاہدہ کئے تو اسے بڑی سی چادر اوڑھے
زرتاج مشکوک سی لگی وہ بار بار چادر اپنے اوپر پھیلاتی ملا تیشی نظروں سے آس پاس دیکھنے لگی۔

"جی میں بلال بول رہا ہوں۔۔۔۔۔ دلاور کا دوست۔۔۔۔۔ وہ اب تک واپس نہیں آیا۔۔۔۔۔"

یونیورسٹی کے امتحانات ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔ میری اس سے بات کروائے۔۔۔۔۔" بلال نے

کال اٹھانے والے ملازم سے سرد مہری سے کہا۔

از قلم پلوشہ صافی

NOVEL BANK

بکھرے رشتے

"نو تھینکس۔۔۔ میں چلی جاؤں گی۔۔۔" زرتاج نے سپاٹ انداز میں جواب دیا اور رکشہ روک کر اس میں سوار ہو گئی۔

بلال کچھ لمحے وہی کھڑے اسے استخز یہ نظروں جاتے دیکھتا رہا۔ زرتاج کی پریگنسنسی اس نے محسوس کر لی تھی۔



وہ بے دم قدموں سے یتیم خانے کے اندر آئی اور سحن کے بیچ زمین پر ہی بیٹھ گئی۔

"مجھے بتاؤ دیا ہو تا دلا اور۔۔۔۔ میں کو نسا آپ کو شادی کرنے سے یا اس بیوی کے ساتھ کہی جانے سے روک سکتی تھی۔۔۔۔ پر میری طرف بھی تو آپ کی کچھ ذمہ داری تھی۔۔۔۔ خفیہ ہی صحیح۔۔۔۔ لیکن میں بھی تو آپ کی بیوی ہوں۔۔۔۔ دنیا نہ جانتی ہو۔۔۔۔ لیکن میں اور میرا اللہ جانتے ہیں کہ وہ نکاح ہوا تھا۔۔۔۔ اور آپ نے دل سے قبول بھی کیا تھا۔۔۔۔ پھر ایسی لاپرواہی کیوں۔۔۔۔" وہ کھوئے ہوئے انداز میں سوچ رہی تھی۔

"زرتاج۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔ دلا اور ملا۔۔۔۔" زبیدہ خالہ وضو کر کے غسل خانے سے نکل رہی تھی کہ بے دھیانی میں زمین پر بیٹھی زرتاج پر نظر پڑی۔

زرتاج کے سوچوں کی ڈور زبیدہ خالہ کے مخاطب کرنے سے ٹوٹی۔

"وہ اب کبھی نہیں آئے گے خالہ۔۔۔۔۔ وہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔۔۔۔۔" زرتاج نے دل گرفتگی سے ویران آنکھیں غیر مروی نقطے پر جمائے ہوئے کہا۔

"چلا گیا۔۔۔۔۔ کہاں چلا گیا۔۔۔۔۔" خالہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور ٹھنڈا پنج ہاتھ اس کے رخسار پر رکھا۔

"وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ امریکہ چلے گئے ہیں خالہ۔۔۔۔۔ وہ مجھے بھول گئے۔۔۔۔۔ وہ مجھے چھوڑ گئے۔۔۔۔۔" آخری فقرہ کہتے ہوئے وہ مایوس ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھگنے لگی تھیں۔

زبیدہ خالہ نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگایا۔

"مایوس نہیں ہوتے۔۔۔ وہ آجائے گا۔۔۔ دلاور چھوڑ کر جانے والوں میں سے نہیں ہے۔۔۔ اللہ پر توکل رکھو۔۔۔ وہ دوسرا راستہ کھولے بغیر پہلا بند نہیں کرتا۔۔۔ دلاور کو دور کر دیا تو اس کے عوض تیری جولی میں اولاد ڈال دیا۔۔۔ ناامید مت ہو۔۔۔ یہ دن بھی گزر جائے گا۔۔۔" زبیدہ خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دی۔



اس دن کے بعد اس نے اپنی ساری زندگی ساری امیدیں اپنے بچے سے وابستہ کر دی۔

اور آخر وہ دن آن پہنچا جب اس نے بیٹے کو جنم دیا۔ زرتاج نے اپنے بیٹے کا نام شاویز رکھا۔
اسے اپنے ہاتھوں میں تھامے زرتاج نے یہ ٹھان لیا تھا کہ وہ شاویز کو نڈر بہادر سب سے ڈٹ
کر مقابلہ کرنے والا مضبوط مرد بنائے گی۔

اما اور وہ آدمی اس کے بعد پھر کبھی یتیم خانے نہیں آئے۔ اس کے باوجود بھی زرتاج باہر نکلنے
سے کتراتا تھی۔ لیکن وہ اب اپنے ساتھ ساتھ شاویز کا بوجھ بھی زبیدہ خالہ پر نہیں ڈالنا چاہتی
تھی اس لیے خالہ کے ذریعے اس نے اپنا نام یتیم خانے کے کارکنان میں درج کروادیا جس سے
اسے یتیم خانے کو مہیا کیے جانے والے فنڈ سے مہینے کے دو ہزار تنخواہ ملنے لگی۔ کچھ نہ ہونے
سے وہ دو ہزار بھی زرتاج نے شاویز کا خرچہ پورا کرنے غنیمت سمجھے۔



دلاور اور عابدہ کو امریکہ میں سیٹل ہوتے ہوئے ایک سال لگ گیا۔ وہ دونوں یونیورسٹی میں اپنی اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئے تھے۔ دلاور کو ہر وقت زرتاج کی فکر ستاتی رہتی۔ ایک دن اس نے بلال کو فون ملایا۔

اس سے حال احوال معلوم کرنے کے بعد دلاور نے بلال سے التجا کی کہ وہ زرتاج کے پاس جا کر اس کے فون کرنے کی اطلاع دے اور اگلے دن اسی وقت اسے یہاں لا کر زرتاج سے اس کی بات کروائے۔

"لیکن وہ تو اپنے ماما اور اس آدمی کے ساتھ چلی گئی جس سے وہ زرتاج کی شادی کروانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔" بلال نے معصوم بنتے ہوئے جھوٹ بولا۔

دلاور کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئی۔

"ایسے کیسے جاسکتی ہے۔۔۔ میں نے اسے چھوڑا تو نہیں ہے۔۔۔ وہ اب بھی میرے نکاح میں ہے۔۔۔ پھر وہ کسی اور کے ساتھ کیسے جاسکتی ہے۔۔۔" دلاور نے شک کے عالم میں سوچا۔

دلاور سے یہ حقیقت تسلیم نہیں کی جا رہی تھی۔ اس نے سست روی سے فون بند کر دیا۔

"اس نے تو کہا تھا۔۔۔ وہ آخری سانس تک میرا انتظار کریں گی۔۔۔ پھر اس سے ایک سال بھی میرا انتظار نہیں کیا گیا۔۔۔" سوچتے ہوئے دلاور کے آبرو تن گئے۔ اسے زرتاج پر غصہ آنے لگا۔

وہی دوسری جانب بلال زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"زرتاج پر پہلے میری نظر پڑی تھی دلاور۔۔۔۔۔ اسے میں پانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن وہ تم سے پیار کرنے لگی۔۔۔۔۔" بلال نے نفرت سے سوچا۔

"تیرے آغا جان کو بھی تیرے افیر کا میں نے بتایا۔۔۔۔۔ میں تمہیں زرتاج سے دور کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ تاکہ میرا راستہ صاف ہو سکے۔۔۔۔۔ پر مجھے کیا پتا تھا کہ تُو اس کے ساتھ اس حد تک involve ہو چکا ہے۔۔۔۔۔" بلال نے طنزیہ انداز میں دانت پیستے ہوئے زرتاج کی پر یگننسی یاد کی۔

"لیکن اب تمہیں زرتاج کبھی نہیں ملے گی۔۔۔۔۔ اور نہ تم کبھی اپنے اس اولاد کے بارے میں جان پاؤ گے دلاور پرویز خان۔۔۔۔۔" بلال نے تنے ہوئے اعصاب سے سوچا اور استخزیہ ہنستے ہوئے باہر نکل گیا۔



زرتاج 7 ماہ کے چھوٹے شاویز کو اپنے بیڈ پر سلا کر اٹھی۔ مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے وہ مڑی تھی کہ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔

بلاں بلیک شلوار قمیض زیب تن کئے داڑھی مونچھے سنواری ہوئی تروتازہ ہوئے خوش مزاجی
سے اندر داخل ہوا۔

زرتاج نے سلام کرتے ہوئے گلے میں لیا ڈوپٹہ فوراً سے سر پر اوڑھ لیا اور نگاہیں نیچی رکھیں۔

"کیسی ہوزرتاج۔۔۔۔ مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔۔۔ ہمیشہ تمہاری فکر لگی رہتی ہے۔۔۔ دلاور نے بہت غلط کیا تمہارے ساتھ۔۔۔۔" جھوٹی ہمدردی جتاتے ہوئے وہ زرتاج کے پاس آیا اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

زرتاج نے اس کا لمس محسوس کیا تو تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور دو قدم پیچھے ہو گئی۔

"میں تمہارے اور دلاور کے افیر کو نادانی سمجھ کر معاف کر دوں گا۔۔۔ میں تمہیں اور تمہارے بیٹے کو اپنالوں گا۔۔۔ تم ایسے اکیلے ساری عمر کیسے رہو گی۔۔۔" بلال ہاتھ آگے بڑھا کر پھر سے زرتاج کو پکڑنا چاہتا تھا لیکن وہ پیچھے ہوتی گئی۔

"بلال۔۔۔۔۔ دور رہے مجھ سے۔۔۔" زرتاج نے بلند آواز میں اسے چھڑکا۔ دور ہوتے ہوتے وہ بیڈ سے ٹکرا گئی۔ اس نے گرنے سے خود کو بچانے کے لیے تکیے پر ہاتھ رکھا تو اسے چاقو یاد آیا اور جھٹ سے اپنا حفاظتی چاقو نکال کر بلال کے آگے کیا۔ وہ جھٹکا کھا کر پیچھے ہو گیا۔

"آگے مت آنا۔۔۔۔۔ جان سے مار دوں گی۔۔۔۔۔ سمجھ کیا رکھا تم نے مجھے۔۔۔۔۔ میں دلاور کی ہوں۔۔۔۔۔ اور ان ہی کی رہوں گی۔۔۔۔۔ میرے بیٹے کے لیے بھی میں اکیلی کافی

ہوں۔۔۔۔۔ اسے تمہارے گھٹیا نام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔۔ "زر تاج چاقو لہراتے ہوئے اسے خود سے دور کرنے لگی۔

"زرتاج۔۔۔ کیا کر رہی ہو۔۔۔ لگ جائے گا۔۔۔" بلال ہاتھ اٹھا لڑکھڑا کر دو قدم پیچے ہو گیا۔

" کمزور مت سمجھنا مجھے۔۔۔۔ میں زندگی بھر صرف دلاور کی ہی رہوں گی۔۔۔۔ اپنی یہ جھوٹی ہمدردی کہی اور جا کر دکھاو۔۔۔۔ نکلو میرے کمرے سے۔۔۔۔ " زرتاج پوری قوت سے اس پر چلا اٹھی تھی۔

اس کے کمرے سے شور کی آوازیں سن کر زبیدہ خالہ ہڑبڑا کر وہاں آئی تو زرتاج کے ہاتھوں میں چاقو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ انہوں نے زرتاج کے پاس آ کر اسے تھاما۔

"خالہ۔۔۔۔ یہ میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔" زرتاج نے افسردگی سے انہیں درپیش حال سے آگاہ کیا۔ خالہ نے شاک کے عالم میں سر پر ہاتھ رکھ لیا۔

"بے غیرت انسان۔۔۔۔ میں نے تمہیں دلاور کا جگری دوست سمجھ کر اندر آنے دیا۔۔۔ اور تم اپنا یہ اصل دکھا رہے ہو۔۔۔ دفع ہو جاو۔۔۔ دوبارہ یہاں آئے تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی۔۔۔" خالہ نے طیش میں دھکے مار مار کر بلال کو باہر نکالا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا زرتاج۔۔۔۔۔ اس کا انجام تمہیں بھگتنا پڑے گا۔۔۔۔۔ میں ابھی جا کر سردار اختر خان کو ساری سچائی بتاتا ہوں۔۔۔۔۔ میں انہیں بتا دوں گا کہ تم وہ لڑکی ہو جسے وہ ڈھونڈ رہے تھے۔۔۔۔۔ اور تمہارا دل اور سے ایک بیٹا بھی ہے۔۔۔۔۔ پھر دیکھنا۔۔۔۔۔ وہ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑے گے۔۔۔۔۔" بلال نے سحن میں کھڑے ہو کر بلند آواز میں زرتاج کو دھمکی دی اور غضب سے پھولے ہوئے تنفس میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے روانہ ہو گیا۔



ابھی زرتاج زبیدہ خالہ کے ساتھ غم رازی کر رہی تھی کہ اس نے گیٹ کا زور دار بجناسنا۔

"لگتا ہے بلال نے آغا جان کو بتا دیا۔۔۔" زرتاج روہانسی ہو گئی اور سوئے ہوئے ننھے شاویز کو مضبوطی سے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"نہیں۔۔۔۔۔ میں انہیں اپنا بچہ نہیں دوں گی خالہ۔۔۔۔۔ ان لوگوں نے مجھ سے میرے
دلاور کو چھین لیا۔۔۔۔۔ اب میں انہیں مجھ سے میرا بیٹا نہیں چھیننے دوں گی۔۔۔" زرتاج
شاویز کو اپنے سینے سے لگائے زار و قطار رونے لگی۔

"وہ میرے بچے کو مار دیں گے۔۔۔۔ میں شاویز کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔۔۔۔ میں اپنا بیٹا انہیں نہیں لینے دوں گی۔۔۔۔" وہ مسلسل روتے ہوئے زبیدہ خالہ سے فریاد کرنے لگی۔

زبیدہ خالہ اسے سمجھاتے چپ کرواتے ہوئے اٹھی اور کمرے سے باہر جا کر معاملہ دیکھنے لگی۔

زرتاج نے معصوم شاویز کو اپنے بازوؤں میں چپالیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا وہ نفی میں سر ہلاتے
ذہن سے منفی خیالات جھٹکنے لگی۔



اس دن کے بعد دلاور نے دوبارہ بلال سے رابطہ نہیں کیا۔ اس نے زرتاج کی محبت دل میں دبا
کر صرف اپنے تعلیم پر توجہ مرکوز کر دی۔

وہی دوسری جانب زرتاج شاویز کی پرورش کے ساتھ ساتھ یتیم خانے کی کارکن جیسے وہاں کے
کام کاج کرنے لگی۔

شاويز بہت ہوشيار بچہ تھا ز تاج کا اس کے ساتھ بہت دل بہل جاتا۔ زندگی اپنے رفتار سے چلنے لگی۔ لکڑی کے تندور میں انگارے پھونک پھونک کر زر تاج کو دمہ کی بیماری لگ گئی۔

اس نے شاویز کو کبھی دلاور کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کبھی بھی دلاور اور اس کی فیملی کو شاویز کا پتا چلے اور وہ لوگ شاویز کو اس سے چھین لے۔ اس نے ہمیشہ شاویز کو اچھی تربیت دی۔ اس کے پاپا کے بارے میں بھی وہ اسے اچھی باتیں بتاتی رہی۔ اسے مضبوط اور توانا بننے کی تلقین کرتی رہی۔ ان سب کے باوجود بھی زرتاج کے دل میں کبھی دلاور کی محبت کم نہیں ہوئی۔ وہ ہر وقت دلاور کے کامیابی کی دعائیں کرتی رہتی اور اکثر و بیشتر اسے جب دلاور کی ترقی کی خبر ملتی وہ بہت خوش ہو جاتی۔

شاویز بہت شرارتی تھا وہ زرتاج کو بہت تنگ کیا کرتا۔ وہ ایک دن 4 سالہ شاویز کے ساتھ کھیل رہی تھی جب اس نے پھر دہلیز پر شور سنا۔ زرتاج بھاگتے ہوئے گئی اور شاویز کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ کمرے میں لی گئی۔

"دو آدمی ہیں۔۔۔۔ کہہ رہے ہیں دلاور نے بھیجا ہے۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے ہڑبڑی میں ان آدمیوں کی کہی بات زرتاج کو بتائی۔

"وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔۔۔۔ صرف دلاور کا نام لے کر ہمیں نشان دہی کرنے آئے ہیں۔۔۔۔ وہ شاویز کو چھیننے آئے ہیں۔۔۔ آپ انہیں بھیج دے۔۔۔" زرتاج نے زار و قطار آنسوؤں میں کہا۔ زبیدہ خالہ اسے اندر بند کر کے باہر نکل گئی۔

ننھا شاویز معصومیت سے اپنی روتی ماں کو دیکھنے لگا۔ اسے دلاور کے نام سے نفرت ہونے لگی۔

یتیم خانے کا چھاپا مار کر جب انہیں وہ دونوں نہ ملے تو وہ آدمی واپس چلے گئے۔



زرتاج کا دمہ دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں بہت تکلیف ہونے لگی تھی۔

"میں فنڈ والوں سے تیرے علاج کے لیے پیسے دینے کی درخواست کرتی ہوں۔۔۔" ایک دن خالہ نے افسوس سے کہا۔

"وہ مشکل سے یتیم خانے کے راشن کا خرچ دیتے ہیں خالہ۔۔۔۔۔ میرے علاج کے پیسے کہاں سے دیں گے۔۔۔۔۔ رہنے دیں۔۔۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔" زرتاج نے بے چارگی سے ہنستے ہوئے کہا اس کی ویران آنکھیں سحن میں کھیلتے 7 سالہ شاویز پر مرکوز تھی۔



اسے سینے میں بہت تکلیف ہونے لگی۔ وہ بھاگ کر سحن میں آئی اور کھلے فضاء میں لمبی لمبی سانس لینے لگی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ کل تک جب اسے جینے کی آس نہیں تھی تب وہ تندرست تھی اور اب جب اس کے پاس جینے کی امید تھی اس کا شاویز تھا تب زندگی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"دلاور۔۔۔۔۔" آخری سانس اس نے دلاور کے نام لی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

موجودہ دن

26 سال پہلے کی روداد یاد کر کے دلاور صاحب ٹوٹ سے گئے اور بے دم سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے آنکھوں کے بھیگے کنارے صاف کئے اور بھر آئی آواز میں گویا ہوئے۔

"میں آیا تھا وہاں۔۔۔۔۔ دو سال بعد جب میں واپس پاکستان آیا تو میں آیا تھا یتیم خانے۔۔۔۔۔ لیکن مجھے بتایا گیا زرتاج نام کی اب وہاں کوئی نہیں رہتی۔۔۔۔۔ پھر میں نے آپ سے ملنے کی درخواست کی تو مجھے آپ سے نہیں ملنے دیا گیا خالہ۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے زبیدہ خالہ کو

مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ جوان شاویز کی اس طرف پشت تھی لیکن وہ دلاور صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔

"مجھے پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔۔۔ میں نے اپنے آدمی وہاں تعینات کر دیئے۔۔۔۔۔ لیکن ایک سال تک وہاں نظر رکھنے کے باوجود زر تاج کی کوئی خبر نہ ملی۔۔۔۔۔ تو میں نے زر تاج کے ملنے کی کوشش ترک کر دی۔۔۔" دلاور صاحب اپنے جذبات قابو کرنے سانس لینے کو رکے۔

سب کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ یہاں تک کہ شاویز کی بھی۔

"پر ایسا نہیں تھا کہ میں زر تاج کو بھول گیا۔۔۔ میں ہر وقت اس کی خیریت اور سلامتی کی دعا کرتا رہا۔۔۔ جب تک کہ میں پانچ سال پہلے ایک چیریٹی تقریب میں عابدہ کے ذریعے زبیدہ

خالہ سے ملا۔۔۔۔۔ اور انہوں نے زر تاج کے وفات کا بتایا۔۔۔۔۔ "آخری فقرہ کہتے ہوئے وہ پھر سے جذباتی ہو گئے۔

"اس رات میں بہت رویا تھا۔۔۔۔ بہت ٹوٹ کر رویا تھا۔۔" دلاور صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

"تم اپنی جگہ بالکل درست ہو شاویز بیٹا۔۔۔۔ میں نے تمہاری ماں کے ساتھ۔۔۔۔ ہماری
 زرتاج کے ساتھ۔۔۔۔ بہت زیادتی کی تھی۔۔۔۔ اسے تکلیف میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔۔۔۔
 ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔۔۔" دلاور صاحب نے گیلی سانس اندر کھینچ کر خود کو نارمل
 کرتے ہوئے کہا۔

دلاور صاحب کے زبان سے اپنے لئے بیٹا لفظ سن کر شاویز کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر رخسار پر بہنے لگے۔

"لیکن خالہ پانچ سال پہلے جب آپ نے مجھے زرتاج کے انتقال کا بتایا۔۔۔۔۔ تب شاویز کا کیوں نہیں بتایا۔۔۔۔۔ کیوں مجھے اپنے ہی اولاد سے محروم رکھا۔۔۔۔۔" دلاور صاحب کی آواز میں افسردگی بھرا شکوہ آنے لگا۔

"مجھے زرتاج کی قسم نے پابند کر دیا تھا دلاور۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دے۔۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے بھر آئی آواز میں اپنے کئے پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن شاویز۔۔۔۔۔ تم نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔۔۔۔۔ مجھ سے پوچھ لیتا۔۔۔۔۔ میں تجھے دلاور کے بارے میں سب بتا دیتی۔۔۔۔۔ تم نے دلاور کا اتنا بڑا نقصان کر دیا۔" دائی ماں نے شکوہ آمیز انداز میں اسے مخاطب کیا اور جواب کی منتظر ہو کر اس کا بازو تھام لیا۔

"مجھے کوئی پروا نہیں خالہ۔۔۔۔۔ ان سب کے چلتے مجھے میرا بیٹا مل گیا۔۔۔۔۔ اس سے بڑھ کر مجھے کچھ نہیں چاہیے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے تاثرات خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

ان کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ سے عابدہ بیگم سحر اور صائم کے دل پر تیر چل رہے تھے پر دلاور صاحب کو کوئی پروا نہ تھی۔

"ہاں۔۔۔۔۔ دیکھ دلاور۔۔۔۔۔ زرتاج تیرے لیے کتنا قیمتی تحفہ چھوڑ گئی ہے۔۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے بھی بھگی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"واقعی بہت انمول تحفہ ہے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے سر تا پیر مضبوط اور توانا 25 سالہ جوان شاویز کے سر پر کو دیکھتے ہوئے کہا اور اسے چھونے قریب گئے۔

لب کاٹتے ہوئے مضطرب کھڑے شاویز نے جب دلاور صاحب کا ہاتھ اپنے جانب بڑھتے محسوس کیا تو گڑبڑا گیا اور تیز تیز سانس لیتا دو قدم آگے ہو گیا۔ دلاور صاحب کا ہاتھ ہوا میں ہی رہ گیا۔

شاویز وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس کا دل ڈگمگا رہا تھا۔ اسے پسینے آنے لگے وہ اس وقت دلاور صاحب کے رقبہ کے لیے تیار نہ تھا۔

"شاویز۔۔۔۔ دیکھ اب تو ساری حقیقت تیرے سامنے ہے۔۔۔۔ دلاور نے بھی اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیا ہے۔۔۔۔ جو ہوا۔۔۔۔ اس میں نہ دلاور کی غلطی تھی۔۔۔۔ نہ زرتاج کا کوئی قصور تھا۔۔۔۔ یہ بس قسمت کا لکھا تھا۔۔۔۔ بھول جاسب۔۔۔۔ چھوڑ دے نفرت۔۔۔۔ معاف کر دے دلاور کو۔۔۔۔ وہ تجھے اپنا لے گا۔۔۔۔ ہیں نادلاور۔۔۔۔"

دائی ماں نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے اسے امید دلانی چاہی۔

"ہاں of course خالہ۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔ میں پورے دنیا کے سامنے شاویز کو اپنا بیٹا تسلیم کروں گا۔۔۔۔۔ میں اب زر تاج کی نشانی کو ایک پل بھی خود سے دور نہیں جانے دوں گا۔۔۔۔۔" دلاور صاحب جذبات میں یہ تک بھول گئے کہ ان کے بیوی بچوں کو ان کی باتوں سے کتنی تکلیف ہو رہی ہیں۔

شاویز نے کرب سے آنکھیں مینجھ لی۔ وہ جانتا تھا کال میں ڈاکرنے دلاور صاحب کو کیا کہا ہو گا۔

شاویز نے راشد ہاشمی کے ساتھ مل کر آج صبح ہی دلاور صاحب کے دفتر پر جھڑپ کرنے کی پلاننگ کی تھی اور یقیناً اس وقت راشد ہاشمی کے غنڈے دفتر میں گھسنے لگے تھے۔ جس کی خبر ڈاکرنے بروقت دلاور صاحب کو دینے کال کی تھی۔

آنکھیں بند کئے ہوئے شاویز کو اپنی ماں کی آخری نصیحت یاد آنے لگی۔

مسکراتی ہوئی زرتاج 8 سالہ ننھے شاویز کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیئے ہوئے اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔

"دیکھو شاویز۔۔۔۔۔ زندگی میں کبھی بھی اگر اپنے پاپا سے ملے۔۔۔۔۔ تو ان سے اچھے سے ملنا۔۔۔۔۔ ان سے کبھی نفرت مت جتاننا۔۔۔۔۔ ان کی عزت کرنا۔۔۔۔۔ انہیں بہت بہت بہت زیادہ پیار دینا۔۔۔۔۔ اگر تب تک وہ بوڑھے ہو چکے ہو۔۔۔۔۔ تو ان کا سہارا بننا۔۔۔۔۔ ان کی ہر مشکل سے حفاظت کرنا۔۔۔۔۔ چلو وعدہ کرو مجھ سے۔۔۔۔۔" زرتاج نے سنجیدہ تاثرات بنائے ہوئے ایک ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا۔

شاویز غصہ ناک پر جمائے تند نظروں سے بے مروتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا۔

"شاویز۔۔۔۔۔ c'mon۔۔۔۔۔ پرامس کرو۔۔۔۔۔" اب کی بار زرتاج نے گھور کر سختی سے تنبیہ کیا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی۔۔۔۔۔ وہ آدمی تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔۔۔۔۔ مجھے تو اس کا نام تک نہیں معلوم۔۔۔۔۔ پھر بھی تم اس کی اتنی پروا کیوں کرتی ہو۔۔۔۔۔" شاویز نے منہ بھسورتے ہوئے کہا اور ہنہ کرتے ہوئے رخ پھیر لیا۔

"کیونکہ میں ان سے بہت پیار کرتی ہوں۔۔۔۔۔ کیونکہ میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ میرے سر کا تاج ہے۔۔۔۔۔ وہ میرے شوہر ہے۔۔۔۔۔ میرے مجازی خدا ہے۔۔۔۔۔ تمہارے پاپا ہے۔۔۔۔۔ ان کے ہونے سے تمہارا وجود ہے۔۔۔۔۔ اس لیے تمہیں بھی یہی کہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔ کہ ان سے جب بھی ملو پیار سے ملنا۔۔۔۔۔" زر تاج نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

جھپکائی۔

میں دیا۔ زرتاج کی آنکھیں چمک اٹھی اس نے مضبوطی سے اسے گلے سے لگایا۔

آنکھیں موندھے ہوئے جوان شاویز کی سماعتوں میں اپنا بچپن میں ماں سے کیا ہوا وعدہ گونجنے لگا۔ پہلی مرتبہ اسے اپنے کئے پر افسوس ہوا۔ اس نے افف کرتے ہوئے سر پکڑ لیا اور سرد سانس خارج کر کے تیزی سے باہر کولیکا۔

پوریج کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اس نے راشد ہاشمی کا نمبر ملایا۔

"راشد ہاشمی۔۔۔ اپنے آدمیوں کو روکو۔۔۔ ابھی اسی وقت۔۔۔" کال اٹھائے جانے پر وہ بھوکے شیر کی مانند غرایا تھا۔

"سوری بچے۔۔۔ شروع تم نے کیا تھا۔۔۔ ختم میں کروں گا۔۔۔"

میرے آدمی تو اب نہیں رکھیں گے۔۔۔۔۔ اور میں آج دفتر کے ساتھ ساتھ۔۔۔۔۔ دلا اور
کو بھی ختم کر دوں گا۔۔۔۔۔" راشد ہاشمی نے استخزیہ ہنستے ہوئے کہا۔

سحر اور صائم لاؤنج کے دروازے پر کھڑے اسے جاتے دیکھ رہے تھے۔

"تیری کار لے گیا سحر۔۔۔۔" صائم نے افسردگی سے سحر کو دیکھا

"چھوڑو۔۔۔ اس سے بعد میں نیٹ لینگے۔۔۔۔۔ فحال ہمیں پاپا کی فکر کرنی ہے۔۔۔۔۔" سحر نے پلکیں جھپکا کر صائم کو دیکھا۔

جو بھی ہو ان میں سب سے بڑی حقیقت تو یہ بھی تھی کہ دلاور پرویز خان ان کے والد ہے ان کے زندگی کا حصہ ہے ان کے سر کا سایہ ہے وہ چاہے جتنے بھی ناراض ہو جائے پر اپنے پیار سے

منہ نہیں پھیر سکتے۔ صائم نے سحر کی بات سمجھ کر سر کو جنبش دیا۔ سحر موبائل اٹھا کر پھر سے کال کرنا چاہتی تھی۔ اب کی بار اس کی کال کمشنر صاحب کو ہوتی لیکن اس سے پہلے ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس پر جاوید کی کال آرہی تھی۔

سحر نے پہلے ہی بیل پر کال اٹھائی اور ہیلو جاوید کہتے ہوئے اسے شروع سے اب تک کے صورت حال سے واقف کرنے لگی۔



جس وقت شاوینز دفتر پہنچا اندر سے توڑ پھوڑ کی آوازیں آرہی تھی۔ اس نے فوراً سے ہینڈ بریک لگا کر کاررو کی اور اچھلتے ہوئے اپنی پوری رفتار سے اندر کو بھاگا۔

بڑے ہال میں دلاور صاحب اور ذاکر غنڈوں کو ہٹاتے ہوئے انہیں مزید اندر جانے سے روک رہے تھے۔ وہ راستے میں آنے والے آدمیوں کو جھڑپ کر لاتے گھوسے مار کر ضربیں لگاتا زمین بوس کرنے لگا۔

دلاور صاحب ایک غنڈے کو پکڑے اسے توڑ پھوڑ کرنے سے روک رہے تھے۔ وہ ابھی اسی جھڑپ میں تھے کہ شاویز نے آگے آکر ان سے مزمت کرنے والے کاکندھاد بوچا اور اسے دلاور صاحب سے دور کر کے ایک ہی وار میں اٹھا کر پٹخ دیا۔

دلاور صاحب مسرت سے اپنے ہنرمند بیٹے کو دیکھ کر محفوظ ہوئے۔ ان کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ پھیل گئی۔

شاویز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دلاور صاحب اسی کو دیکھ رہے ہیں اس لیے پیچھے مڑنے کی بجائے وہ آگے کو ہوا۔

شاویز پر حملہ کرنے کے دوسرا آدمی آگے آیا جسے دلاور صاحب نے اپنی پوری قوت سے دبوچ لیا۔

شاویز نے سامنے سے آتے غنڈے کو پیٹ میں لات مار کر گرایا کہ اسے شیشے پر پیچے کسی کا
عکس نظر آیا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو دوسری منزل پر راشد ہاشمی تند و تیز نظروں
سے دلا اور صاحب کو گھورتے ہاتھ میں پکڑے اسلحہ سے ان کا نشانہ بنا رہا تھا۔ شاویز کا دل ڈوبنے
لگا اس نے تیزی سے اپنی کمر پر آگے پیچے ہاتھ مارا لیکن اس کی گن نہیں تھی۔

"شیٹ۔۔۔" اس نے زیر لب خود کو کوسا۔ اتنے ضروری دن اس نے اپنی گن کیوں نہیں اٹھائی؛ سوچتے ہوئے وہ پھر سے راشد ہاشمی کے حرکات مشاہدہ کرنے لگا۔ یہ وقت شاویز کا اپنی لا پرواہی پر افسوس کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے آس پاس دیکھ کر اپنا اور راشد ہاشمی کا فاصلہ

کیلیکولیٹ کیا۔ وہ اپنی پوری رفتار لگا کر بھی بھاگتا تو بھی کم از کم گولی کے سپیڈ سے تیز راشد ہاشمی کو روکنے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جبکہ دلاور صاحب اس سے دو قدم کے فاصلے پر تھے وہ ان کو ہٹا سکتا تھا۔

شاویز کا دماغ برق رفتاری سے چل رہا تھا وہ تیزی سے ہاتھ پھیلائے دلاور صاحب کے سامنے آیا۔ اسی اثناء سامنے سے راشد ہاشمی نے ٹریگر دبا کر گولی شوٹ کی۔

"پاپا۔۔۔۔۔ آااااااا" ان کو پکارتے ہوئے شاویز کراہ اٹھا۔ گولی اس کے داہنے کندھے پر لگ گئی تھی۔

دلاور صاحب کے اوسان خطا ہو گئے۔ انہوں نے کانپتے ہوئے پلٹ کر شاویز کو سنبھالا اسے بازوؤں میں تھاما۔

"شاویز۔۔۔۔۔ یہ کیا کیا تم نے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب کی آواز لرزنے لگی۔

شاویز کرب سے آنکھیں بند کر کے زمین پر گر پڑا۔ اسے اور بھی گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگی شاید پولیس پہنچ گئی تھی۔

دلاور صاحب گھٹنوں کے بل بیٹھے اسے کندھوں سے تھامے اس کا سر اپنے سینے سے لگائے بلند آواز میں ڈاکر اور جاوید کو صدا دینے لگے۔

"جاوید۔۔۔۔۔ جلدی ایمبولینس منگواؤں۔۔۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔" انہوں نے جاوید کے قریب آتے ہی ہدایت دی۔ اس نے سر کو جنبش دیتے ہوئے موبائل نکالا اور کال ملانے لگا۔

شاویز کے کندھے سے متواتر خون رس رہا تھا دلاور صاحب خون روکنے کی کوشش کرتے اس کے زخم پر ہاتھ کر دبا دینے لگے۔

"شاویز۔۔۔۔۔ ہمت رکھو۔۔۔۔۔ ابھی ایمبولنس آجائے گی۔۔۔۔۔ نہیں میرے بچے۔۔۔۔۔
تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ میں ہوں نا تمہارے پاس۔۔۔۔۔" پاپا روتے تڑپتے اسے دلا سہ
دینے لگے۔ شاویز کا جسم بے جان ہونے لگا اس سے ہلاتک نہیں گیا۔ خون کی بہتی رفتار اور درد
کی شدت سے اس کی سانس اٹکنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں ایمبولنس کے عملی اسٹریچر لیئے بھاگتے ہوئے وہاں آئے۔ ڈاکر اور جاوید نے ان
کے ہمراہ شاویز کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا اور ایمبولینس کے جانب تیز تیز چلنے لگے۔ دلا اور
صاحب اسی انداز میں شاویز کے زخم پر ہاتھ رکھے لڑکھڑاتے قدموں سے ان کی رفتار سے
قدم ملانے کی کوشش کرتے رہے۔ ایمبولنس میں جاوید آگے بیٹھا اور دلا اور صاحب شاویز کے
ساتھ پیچھے۔ انہوں نے شاویز کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"شاویز۔۔۔۔۔ بس تھوڑی دیر۔۔۔۔۔ ہم ابھی ہسپتال پہنچ جائے گے۔۔۔" دلاور صاحب کی آنکھیں بھگنے لگی۔

"یا اللہ۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہو گیا۔۔۔۔۔" انہوں نے بے بسی سے شاویز کے خون سے تر ہوتے اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگے۔

ان کے آنسو ٹپ ٹپ کر کے شاویز کے رخسار پر گر رہے تھے۔

شاویز دانت پر دانت جمائے ہوئے درد کی شدت کو برداشت کرتا ٹڑپنے لگا۔ لمبی لمبی سانس لے کر وہ خود کو زندہ رکھنے کے لیے جتن کرنے لگا۔

"جاوید۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔" دلاور صاحب شاویز کو تکلیف میں دیکھ کر گھبرا گئے۔

"اتنے نیک شخص پر آخر کیوں نہ میری ماں فدا ہوتی۔۔۔۔۔ کیوں نہ وہ ان سے اتنی محبت کرتی۔۔۔۔۔ کیسے وہ اپنی ساری زندگی ان کا انتظار نہ کرتی۔۔۔۔۔ کیوں نہ اپنی آخری سانس تک ان کے نام کرتی۔۔۔" سوچتے ہوئے شاویز کی آنکھیں بھر آگئی تھیں۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھنے وہ بار بار پکلیں جھپکانے لگا۔

اس کی دھڑکن کم ہونے لگی اس نے کراہتے ہوئے اپنے زخم پر دلا اور صاحب کے ہاتھ کے اوپر اپنا بایاں ہاتھ رکھ دیا۔

"ہاں ماں۔۔۔۔ تم ٹھیک کہتی تھی۔۔۔۔ تم نے میرے پاپا کے بارے میں مجھے جو بھی نصیحت کی ہیں۔۔۔۔ سب سو فیصد درست ہے۔۔۔۔" شاویز نے آنکھیں بند کر دی اسے اپنا سر بھاری ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

"میں نے ان سے بدلہ لے لیا۔۔۔۔ اپنے جسم سے ان کا خون بہا کر میں نے اپنا بدلہ لے لیا۔۔۔۔" اس نے خود کلامی کرتے ہوئے اپنے بدلہ لینے کے حوالے سے سوچا۔

ایک مرتبہ پھر وہ دلاور صاحب کے پریشان کن چہرے کو دیکھنے لگا

"دیکھ ماں۔۔۔۔ میں نے اپنے پاپا کی حفاظت کی۔۔۔۔ میں نے اپنا وعدہ نبھایا۔۔۔۔ میں نے تیری ہر نصیحت پر عمل کیا۔۔۔۔ آج ان کو بچاتے اگر مر بھی گیا تو میری جان بھی ان پر قربان۔۔۔۔" اسے دلاور صاحب پر شدت سے پیار آنے لگا۔ اس کا دل کیا وہ اٹھ کر اپنے پاپا

کو گلے سے لگا لے۔ خود کو ان کے بازوؤں میں چپا لے لیکن وہ بے جان پڑا تھا اس کے جسم میں حرکت نہیں ہو رہی تھی۔

آج تک اس نے کبھی اپنی زندگی کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ کبھی موت سے خوف زدہ نہیں ہوا۔
آج پہلی بار اس میں زندہ رہنے کی چاہت جاگ رہی تھی۔

"نہیں مجھے نہیں مرنا۔۔۔ میں ابھی کچھ اور عرصہ جینا چاہتا ہوں۔۔۔۔ میں ابھی کچھ اور عرصہ اپنے پایا کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔۔۔ اللہ آپ نے ان کو میری ماں سے دور کر دیا تھا۔۔۔ اب مجھے ان سے دور مت کیجیے۔۔۔ پلیر زرز۔۔۔۔" اس کے بجھتے دل سے آہ نکل رہی تھی۔

"برسوں بعد اس پیار کے پیاسے کو ان کے محبت کا سمندر ملا ہے۔۔۔ مجھے ساحل پر ہی آکر نہیں مرنا۔۔۔ مجھے اس سمندر کی گہرائی کو چھونا ہے۔۔۔ مجھے پاپا کے پاس رہنا ہے۔۔۔۔۔"

اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے سوچا اور ایک جھٹکے سے کروٹ پر ہو کر پاپا کے گود میں سر چپا کر ان سے لپٹ گیا اور موت آنے کے خوف سے رونے لگا۔

"بس بیٹا پہنچ گئے۔۔۔ تم زرتاج کے بہادر بیٹے ہونا۔۔۔ ابھی ٹھیک ہو جاو گے۔۔۔۔۔"

ہمت رکھو۔۔۔۔۔" دلا اور صاحب نے روتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور رخسار پر بوسہ دیا۔

اس کے آگے شادویز کا دماغ پورا ماف ہو گیا تھا۔ وہ صرف اپنے آس پاس کے لوگوں کے حرکات محسوس کر سکتا تھا لیکن خود کوئی حرکت کرنے کے حالت میں نہیں رہا تھا۔

اسے اٹھا کر ٹرائی پر لیٹایا اور بھگاتے ہوئے اسے آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا

آپریشن تھیٹر کے بستر پر اسے آس پاس کئی ڈاکٹر ز اور نرس کام کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ کوئی اس کا نبض دیکھ رہا تھا۔ کوئی الگ الگ انجیکشن لگا رہا تھا۔ کسی نے اس کی خون آلود شرٹ کھینچی سے کاٹ کر اس کے باڈی کو برہنہ کیا۔ کوئی الگ الگ مشینوں کے تار اس کے سینے پر چسپاں کر رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر آکسیجن کا ماسک لگا یا دوسرے ڈاکٹر نے اس کے زخم کو صاف کیا اور اب وہ گولی نکالنے لگے تھے۔

شاویز آکسیجن ماسک لگائے آنکھیں موندھے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار دلاور صاحب کا چہرہ اگر دش کر رہا تھا۔ ان سے کچھ پیچے سنجیدہ کھڑی سحر اور بے غم سا صائم۔ پھر خوش اخلاق سی عابدہ بیگم۔ کہی دور رعب دار آواز میں اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے صادق سر۔ 4 سال کی سائیکل چلاتی مریم۔ فرینڈلی مسز ز نورین۔ یونیورسٹی کے کینیٹین میں

مایوس کھڑی عارفہ۔ اس کے گود میں چڑھا ہوا لاریب۔ اس کے بیچے بھاگتا ہوا جاوید۔ ایک ایک کر کے سب چہرے گڈمڈ ہونے لگے آخر میں صرف ایک سایہ شفاف دکھنے لگا۔ لمبے بالوں اور خوبصورت مسکان والی زرتاج۔ اس کی پیار کی مورت۔ اس کی ماں۔ شاویز نے زیر لب ماں کے انداز میں ہونٹوں کو حرکت دی اور ایک آہ بھری۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن تاریک ہو گیا۔



آپریشن تھیٹر کے باہر دلا اور صاحب خون آلود سوٹ میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہے تھے۔ صبح سے شام ہونے کو تھی یادن سے رات بھوکے پیاسے کھڑے انہیں کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ فکر تھی تو صرف شاویز کی۔

جاوید پولیس کی ودی میں ملبوس کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

سحر اور صائم ہسپتال کے چمکتے فرش پر بھاگتے ہوئے دلاور صاحب کے پاس آئے اور ان سے لپٹ گئے۔ دلاور صاحب نے ایک بازو سحر کے گرد مائل کیا اور دوسرا صائم کے گرد۔

"کیسے ہو میرے بچوں۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے زکام زدہ آواز میں کہا۔ ان کی سوجی ہوئی آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت دیر سے روتے رہے ہیں۔

سحر نے پاپا کے سوٹ پر خون لگا دیکھا جو ابھی بھی تازہ تھا؛ تو سہم گئی اور پاپا کے حصار سے الگ ہو کر سر تا پیر انہیں دیکھا۔

"پاپا۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہے۔۔۔" سحر کی آواز کانپنے لگی اس کا دل ڈگمگا رہا تھا۔ سحر کی حالت غیر ہوتے دیکھ کر صائم بھی گڑبڑا گیا۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔ گولی شاویز کو لگی ہے۔۔۔ یہ اسی کا خون ہے۔۔۔" دلاور صاحب نے سحر کی نظریں اپنے خون سے تر شرٹ پر جمی پائی تو اس کا کندھا تھپکتے ہوئے وضاحت دی۔

شاویز کے زخمی ہونے کا سن کر سحر اور صائم کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ وہ سانس روکے منجمد کھڑے ہو گئے۔

سحر بیشک شاویز کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اور اس کی حقیقت سن کر تو وہ مزید زہر لگنے لگا تھا لیکن پھر بھی وہ اتنی بے حس نہیں تھی کہ زندگی اور موت سے جو نبھتے شاویز کے لیے اسے تکلیف

محسوس نہ ہوتی۔ یہی حالت صائم کی بھی تھی۔ ان دونوں نے افسردگی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

ان سے بات کرتے دلاور صاحب کو عابدہ کی فکر ہونے لگی۔

"بچوں۔۔۔ تمہاری ماما کیسی ہے۔۔۔" انہوں نے سحر اور صائم دونوں کو مخاطب کیا۔

"بہت پریشان تھی آپ کے لیے۔۔۔۔۔ رورو کر برا حال کر لیا ہے۔۔۔۔۔ آپ ان سے کال پر بات کر کے انہیں تھوڑی تسلی دے دیں۔۔۔" سحر نے دل گرفتگی سے ماما کی حالت بیاں کی۔

عارفہ اپنی امی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی تھی جب اس نے نیوز میں دلاور پرویز خان کے دفتر پر جھڑپ ہونے کی خبر دیکھی۔ عارفہ حیران پریشان کھڑی ہو گئی۔ امی کے بھی تاثرات متفکر ہو گئے۔ عارفہ نے جھک کر اپنا موبائل اٹھایا اور سحر کا نمبر ملانے لگی لیکن اس کا نمبر مصروف آ رہا تھا۔ وہ افففف کرتی مزید مضطرب ہو گئی۔ اس نے تیزی سے صائم کا نمبر ملایا دو بیل جانے پر اس نے کال اٹھالی۔

"صائم سب خیریت تو ہے نا۔۔۔۔ میں نے ابھی نیوز میں خان انکل کے دفتر پر حملے کا دیکھا۔۔۔۔ سحر کا نمبر بزی آ رہا تھا۔۔۔۔ تو تمہیں کال ملائی۔۔۔۔" عارفہ نے ایک سانس میں سارے سوال پوچھ لیئے۔

"کیا ہوا عارفہ۔۔۔۔۔ وہاں سب خیریت تو ہے نا۔۔۔۔۔" عارفہ کا چہرہ زرد پڑتے اور اس کی آنکھیں بھگتے دیکھ کر امی نے اسے جھنجھوڑا۔

"ہیلو۔۔۔۔۔ عارفہ۔۔۔۔۔" لائن کے دوسرے جانب صائم نے اسے پکارا۔

"کس ہسپتال میں ہو۔۔۔۔۔" غائب دماغی میں عارفہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

مطلوبہ ہسپتال کا نام بتا کر صائم نے کال کاٹ دی۔

عارفہ موبائل کا اسکرین دیکھتے شاویز کو یاد کرنے لگی۔ بریک اپ سے زیادہ تکلیف اپنے محبت کے زخمی ہونے کا سن کر ہوتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ سخت اسے زندگی بھر کے لیے کھو دینے کا خوف ہوتا ہے۔ اس نے فوراً سے آنسو صاف کئے اور امی کو تھوڑی دیر میں آتی ہوں کہہ کر لاؤنج سے باہر نکل گئی۔



"ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔ آپ خرچے کی بلکل فکر مت کیجیے۔۔۔۔۔ اپنی بیسٹ ٹیم کا بندوبست کریں۔۔۔۔۔ چاہے بیرون ملک لے جانا پڑے۔۔۔۔۔ لیکن میرے بیٹے کا تسلی بخش علاج کرائے۔۔۔۔۔ مجھے کسی چیز کی پروا نہیں ہے۔۔۔۔۔ آپ بس میرے بیٹے کو بچالیں۔۔۔۔۔" دلاور صاحب شاویز کی تشویشناک حالت کا سن کر پھر سے جذباتی ہونے لگے تھے۔

عارفہ تعجبی انداز میں دلاور صاحب کو دیکھ رہی تھی۔

"لگتا ہے۔۔۔۔۔ سحر نے شاویز کا پروپوزل منظور کر لیا ہے۔۔۔۔۔ اور اس لحاظ سے خان انکل اسے بیٹا بیٹا کہہ کر اس کی اتنی فکر کر رہے ہیں۔۔۔۔۔" اصل سچائی سے انجان عارفہ نے اپنے آپ سے ہی سحر اور شاویز کے رشتے کا گمان کر لیا۔

"لیکن سحر کو تو جاوید میں دلچسپی تھی پھر۔۔۔۔۔" وہ شاک پر شاک ہونے لگی۔

"سحر نے سوچ لیا ہو گا۔۔۔۔ جاوید نہیں تو شاویز ہی صحیح۔۔۔۔ آخر شاویز کسی ہیرو سے کم ہے کیا۔۔۔۔" عارفہ کا دل مایوسی میں ڈوب گیا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ وہ اس طرح پاگلوں کی طرح یہاں آنے کی غلطی کرنے پچھتانے لگی۔

ڈاکٹر نفی میں سر ہلاتے ہوئے دلاور صاحب کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

"i must say۔۔۔۔ بہت باصبر لڑکا ہے شاویز۔۔۔۔ ورنہ اس رینج کی گولی کا زہر برداشت کرنا۔۔۔۔ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔۔۔۔" ڈاکٹر نے گولی کی سائز اور پہنچائے جانے والے نقصانات کی نوعیت بتائی۔

"اپنے جسم کے آخرے قطرے بلڈ تک اس نے موت سے مقابلہ کیا ہے۔۔۔۔ بہت مضبوط جان ہے۔۔۔۔ انشاء اللہ یہ بھی survive کر لیں گا۔۔۔۔ آپ بس دعا کریں۔۔۔۔"

ڈاکٹر نے پروفیشنل انداز میں دلاور صاحب کو تسلی دی اور ان کا بازو تھپتھپاتے ہوئے واپس آپریشن تھیٹر کے اندر چلے گئے۔

دلاور صاحب نے دعا کے جیسے ہاتھ ہوا میں بلند کئے۔ عارفہ نے بھی چہرے پر ہاتھ رکھ شاویز کی زندگی کی دعا کی۔ جبکہ جاوید سحر اور صائم دل گرفتگی سے خاموش کھڑے رہے۔



جاوید گھر جا کر کپڑے تبدیل کر کے سادی شلوار قمیض پہن کر ایک گھنٹے تک واپس آیا۔

"خان انکل اب آپ کو گھر جانا چاہیے۔۔۔۔۔ کب تک ایسے پریشان بیٹھے رہے گے۔۔۔۔۔"

میں ہوں نہ یہاں۔۔۔۔۔" جاوید نے دلاور صاحب کے لیے متفکر ہوتے ہوئے کہا۔

"پاپا۔۔۔۔ جاوید ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔۔ متواتر ٹینشن لیتے رہنے سے آپ کا بی پی بڑھ جائے گا۔۔۔۔ رات ہو رہی ہے۔۔۔۔ آپ گھر چل کر آرام کر لیں۔۔۔۔" سحر نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"پاپا۔۔۔۔ جاوید بھائی کے ساتھ میں رک جاؤ گا۔۔۔۔ آپ گھر جائے۔۔۔۔ ماما بھی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔۔۔۔ میں آپ کو کال پر شاویز کی اپ ڈیٹ دیتا رہوں گا۔۔۔۔" صائم نے اپنے جانب سے پاپا کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

صائم نے سوچا جب شاویز دشمن ہو کر تب اس کے ساتھ ایکسیڈنٹ کی رات ہسپتال میں رک سکتا تھا پھر اب بھائی ہو کر وہ کیسے نہ رکے۔

دلاور صاحب کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن بچوں کے اصرار پر وہ گھر جانے کے لیے راضی ہو گئے۔
وہ سحر اور عارفہ کے ساتھ گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔

عارفہ کو اس کے گھر ڈراپ کر کے سحر پاپا کا بازو تھامے انہیں سہارا دیتی گھر کے اندر داخل ہوئی۔

عابدہ بیگم مضطرب سی لاؤنج میں بیٹھی ان کے انتظار میں تھی۔ ان کو آتے دیکھا تو تیزی سے ان کے پاس آئی اور دلاور کا دوسرا بازو تھام لیا۔

"دلاور۔۔۔ کیا حال بنا لیا ہے آپ نے۔۔۔" ان کے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے
تھے۔

پاپا کو صوفے پر بیٹھا کر سحر کچن میں چلی گئی اور پانی کی بوتل لائی پھر انہیں گلاس بھر کر پانی دیا۔

دلاور صاحب نے یانی پی کر گلاس واپس سحر کو پکڑ لیا۔

"میں کھانا لگاتی ہوں۔۔۔" عابدہ بیگم اٹھنے لگی تھی لیکن دلاور صاحب نے روک لیا۔

"میرا بلکل دل نہیں ہے۔۔۔۔ میں بس آرام کروں گا۔۔۔" انہوں نے کھانے سے منع کر دیا اور اپنے کمرے کے جانب بڑھ گئے۔



جب دلاور صاحب نے کھانے سے انکار کر دیا تو عابدہ بیگم ایک گلاس گرم دودھ لیں آئی۔
وہ کمرے میں داخل ہوئی تو دلاور صاحب فریش ہوئے کپڑے بدلے واشروم سے باہر نکل
رہے تھے۔

"کم از کم دودھ ہی پی لیں۔۔۔۔۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔۔۔" عابدہ بیگم نے
اداسی سے کہا۔

دلاور صاحب بیڈ پر نیم دراز ہوئے اور بیوی کا پیار سے پیش کردہ گلاس تھاما۔

"تم مجھ پر بہت خفا ہو گی عابدہ۔۔۔۔۔ میرا اتنا بڑا راز ایسے تم پر افشاں ہو گیا۔۔۔" دلاور
صاحب نے مایوسی سے سر جھٹکا۔

دلاور صاحب یک ٹک اپنی نیک اور پر خلوص بیوی کی گفتگو سن رہے تھے۔

دلاور صاحب نے عابدہ بیگم کو تھام کر اپنے سینے سے لگایا۔

"میں بہت خوش نصیب ہوں۔۔۔۔۔ جو مجھے تم جیسی شریک حیات ملی ہے۔۔۔۔۔ میں اللہ کا بہت شکر گزار ہوں۔۔۔۔۔ میری بیوی میرے بچیں اس موقع پر بھی میرے ساتھ ہے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے سکون کا سانس لیا۔

"اور میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔۔۔۔۔ مجھے اپنا میاں بہت عزیز ہے۔۔۔۔۔ یہ ہمیشہ یاد رکھیے گا۔۔۔۔۔" عابدہ بیگم نے ان کے گرد بازو مائل کئے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے ان کے بات میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"عابدہ۔۔۔۔۔ شاویز میرا بیٹا ہے۔۔۔۔۔ میں اسے اسی گھر میں لانا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ تم اور بچیں اسے اپنا لو گے نا۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے سنجیدہ ہو کر ان سے اپنی دلی کیفیت بیان کی۔

"اب اتنی بھی اچھی نہیں ہوں میں۔۔۔۔۔ یہ نہ ہو میری معصومیت کا فائدہ اٹھا کر۔۔۔۔۔ کل کو آپ تیسری چھوٹی شادی کرنے کا سوچے۔۔۔۔۔ یاد رکھیں تب مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا ہاں۔۔۔۔۔" عابدہ بیگم نے ہنہ کرتے ہوئے کہا۔

ان کی بات پر دلاور صاحب کھکھلا کر ہنسنے لگے۔

دونوں میاں بیوی خوش دلی سے مہو گفتگو تھے جب دلاور صاحب کاموبائل بجنے لگا۔ انہوں نے سنجیدہ ہو کر کال اٹھائی دوسرے جانب صائم تھا۔

"ہاں صائم۔۔۔۔۔ سب خیریت ہے نا۔۔۔۔۔ شاوینز ٹھیک تو ہے۔۔۔۔۔" ان کے آواز میں اچانک پریشانی در آئی تھی۔

"ریلیکس پاپا۔۔۔۔۔ سب خیریت ہے۔۔۔۔۔ بلکہ گڈ نیوز ہے۔۔۔۔۔ ابھی ابھی ڈاکٹر نے بتایا
شاویز کی ہارٹ بیٹ نارمل ہونے لگی ہے۔۔۔۔۔ وہ خطرے سے باہر آ رہا ہے۔۔۔۔۔" صائم نے
خوش مزاجی سے کہا۔ اس کی نظریں ابھی ابھی جاوید سے بات کرتے ڈاکٹر پر مرکوز تھیں۔

"یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اللہ کے حضور
شکر ادا کیا۔

"پاپا۔۔۔۔۔ آپ بے فکر ہو کر سو جائے۔۔۔۔۔ اب سب ٹھیک ہے۔۔۔۔۔" پاپا کو تسلی ہوتے
دیکھ کر صائم خوش ہو گیا۔

عابدہ بیگم کو خیر خبر سنائی۔



گھر لوٹنے کے بعد عارفہ امی کو وہاں کی روداد سنا کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کا دل اداسی میں ڈوب گیا تھا۔ شاویز کے انکار نے اسے کمزور تو کر دیا تھا لیکن سحر کو شاویز کے ساتھ سوچ کر وہ پوری طرح ٹوٹ گئی تھی۔ بے آواز روتی اس کے دل میں سحر کو لے کر شکایتیں پھنپ رہی تھی۔

ہسپتال لائے جانے سے اب تک اسے پانچ بوتل خون چڑھایا گیا تھا اور متواتر وہ مشینوں اور ڈریپوں سے جڑا ہوا تھا حتہ کہ آکسیجن ماسک بھی ابھی تک لگی ہوئی تھی۔

وہ پورا دن دلاور صاحب وہی بیٹھے بے ہوش سے شاویز کو دیکھتے رہے۔ رات پھر صائم آ گیا تھا۔



دو دن تک مسلسل شاویز کبھی ہوش میں آتا کبھی بے ہوش رہتا۔ دن میں اس کے پاس دلا اور صاحب رہتے اور رات میں صائم۔

شاویز سے لگے مشینوں کی تعداد تیسرے دن قدرے کم ہو گئی۔ خون چڑھانا بھی روک دیا اور آکسیجن ماسک ہٹا دیا گیا۔ وہ اتنا بہتر ہو گیا تھا کہ قدرتی طور پر سانس لے سکے۔

چوتے دن شاویز دوائیوں کے اثر سے باہر آنے لگا۔ اسے ہوش آ گیا تھا۔ جب اس نے آنکھیں کھولی تو اسے دلا اور صاحب اپنے سر ہانے کھڑے ملے۔ شاویز کا دماغ ابھی بھی ماؤف تھا۔ وہ صرف ڈاکٹر کو دلا اور صاحب سے باتیں کرتے دیکھ رہا تھا پر ان کی گفتگو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پاپا کبھی اسے دیکھتے کبھی ڈاکٹر کو اور پھر ان کے چہرے پر مستحکم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاید ڈاکٹر انہیں شاویز کی تیزی سے recovery کے بابت تسلی دے رہے تھے۔ شاویز کچھ دیر

آنکھیں کھولے سُن جسم اور ماف دماغ پڑا رہا اور پھر سے اس پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا وہ
آنکھیں بند کر کے پھر سے گہری نیند سو گیا۔



ایک ہفتہ لگا کر شاویز مکمل ہوش و حواس میں لوٹ آیا۔ اب وہ سب کچھ واضح طور پر دیکھ اور
سن سکتا تھا۔ البتہ زیادہ ہلنے جلنے سے ڈاکٹر منع کر رہے تھے۔ اس کے باقی سارے حسات بحال
ہو گئے پر اس دایاں بازو بے حس و حرکت تھا۔

"تمہارے کندھے سے بازو کو جوڑنے والی کچھ رگیں گولی لگنے سے کٹ گئی تھی۔۔۔۔۔ ہم
نے دوبارہ جوڑ دی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن کنکشن جڑنے میں وقت لگے گا۔۔۔۔۔ تب تک تمہارا

دلا اور صاحب تو ایک ہفتے سے دفتر ہی نہیں گئے تھے۔ وہ روز صبح اس کے پاس آ جایا کرتے۔ ان کے ہاتھوں عابدہ بیگم بھی اس کے لیے سوپ، کھجڑی، بیخنی، تازہ پھل، بھیجا کرتی جب کہ خود ہسپتال نہیں آئی تھی۔ نہ ہی سحر آتی اور جب سے اسے ہوش آیا تھا صائم بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اکثر راتوں کو سٹاف کے سہارے گزار دیتا پر پاپا کو رات رکنے کی زحمت دینا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ اب وہ جلد از جلد رخصت ہونا چاہتا تھا تا کہ پاپا اس آنے جانے کے جھنجٹ سے آزاد ہو جائے۔

دسویں دن شاویز کو ہسپتال سے چھٹی ملی۔ اس کے ہاتھ کو سہارا دینے band میں ڈال کر اس کے گلے سے باندھ دیا تھا۔ وہ ابھی تیار بیٹھا تھا کہ صائم اور جاوید کمرے میں داخل ہوئے۔

"کیسے ہوشاویز۔۔۔۔" جاوید آگے آکر اس سے ملا۔ پچھلے دس دنوں میں وہ اکثر و بیشتر ملنے آیا کرتا تھا جبکہ صائم پہلی مرتبہ آیا تھا۔ وہ فری انداز میں ملنے سے جھجک رہا تھا تو شاویز نے بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ دونوں سرسری انداز میں ملے۔

سب ابھی ڈاکٹر کے آخری دورے کے انتظار میں تھے جب دلاور صاحب کو اچانک خیال آیا۔

"جاوید۔۔۔۔ راشد ہاشمی کا کیا بنا۔۔۔ میں تو اس کے بارے میں پوچھنا ہی بھول گیا تھا۔۔۔"

دلاور صاحب نے تشویش سے جاوید کو دیکھا۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

"اسے تو اگلے ہی دن۔۔۔۔ آرمی ایجنسی والے لیں گئے۔" جاوید نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"ایجنسی والے۔۔۔" دلاور صاحب شاک ہو گئے۔

"جی۔۔۔ آرمی والوں کا ایک سیکرٹ ایجنٹ راشد ہاشمی پر فائل تیار کر رہا تھا اور اس دن ہمارے ریڈ کرنے سے کچھ دیر پہلے اس ایجنٹ نے فائل ایجنسی کو ہینڈ اوور کر دی تھی۔۔۔۔۔ اس لیے اگلے ہی دن آرمی سٹاف نے ایکشن لیا اور راشد ہاشمی کو لے گئے۔۔۔۔۔" جاوید نے جوش و خروش سے واقع سنایا۔

شاویز اپنی مسکراہٹ دبائے ہوئے آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے رخ پھیر گیا۔ اسے بل واسطہ اپنے کارنامے کے بارے میں سن کر ہنسی آرہی تھی۔

"ہمممم چلو اچھا ہوا۔۔۔۔۔ بس جو بھی ہو۔۔۔۔۔ بچ کے نکلنا نہیں چاہیے۔۔۔" دلاور صاحب کے آبرو تن گئے۔

شاويز ان کے ہمراہ گھر آیا تو عابدہ بیگم اسی گرم جوشی سے ملی جسے پہلے دن ملی تھی۔ ان کے ملنے میں ناراضگی یا خفگی کے کوئی اثر نہیں تھے۔ ناسوتیلاین تھا۔

سحر اوپر سیڑھیوں کے سرے پر کھڑی سپاٹ تاثرات بنائے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاویز نے ایک نظر اسے دیکھا اور پاپا کے ساتھ نیچے کے کمرے میں چلا گیا جو پاپا نے اس کے لیے تیار کروایا تھا۔

اس کے کھانے پینے کا انتظام کمرے میں ہی کیا گیا تھا۔ دلاور صاحب اور عابدہ بیگم دونوں اس بات کا خاص خیال رکھ رہے تھے کہ اس کی آرام اور خدمت میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

اس رات دلاور صاحب کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔ دونوں پیر دراز کئے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔

"تمہاری آنکھیں بالکل زرتاج جیسی ہے۔۔۔۔۔" پیانے کافی دیر بعد اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماں ہمیشہ کہتی تھی۔۔۔۔۔ میری ناک میرے پایا جیسی ہے۔۔۔" اس نے اپنے ہنسنے کی تفصیل بتائی۔ دلاور صاحب نے ایک گہری نظر سرتا پیر اسے دیکھا انہیں شاوہز اپنے جوانی کا عکس لگا۔

"چلو اب تم آرام کرو۔۔۔ اور یہ تمہارا بھی گھر ہے شاویز۔۔۔ کچھ بھی چاہیے تھا۔۔۔ بے جھجک بول دینا۔۔۔" دلا اور صاحب اسے پیار کرتے ہوئے اس کے پہلو سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

شاویز تکیہ درست کر کے لیٹ گیا۔ اتنے دنوں سے وہ بے ہوشی کے عالم میں بے خبر سوتا رہا تھا پر آج ہوش و حواس میں اسے سونے میں مشکل پیش ہو رہی تھی۔ اس کا insomnia پھر سے اس پر حاوی ہو گیا تھا



ایک ہفتے تک شاویز کی صائم اور سحر سے کوئی خاص ملاقات نہیں ہوئی۔ کبھی شاویز کمرے میں ہوتا۔ کبھی وہ دونوں۔ شاویز معمول زندگی میں لوٹنے لگا تھا۔ اس کی رنگت بحال ہونے لگی تھی۔ کندھے کا زخم کافی بہتر ہو گیا تھا۔ وہ پابندی سے پٹی تبدیل کرواتا رہا البتہ ہاتھ میں اب تک حرکت نہیں ہو سکی تھی۔

ایک رات ڈنڑ پر وہ ان کے ساتھ ٹیبل پر آکر بیٹھا۔

"کمرے میں اکیلے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔۔۔ سوچا سب کے ساتھ مل کر ڈنر کروں۔۔۔"

شاویز نے کچھ ہچکچاتے ہوئے وضاحت دی۔

"بہت اچھا کیا۔۔۔" دلاور صاحب سے پہلے جواب عابدہ بیگم نے دیا اور اس کے ساتھ والی

سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔

سب اپنے اپنے کھانے میں مشغول ہو گئے۔ شاویز کا دائیاں ہاتھ بے حس تھا اور سب کے سامنے بائیں ہاتھ سے کھانے میں اسے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی وہ سالن میں چھج ہلا رہا تھا کہ عابدہ بیگم نے اس کی پریشانی محسوس کر لی اور اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا کر شاویز کے آگے کیا۔

شاویز نے تعجب سے پہلے انہیں دیکھا پھر ان کے ہاتھ کو۔ یک دم شاویز کو اپنا بچپن یاد آیا جب وہ باورچی خانے کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر اپنی ماں کے ہاتھ سے کھانا کھایا کرتا تھا۔ شاویز کے چہرے پر مایوسی چھانے لگی۔ اس کے آنکھوں کے کنارے بھگینے لگے۔ عابدہ بیگم سے اپنے آنسو چھپانے وہ رخ پھیر گیا اور آنکھیں بند کر کے آنسو اپنے اندر اتارنے لگا۔

عابدہ بیگم کو لگا شاید شاویز ان کے ہاتھ سے کھانا نہیں چاہتا اس لیے اداسی سے دلاور صاحب کو دیکھتے ہوئے ہاتھ نیچے کرنے لگی۔ دلاور صاحب بھی افسردگی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ابھی عابدہ بیگم سر جھٹک کر نوالہ واپس پلیٹ میں رکھنے لگی تھی کہ شاویز نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور مسکراتے ہوئے اپنا منہ آگے کر کے ان کے ہاتھ سے نوالہ لے کر چبانے لگا۔

عابدہ بیگم خوشی سے چہک اٹھی۔ اور تیزی سے دوسرا نوالہ بنانے لگی۔ دلاور صاحب شاویز کے اس مہربانی سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہوئے۔

صائم نے منہ بنائے ہوئے سحر کو دیکھا۔ اس کا دل بد مزہ ہو گیا تھا لیکن سب کا احترام کرتا ٹیبل پر بیٹھا رہا جب کہ سحر سے اور دیکھا نہیں گیا۔ وہ ٹیبل پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے اٹھی اور کھانا چھوڑ کر پیر پٹختی اپنے کمرے کے جانب بڑھ گئی۔ سب اس کے جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

عابدہ بیگم نے تنے ہوئے اعصاب سے اسے روکنا چاہا لیکن دلا اور صاحب نے کنکارتے ہوئے انہیں آنکھوں کے اشارے سے منع کر دیا۔ شاویز چھنپ سا گیا لیکن خاموشی سے کھانا جاری رکھا۔



سحر دل گرفتگی سے بیڈ سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھی۔ گھٹنوں کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بھگنے لگی۔ خود کو رونے سے روکنے وہ سر گھٹنوں میں چھپا کر تیز تیز سانس لینے لگی۔ اسے اپنے کمرے کا دروازہ کھلتا اور پھر کسی کا اپنے پاس آ کر فرش پر بیٹھنا محسوس ہوا لیکن اس نے پھر بھی سر نہیں اٹھایا۔

"کیا ہو امیری princess ---- تمہیں ایسے کھانے کی بے حرمتی کرنا سیکھایا ہے کیا میں نے ----" "پاپا نرمی سے گویا ہوئے۔ سحر نے کوئی رد عمل نہیں دکھایا۔

"شاویز کا غصہ کھانے پر کیوں اتارنا۔۔۔ ہم ----" "انہوں نے مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

سحر نے سر اٹھایا تو اس کے رخسار بھگے ہوئے تھے۔

"آئی ایم سوری پاپا۔۔۔۔۔ آپ نے اور ممانے بھلے ہی سب کچھ بھلا کر اسے معاف کر دیا ہو۔۔۔۔۔ اسے اپنا لیا ہو۔۔۔۔۔ لیکن میرے لیے اتنا آسان نہیں ہے۔۔۔۔۔" سحر نے بھر آئی آواز میں کہا۔

"اس نے سب سے زیادہ مجھے پریشان کیا۔۔۔۔۔ مجھے ڈرا یاد ہم کایا۔۔۔۔۔ میں خوف کی وجہ سے رات کو سو نہیں پاتی تھی۔۔۔۔۔ دن میں اکیلے نکلنے سے ڈرتی تھی۔۔۔۔۔ میں اتنی جلدی شاویز کو معاف کر کے اس سے اپنا رشتہ ہموار نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔" اس نے دبے دبے غصے میں پاپا پر اپنی دلی کیفیت ظاہر کی۔

دلاور صاحب نے بااعتماد اور مستحکم بھرے انداز میں اس کے گرد بازو مائل کیا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ اور کون کہہ رہا ہے اس سے فوراً سے رشتہ ہموار کرنے کا۔۔۔۔۔ کسی نے فورس کیا تمہیں۔۔۔۔۔" دلا اور صاحب نے معصومیت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ سحر نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم اتنے دنوں سے شاویز سے بے رخی برت رہی ہو۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ بھی تم نے اس کی عیادت تک نہیں کی۔۔۔۔۔ وہ موت کی منہ سے بچ کر آیا۔۔۔۔۔ تم نے اس کی خیریت تک دریافت نہیں کی۔۔۔۔۔ کیا شاویز نے کوئی رد عمل دکھایا۔۔۔۔۔" سوال اب بھی اسی انداز میں پوچھا گیا۔ سحر نے شرمسار ہوتے ہوئے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر۔۔۔۔۔ تمہیں جتنا وقت درکار ہے۔۔۔۔۔ تم لے لو۔۔۔۔۔ میز پر ہاتھ مارو۔۔۔۔۔ کھانا چھوڑو یا چیزیں توڑو۔۔۔۔۔ لیکن سحر۔۔۔۔۔ شاویز اس گھر کا فرد ہے۔۔۔۔۔ وہ اب

اس فیملی کا حصہ ہے۔۔۔۔۔ میں اس سے منہ نہیں پھیر سکتا۔۔۔۔۔ یہ حقیقت تم جتنی جلدی تسلیم کر لو گی۔۔۔۔۔ اتنا تمہارے لئے آسانی ہو گی۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے اس کا رخ اپنے جانب کیا اور اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرائے۔

"والدین کے دل میں ہر اولاد کی اپنی جگہ ہوتی ہے۔۔۔۔۔ کیا شاویز کے آنے سے میں نے تمہیں اور صائم کو پس پشت ڈال دیا ہے۔۔۔۔۔ تم دونوں کے ساتھ میرا رویہ بدل گیا ہے۔۔۔۔۔" پاپا اب اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مہو گفتگو تھے۔ سحر نے پھر سے اداسی سے نفی میں سر ہلایا۔

"میرے دل میں تمہاری اپنی جگہ ہے۔۔۔۔ صائم کی اپنی۔۔۔۔ اور شاویز کی اپنی۔۔۔۔ نہ وہ تم دونوں کی جگہ لے سکتا ہے۔۔۔۔ نہ تم دونوں اس کی۔۔۔۔" دلاور صاحب نرمی سے اپنی بیٹی کو سمجھانے لگے تھے۔

اچکائے

ڈانگ ٹیبل پر بیٹھ کر دلاور صاحب نے ہاتھ میں نوالہ بنا کر سحر کے آگے کیا۔ سحر نے پاپا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے پاپا سے شرم آنے لگی۔

"کیا ہوا۔۔۔ میرے ہاتھ سے کھانے میں شرم آرہی ہے۔۔۔۔۔" پاپا اس کی جھجک جانچ گئے۔

"تمہیں پتا ہے۔۔۔ امم، ممم۔۔۔ تمہیں کیسے پتا ہو گا۔۔۔ تم تو بہت چھوٹی تھی۔۔۔۔۔ دو سال کی تھی۔۔۔ عابدہ کو کسی فنڈ ریزنگ تقریب میں شامل ہونے دو راتوں کے لیے اسلام آباد جانا پڑا تھا۔۔۔ صائم ایک سال کا تھا اسے وہ ساتھ لے گئی۔۔۔ لیکن تمہیں میرے پاس چھوڑ گئی تھی۔۔۔ تب وہ دو دن۔۔۔ میں نے تمہیں ممان بن کر کھلایا پلایا۔۔۔ اپنے ساتھ سلایا۔۔۔ پھر آفس لے گیا وہاں بھی تمہاری دیکھ بھال کی۔۔۔۔۔ اور اب دیکھو۔۔۔ میرے ہاتھ سے کھانے میں جھجک رہی ہے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب منہ بناتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

"i love you ----" سحر نے بچپن کے جیسے انداز میں ان کے کمر کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے کہا۔

"i love you too ----" دلاور صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"i love you two ----" صائم نے ان دونوں کے گرد بازو پھیلائے اور تینوں کھکھلا کر ہنسے۔

ان سے دور بچن کے در پر کھڑی عابدہ بیگم کی آنکھوں کے کنارے بھگنے لگے۔ وہ جانتی تھی ان کے بچوں کو صرف ان کے پاپا ہی قائل کر سکتے ہیں۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے آبدیدہ آنکھیں صاف

کرنے لگی تھی کہ انہیں اپنے کندھے پر کسی کا لمس محسوس ہوا۔ شاویز ان کے دائیں جانب کھڑا ہوا اور اپنا بایاں ہاتھ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سامنے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

"شاویز۔۔۔ تم سحر کو مائنڈ مت کرنا۔۔۔ وہ بہت حساس مزاج کی ہے۔۔۔ کسی سے جلدی گھلتی ملتی نہیں ہے۔۔۔" ممانے سحر کے رویئے کی وضاحت دی۔

"میں جانتا ہوں ممانے۔۔۔" شاویز نے با اعتماد لہجے میں کہا۔

"دیکھنا وہ جلد تمہارے ساتھ ٹھیک ہو جائے گی۔۔۔ ایک بار اس کا دل کسی کے ساتھ لگ جائے پھر ہمیشہ اچھے تعلقات نبھاتی ہے۔۔۔ جیسے۔۔۔ جیسے عارفہ کے ساتھ۔۔۔" ممانے مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہمممم۔۔۔۔۔ جیسے جاوید کے ساتھ۔۔۔۔۔" شاویز نے کہتے ہوئے چمکتی آنکھوں سے ماما کو دیکھا۔ وہ حیران ہو گئی تھی۔ شاویز کی تیز نظروں سے سحر کی جاوید کے جانب دلچسپی چپی نہیں رہی تھی۔

عابدہ بیگم نے آبرو اچکا کر سچ میں؛ کا اشارہ کیا۔ شاوینز نے پورا مسکرا کر پلکیں جھپکاتے ہوئے سر کو خم دے کر تصدیق کر دی۔



دس دن ہسپتال میں اور ایک ہفتے تک گھر میں رہ کر شاویز کے کام کا بہت نقصان ہو چکا تھا۔ وہ اپنے فلیٹ سے ضروری اشیاء گھر لا کر جاب پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ حالانکہ پایا نے اسے مزید کچھ دن ریسٹ کرنے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔

شاویز کا زخم کافی بہتر ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کو سپورٹ دینے والا بینڈ بھی اتار دیا تھا۔ اب وہ روز دائیں بازو اور ہاتھ کو فیزیو تھراپسٹ کے زیر نگرانی ورزش دیتا تا کہ جلد قابل حرکت ہو سکے۔

اب تک اس نے پایا ممایا گھر پر کسی کو اپنے جاب کی نوعیت نہیں بتائی تھی بس اتنا کہا تھا سرکاری نوکری کرتا ہے۔

ان دنوں یونیورسٹی کے فائنل ٹرم کے امتحانات اپنے اختتام کو پہنچنے والے تھے۔

سحر اور عارفہ کارول نمبر الگ الگ ہال میں لگا تھا۔ سحر اپنا پیپر جلدی ختم کر کے عارفہ کے ہال کے جانب چل رہی تھی جب راستے میں شہزاد اس سے آملا۔

"سحر۔۔۔ پیپر کیسارہا۔۔۔" اس نے پہلے معمول کی بات کر کے گفتگو کا آغاز کیا۔

"اچھا رہا۔۔۔" سحر نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"سحر۔۔۔۔۔ اب تو ہم دوست سے تھوڑا آگے بڑھ سکتے ہیں نا۔۔۔۔۔" شہزاد نے اس کے آگے آکر اس کا راستہ روکا۔

"سحر۔۔۔ دو سال سے کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ تم ان سب سے آگے بڑھ کر بھی تو سوچو۔۔۔ میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا" شہزاد نے مضبوطی سے سحر کی کلائی پکڑے ہوئے کہا۔

"شہزاد کیا بد تمیزی ہے یہ۔۔۔ چھوڑو۔۔۔" سحر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ تند و تیز آواز میں اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"پر اہلم کیا ہے تمہیں مجھ سے۔۔۔ اتنا cool ، good looking اور امیر تو ہوں۔۔۔" تم آخر لڑکے میں اور کیا دیکھتی ہو۔۔۔" شہزاد اسے اپنے خصوصیات گنوانے لگا۔

سحر نے مزید اس کے منہ لگنے کی بجائے اپنی قوت سے مزمت شروع کی تھی کہ اس نے شہزاد کے ہاتھ پر ایک مضبوط ہاتھ پڑتے دیکھا۔ اس نے رخ اوپر کر کے دیکھا تو شاویز اس کے ساتھ آکر کھڑا تھا اور شہزاد کے ہاتھ پر اپنے بائیں ہاتھ سے دباؤ دے رہا تھا۔

"ہاتھ چھوڑو۔۔۔" شاویز نے سپاٹ تاثرات بنائے ہوئے کہا۔

"دیکھ شاویز تو بیچ میں مت آ۔۔۔ ضروری نہیں ہر لڑکی تجھ سے ہی سیٹ ہو۔۔۔۔ عارفہ کو پٹالیا تھانا۔۔۔ اب سحر کو میرے لیے چھوڑ۔۔۔ اس پر اپنے شرافت کا جادو ٹرائی مت کر۔۔۔" شہزاد کے آبرو تن گئے۔

شاویز نے ایک نظر سحر کو دیکھا۔ وہ ضبط کرتے ہوئے نگاہیں چراگئی۔ شاویز نے شہزاد کا ہاتھ چھوڑا اور اپنا ہاتھ پورا گما کر اسے زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ سحر کے ہاتھ پر اس کی گرفت کمزور ہو گئی اور کراہتا ہوا لڑکھڑا کر وہ زمین بوس ہو گیا۔

سحر کا منہ کھل گیا۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئی۔ دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ساکت کھڑی ہو گئی تھی۔

شاویز آگے کوچھکا اور شہزاد کا لرد بوج کر اسے کھڑا کیا۔

"بہن ہے یہ میری۔۔۔۔۔ آئی سمجھ۔۔۔۔۔ سحر میری بہن ہے۔۔۔۔۔ آئندہ اسے تنگ کیا۔۔۔۔۔ تو منہ توڑ کر رکھ دوں گا۔۔۔" شاویز نے اس کے منہ کے پاس دانت پر دانت جمائے ہوئے غراتے ہوئے کہا اور اسے دھکا دے کر دور کر دیا۔ پھر خود سحر کے آگے سے ہٹ کر اسے جانے کے لیے راستہ دیا۔

سحر پھٹی نظروں سے اسے دیکھتے آگے بڑھ گئی۔ جاتے جاتے بھی اس نے پلٹ کر شاویز کو دیکھا وہ اسی انداز میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے نظروں سے گھبرا کر سحر واپس مڑی اور تیز تیز چلنے لگی۔



سحر عارفہ کے باہر آنے تک اس کے انتظار میں ہال کے سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں بار بار شاویز کا کہا جملہ گردش کر رہا تھا۔

"انگلیاں گھیس گئی لکھ لکھ کر۔۔۔ اس لیے مجھے امتحانات نہیں پسند۔۔۔" عارفہ نے سحر کے ساتھ آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سحر اپنے خیالوں سے نکل کر اس کے جانب متوجہ ہوئی۔

امتحان پر تبادلہ خیال کر کے عارفہ نے سحر کے موڈ کا خیال کرتے ہوئے شاویز کی عیادت کی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ پہلے سے بہت بہتر ہے۔۔۔۔۔ اب گھر سے نکلنے بھی لگا ہے۔۔۔۔۔ ہاتھ میں پھر سے حرکت کی امید بھی بن رہی ہے۔۔۔" سحر نے نارمل انداز میں صورت حال سے واقف کیا۔

"تم خوش ہو گی۔۔۔۔۔ وہ اب ہر وقت تمہارے پاس رہتا ہے۔۔۔۔۔ خان انکل نے تم دونوں کا رشتہ اپنا لیا ہے۔۔۔۔۔ اسے گھر میں پناہ دی ہے۔۔۔" عارفہ نے کھوئے انداز میں کہا پر سحر کو اس کی باتوں سے شک سا لگا۔

"میں اسے نہیں چھوڑو گی۔۔۔۔۔ جتنا اس نے مجھے پریشان کیا ہے۔۔۔۔۔ اب اتنا ہی میں بھی کروں گی۔۔۔۔۔ مسٹر شاویز۔۔۔۔۔ اب میں نے تمہاری نیند نہ اڑادی تو دیکھنا۔۔۔۔۔" وہ پر عزم انداز میں فیصلہ کرتے ہوئے اٹھی اور روش پر چلنے لگی۔

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ اس نے مجھے بھی بہت رلایا ہے۔۔۔ اب مل کر سبق سیکھائے گے۔۔۔" عارفہ نے سحر کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔



مزید ایک ماہ تک شاویز کا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا تھا اور اب ہاتھ میں بھی ہلکی حرکت ہونے لگی تھی۔ دلاور صاحب اپنے بزنس میں جٹ گئے تھے۔ عابدہ بیگم اپنی معمول زندگی میں۔

سحر کی گریجویشن مکمل ہو گئی تھی۔ صائمہ کا سیکنڈ ایئر شروع ہو گیا تھا۔

ایک دن گھر کے لان میں ہی شام کو صائم فٹبال پر کیٹس کر رہا تھا۔ شاویز آنکھوں پر گلاس لگائے اسٹائل سے سفید کار سے اتر کر گھر کے اندر داخل ہوا۔

اس نے اپنی بلیک لینڈ کروزر کار ایجنسی کو واپس دے کر چھوٹی سفید کار لے لی تھی۔

وہ لاؤنج میں جانے لگا تھا جب اس نے صائم کو کھیلتے دیکھا۔ شاویز گلاس اتار کر شرٹ میں رکھتا وہاں آیا اور مقابلہ کرنے کے انداز میں صائم کے ساتھ فٹبال کھیلنے لگا۔ صائم کو اس کی مداخلت اچھی تو نہیں لگی لیکن جس طریقہ کار سے وہ فٹبال کے کرتب دکھا رہا تھا صائم مسرور ہونے لگا۔ اسی طرح کرتے ہوئے شاویز نے دو گول مارے۔ صائم کے آبرو تن گئے اس نے زور داد شاٹ مارا تو فٹبال اچھلتے ہوئے شاویز کے پاس آئی۔ شاویز ہلکا جھک گیا اور فٹبال اس کے زخمی کندھے کے اوپر سے گزر گئی۔ صائم سہم گیا اور بھاگ کر اس کے پاس آیا۔

"سوری۔۔۔ لگی تو نہیں۔۔۔" اس نے شرمسار ہوتے ہوئے شاویز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تصدیق کرنی چاہی۔

"نہیں بچ گیا۔۔۔۔" شاویز نے مسکراتے ہوئے کہا اور اب وہ اسے اپنے طریقے کار سے گول کرنا بتا رہا تھا اور صائم بھی پوری توجہ سے اس کے ٹپس دوہرا رہا تھا۔



ان دنوں مون سون کی بارشیں اپنے پورے تاب سے برس رہی تھیں۔ شاویز مسجد میں مغرب کی نماز ادا کر کے تیزی سے پورا گھیرا ہوا گھر آیا اور اپنے شوز لاؤنج کے دروازے کے پاس

اتارے تاکہ کیچڑ لگے جو توں سے لاؤنج کافر ش خراب نہ ہو۔ وہ اپنے بیڈ روم میں جا کر بال سکھا کر کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا تو شوز باہر روش پر بارش میں پڑے تھے۔ اس کے پسندیدہ سپورٹس شوز خراب ہو گئے تھے۔ شاویز کو غصہ آنے لگا۔

"اووو پیس۔۔۔ کیا ہوا big brother۔۔۔۔۔ جو تے خراب ہو گئے۔۔۔۔۔" سحر اس کے پاس جتانے والے انداز میں طنزیہ ہنستی ہوئی گزر گئی۔ شاویز سمجھ گیا یہ کس کی حرکت ہے۔ بنا کچھ کہے وہ ضبط کر کے اندر چلا گیا۔

اسی طرح اکثر اوقات عارفہ بھی ان کے گھر آئی ہوئی ہوتی تھی۔ سحر کبھی شاویز کی الماری بکھیر دیتی۔ کبھی اس کے فائلز چھپا دیتی۔ کبھی عین نہاتے ہوئے وہ پانی کا کنکشن بند کر دیتی۔ اسی طرح وہ اور عارفہ الگ الگ طریقوں سے اسے تنگ کرنے لگی۔

شاویز نے کسی ٹارچر کا کوئی نیمل بدل نہیں دکھایا۔ سحر اور عارفہ کی شرارتوں سے اسے اکیڈمی کے دن یاد آجاتے اور سب سے بڑا شیطان کبیر یاد آجاتا اور وہ عارفہ اور سحر کی شرارتیں برداشت کر لیتا۔ ان کے برعکس صائم سے شاویز کا کسی حد تک تعلق سنور گیا تھا۔ اس چیز سے بھی سحر کو تپ چڑھنے لگی تھی۔ پہلے پایا پھر ماما اور اب صائم اپنے قریبی رفقاء کو شاویز کا ہوتے دیکھ کر وہ تپ گئی۔ اور ہر دن شاویز کو تنگ کرنے کی الگ الگ پلاننگ کرنے لگی۔



تین ماہ بعد شاویز کا ہاتھ حرکت میں آگیا تھا۔ وہ کم از کم پانی کا گلاس اٹھانے کے قابل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر اس کے حوصلہ مندی پر کافی خوش اور مطمئن ہو گیا تھا۔

اس دن ڈاکٹر کوچیک اپ کروانے کے بعد وہ دلاور صاحب زرتاج کی قبر پر آئے۔ دونوں باپ بیٹے نے اس کے لیے دعائیں مغفرت کی۔ اور کچھ دیر وہی بیٹھے رہے۔

پاپا کو دیکھتے دیکھتے اچانک شاويز ادا اس ہو گیا۔

"میں نے آپ کا بہت بڑا نقصان کر دیا پاپا۔۔۔۔۔ وہ کمپنی۔۔۔ آپ کی پوری زندگی کا خواب تھی۔۔۔" شاويز نے شرمسار ہوتے ہوئے سر جھکا دیا۔

"تمہیں پتا ہے۔۔۔۔۔ سب سے امیر انسان کون ہوتا ہے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے تسکین سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سب سے بڑی دولت ایک آدمی کے لیے اس کی فیملی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ سب سے امیر انسان وہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ جس کے آج کل کے دور میں بھی اہل و صالح اور نیک اولاد ہوتی ہے۔۔۔۔۔" انہوں نے شاویز کا بازو تھام کر اس کا رخ اپنے جانب کیا۔

"میں اس وقت خود کو سب سے کامیاب آدمی تصور کرتا ہوں۔۔۔۔۔ کیونکہ۔۔۔۔۔ سحر اور صائم کی تو میں نے اور عابدہ نے پرورش کی ہے۔۔۔۔۔ لیکن تمہیں زر تاج بہت بچپن میں چھوڑ گئی۔۔۔۔۔ اور تب میں بھی نہیں تھا تمہارے پاس۔۔۔۔۔ پھر بھی تم بہت سلجھے ہوئے نیک لڑکے ہو۔۔۔۔۔ یہ میرے کسی نیک اعمال کا بل واسطہ حاصل ہی ہے میرے لیے۔۔۔۔۔" پاپا بہت شفقت اور نرمی سے اسے سمجھا رہے تھے۔ شاویز نے معصومیت سے ان کو دیکھا اور ان کے گلے لگ گیا۔

"پیسہ اور کمپنیاں آنی جانی چیز ہے۔۔۔۔۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ دوبارہ بنالوں گا۔۔۔۔۔ میں نہیں بنا سکا تو میرے بچے بنا دیں گے۔۔۔۔۔ تم وہ سب لے کر اداس مت ہو۔۔۔۔۔" پاپا نے اس

کاشانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ شاویز نے مشکور ہوتے ہوئے سر اثابت میں ہلایا اور دونوں اٹھ کر گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔



اللہ کے فضل سے شاویز کا مانگرین آج کل بہت کم ہو گیا تھا۔ اب چونکہ اسے کوئی ٹینشن نہیں تھی۔ کسی سے بدلہ لینے کا جنون نہیں تھا۔ کسی کو نقصان پہنچانے کا منصوبہ نہیں تھا۔ تو مانگرین بھی ختم ہونے کو تھا۔ جبکہ انسو نیا ابھی بھی برقرار تھا۔

ایک دن وہ رات بھر جاگے رہنے سے بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ چونکہ اتوار کا دن تھا تو اسے جاب پر بھی نہیں جانا تھا۔ وہ دیر سے کمرے سے باہر آیا۔

اس نے ناشتے کے بعد لنچ نہیں کیا اور کافی بنانے کچن میں چلا گیا۔ کافی بناتے ہوئے اس کا موبائل بجنے لگا وہ کال موصول کرنے روم میں چلا گیا۔ اسی اثناء سحر چپ کر کچن میں آئی اور شاویز کی کافی میں چیچ بھر کر نمک ڈال دیا۔ عارفہ دروازے پر کھڑی ہو کر فون کان سے لگائے شاویز کی ہیلو ہیلو سنتے ہوئے سحر کو جلدی ہاتھ چلانے کا اشارہ کرتی رہی۔

جب شاویز واپس روم سے باہر آیا تو عارفہ اور سحر صوفے پر خاموش بیٹھی تھیں۔ شاویز کو کچھ کھٹک محسوس ہوئی۔ وہ پر سوچ انداز میں کچن سے اپنا گ اٹھا کر باہر آیا اور چلتے چلتے کافی کا گھونٹ لیا تو اس کا منہ بد ذائقہ ہو گیا اس نے فوراً سے تھوک دیا اور کھانسنے لگا۔

دوسری جانب سحر کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ شاویز نے سپاٹ انداز میں مڑ کر دیکھا تو سحر عوض آبرو اچکا کر ہنسنے جارہی تھی جبکہ عارفہ شرمائی۔ اسے سحر کا ساتھ دینے پر افسوس ہوا۔ اس نے

لب مینچھے پلکیں جھپکا کر سوری کا اشارہ کیا لیکن شاوینز نظر انداز کر کے بے زاری سے الٹے قدم کچن میں چلا گیا۔

شام کے وقت سحر کو خوش دیکھ کر صائم اس کے پاس آیا اور وجہ پوچھی۔ سحر نے کھکھلاتے ہوئے اسے سب بتایا۔ عارفہ تب تک اپنے گھر واپس جا چکی تھی۔

"کتنی بری بات ہے سحر۔۔۔۔۔ اب بس بھی کرو۔۔۔۔۔ کتنا تنگ کرو گی اسے۔۔۔۔۔ ایسا بھی کیا بگاڑا ہے اس نے۔۔۔۔۔ کبھی اس کی جگہ بھی ہو کر سوچو۔۔۔۔۔ کتنا پریشان ہوتا ہو گا وہ تمہاری ان حرکتوں سے۔۔۔۔۔" صائم نے برا مناتے ہوئے کہا۔

سحر اس کے شاویز کی حمایت کرنے پر تپ گئی۔ وہ اسے سنانے لگی تھی لیکن تب ہی پایا اور ماما کسی بزنس لہجے سے لوٹے۔ ان کو لاونج میں داخل ہوتے دیکھ کر سحر خاموشی اختیار کئے ہوئے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔



صائم اسائنمنٹ کا کچھ پوچھنے شاویز کے کمرے میں آیا تو وہ آہستہ آہستہ پیننگ کرنے لگا تھا۔

"کبھی جارہے ہو شاویز۔۔۔۔" صائم نے ہلکے آواز میں پوچھا۔

شاویز اپنے کپڑے بیگ میں رکھتے ہوئے مسکرایا۔

"بہت تنگ ہونا تم لوگ مجھ سے۔۔۔۔۔ سوچا۔۔۔۔۔ مزید تنگ نہ کروں۔۔۔" شاویز نے شرارتی انداز میں کہا۔

صائم کو سحر پر غصہ آنے لگا۔ اسی کے تنگ کرنے سے شاویز جا رہا تھا۔

"شٹاویز۔۔۔۔۔ سحر کی طرف سے میں معذرت خواہ ہوں۔۔۔۔۔ اس کی بچگانی حرکتوں پر مجھے خود افسوس ہو رہا ہے۔۔۔۔۔" صائم نے بے بسی سے سر جھٹکا۔

"تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔۔ اسے جو کرنا تھا کر لیا۔۔۔۔۔ وہ یہی تو چاہتی تھی۔۔۔۔۔ کہ میں تنگ ہو کر چلا جاؤں۔۔۔۔۔" شاویز نے سپاٹ انداز میں اپنا بیگ بند کیا اور صائم کے سامنے آیا۔

"Don't worry!۔۔۔۔ تمہارا اسائنمنٹ کروا کر جاؤں گا۔۔۔۔ لاؤ بتاؤ۔۔۔۔ کیا سمجھ

نہیں آرہا۔۔۔" شاویز نے اس کے ہاتھ سے بک پکڑا۔ صائم کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ اس نے بے

دلی سے جلدی جلدی اسائنمنٹ پورا کیا اور تیزی سے سحر کو آکر شاویز کے جانے سے اطلاع

دی۔

"اتنی آسانی سے کیسے جاسکتا ہے۔۔۔۔" سحر سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"اب جا کر اس سے سوری کرو۔۔۔۔۔ اسے گھر چھوڑ کر جانے سے روکو۔۔۔۔۔ نہیں تو پایا اور

ممدادونوں ناراض ہو جائے گے۔۔۔۔" صائم نے سیاٹ انداز میں کہا۔

"اس کے علاوہ بھی اسے روکنے کا میرے پاس طریقہ ہے۔۔۔۔۔" سحر نے سوچتے ہوئے

موبائل اٹھایا اور عارفہ کو کال کر کے اسے والدین سمیت اپنے گھر بلایا۔ عارفہ کے ابوجی اسلام آباد میں بر حال نوکری تھے اور چونکہ ان دنوں عارفہ کے ابوجی کراچی رہنے آئے ہوئے تھے تو سحر کو یہ موقع مناسب لگا تھا انہیں شاویز سے ملوانے کا۔

کال پر بات کر کے سحر کچن میں آئی اور ماما کو عارفہ اور اس کی فیملی کی آنے کی اطلاع دی۔
ساتھ ہی اس نے پایا کے سٹڈی روم جا کر انہیں بھی خبر دی اور ان کے آنے کی وجہ بھی بتائی۔

مما پاپا سے بات کر کے سحر پورچ میں آئی تو ٹھٹک گئی شادیز کی کار نہیں تھی۔ کہی وہ چلا تو نہیں گیا؛ سوچتے ہوئے سحر کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ تیزی سے اس کے کمرے میں آکر جھانکنے لگی۔

اس کا بیگ ابھی بھی پڑا تھا۔ سحر نے دل پر ہاتھ رکھ کر سکون کا سانس لیا۔ چلو بیگ یہی ہے۔
آجائے گا واپس؛ سوچتے ہوئے وہ باقی کی پلاننگ سرانجام دینے بڑھ گئی۔



شاویز کافی دنوں بعد اپنے فلیٹ آیا تھا۔ اپنے کپڑے وغیرہ تو وہ پہلے لیں گیا تھا۔ پر سیف میں
رکھی ماں کی تصاویر اور کچھ دفتری دستاویزات آج اٹھانے آیا تھا۔ جس مقصد کے لئے اس نے
فلیٹ کی چابیاں لی تھی۔ وہ پورا ہو گیا تھا۔ اب چابیاں واپس کرنے کا وقت تھا۔ اپنی بقیہ چیزیں
سمیٹ کر وہ ورکنگ ایریا میں آیا۔ نوٹس بورڈ پر باقی تصاویر اس نے پہلے ہٹادی تھی صرف پاپا
کی رہنے دی تھی۔ کچھ دیر خاموشی سے کھڑا وہ ان لمحوں کو یاد کرتا رہا اور پھر سر جھٹک کر وہ
تصویر بھی اتار دی اور اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال دی۔



"ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔ کہ تم سحر اور عارفہ کے کلاس میں تھے۔۔۔۔۔ اور تمہاری عارفہ سے اچھی دوستی تھی۔۔۔۔۔" مسکراتے ہوئے دلاور صاحب نے شاویز کا کندھا تھپتھپایا۔

شاویز کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے سنجیدہ انداز میں سحر اور عارفہ کو دیکھا۔ عارفہ بھی چھنپ سی گئی۔ جبکہ سحر سپاٹ تاثرات بنائے ہوئے تھی۔

"تو پھر ان کی۔۔۔۔۔ اور آپ دونوں کی دوستی کو۔۔۔۔۔ رشتہ داری میں بدل دیتے ہیں۔۔۔۔۔"

"سحر نے اعلانیہ صورت میں اٹھ کر پہلے دلاور صاحب کو پھر اصغر صاحب کو دیکھ کر کہا۔

عارفہ شاک سی ہو گئی اس نے گڑبڑا کر تیزی سے شاویز کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ابے تاثر تھا لیکن آنکھوں میں سختی در آئی تھی۔

"انکل۔۔۔ آپ کو شاویز کیسا لگا۔۔۔" سحر نے خوش دلی سے اصغر صاحب سے پوچھا۔

"بہت اچھا ہے۔۔۔ اس کے بارے میں تو میں دلاور صاحب سے پہلے بھی کئی دفعہ سن چکا ہوں۔۔۔۔" اصغر صاحب نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔

"مطلب آپ کو اس رشتے سے کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔۔۔" سحر کے پر امید انداز پر اصغر صاحب نے اپنی بیگم کو دیکھا اور ان کا اشارہ سمجھ کر نہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؛ کا جواب دیا۔

دلاور صاحب نے خوشی سے شاویز کو دیکھا لیکن اس کے سپاٹ تاثرات دیکھ کر ان کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

"شاویز تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو۔۔۔۔۔" انہوں نے نرمی سے اپنے بیٹے کی رضامندی چاہی۔

وہی دوسری جانب عارفہ سحر کو اپنے ساتھ ایک کونے میں لے گئی۔

"یہ کیا کر رہی ہو۔۔۔۔۔ سحر۔۔۔۔۔ رشتے کی پلاننگ کب ہوئی تھی۔۔۔۔۔" عارفہ نے متفکر انداز میں پوچھا۔

"تیری خواہش پوری کرنے کے لیے۔۔۔ مجھے تھینکس بعد میں کہہ دینا۔۔۔" سحر نے شرماتی ہوئی عارفہ کی کھا جانے والی نظر خود پر محسوس کی تو مسرور ہوتے ہوئے عارفہ کو چھیڑنے لگی۔

سب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے سحر شاویز کے پاس آئی۔

"ویسے مجھے اندازہ نہیں تھا۔۔۔ تم اتنی جلدی مان جاو گے big brother۔۔۔۔" سحر نے سامنے دیکھتے ہوئے ہلکے آواز میں کہا۔

"مجھے پتا تھا۔۔۔ میرے جانے کا سن کر۔۔۔ تمہاری آخری چال یہی ہوگی۔۔۔ اس لیے میں پہلے ہی مینٹلی تیار ہو کر آیا تھا۔۔۔" شاویز نے جتانے والے انداز میں آبرو اچکا کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"ویل۔۔۔۔۔ میرا کام تو ہو گیا۔۔۔۔۔ اب تم کہی بیچ کر نہیں جاسکتے۔۔۔۔۔" سحر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تھوڑا صبر رکھو little sister۔۔۔۔۔ ابھی میری باری رہتی ہے۔۔۔۔۔" شاویز نے شیر انداز میں کہا۔ اس کی آنکھیں مسلسل دلاور صاحب پر مرکوز تھیں جو اپنے بڑے بیٹے کا رشتہ ہو جانے پر بہت خوش نظر آرہے تھے۔

پاپا کی خوشی کے لیے تو اس کی جان بھی حاضر تھی شادی کرنا کونسا مشکل تھا؛ سوچ کر شاویز نے یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پہلے ہی عارفہ کا دل توڑ چکا تھا اب دوبارہ ناامید نہیں کرنا چاہتا تھا؛ سوچتے ہوئے وہ محفوظ ہوتے ہوئے عارفہ کو دیکھ رہا تھا جو ماما کے ساتھ کھلتی ہوئی مہو گفتگو تھی۔



خوشی کے موقع پر عارفہ اور اس کے والدین رات کے کھانے تک وہی ر کے رہیں۔ اس دوران دبئی میں مقیم عارفہ کے بڑے بھائی نے ویڈیو کال کر کے شاویز سمیت سب سے بات کی۔ سب کو مبارکباد پیش کی۔

کھانے کے بعد شاویز اپنے کمرے میں گیا۔ ایک بیگ کندھے پر ڈالا اور دوسرا ہینڈل سے پکڑ کر چلاتے ہوئے لاؤنج میں آیا تو سب حیران ہو گئے۔

"شاویز۔۔۔۔ مجھے صبح سحر نے تمہارے جانے کا بتایا تو مجھے یقین نہیں آیا۔۔۔۔ تبھی تو تمہیں اپنے پاس روکنے ہم نے تمہاری شادی کروانے کا سوچا۔۔۔۔ لیکن تم پھر بھی جارہے ہو۔۔۔۔" دلاور صاحب مضطرب ہو کر اس کے پاس آئے اور اس کا بازو تھام کر کہا۔

وہ دونوں باقیوں سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے لیکن لاؤنج میں موجود سب ہی کی نظریں ان دونوں پر مرکوز تھی۔ طاہرہ بیگم نے فکر مندی سے اصغر صاحب کا ہاتھ جھنجھوڑا۔ انہوں نے صبر کرنے کی تلقین کی۔

سحر اور عارفہ کے مابین پریشان کن نظروں کا تبادلہ ہوا۔

شاویز نے مستحکم بھرے انداز میں پایا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا رہا۔۔۔۔۔ جا ہی نہیں سکتا پایا۔۔۔۔۔ بس ایک وعدہ پورا کرنے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔" شاویز نے انہیں تسلی کرتے ہوئے کہا۔



لاؤنج میں اتنی خاموشی تھی کہ ان کے ہلکی آواز گفتگو بھی سب سن رہے تھے۔

شاویز نے پایا کے خدشات کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ پھیکا مسکرایا اور سر کو نفی میں ہلایا۔

"کوئی لڑکی کا معاملہ نہیں ہے پایا۔۔۔۔۔ آپ بے فکر رہیں۔۔۔۔۔ جن سے ملنے جا رہا

ہوں۔۔۔۔۔ وہ میرے سر پرست ہے۔۔۔۔۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں۔۔۔۔۔ ان کے بل

بوتے پر ہوں۔۔۔۔۔ میرے لیے میرے فرزند باپ ہے۔۔۔۔۔ کرنل صادق

صاحب۔۔۔۔۔" شاویز نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کرنل کا لفظ سن کر دلاور صاحب کے

آبرو و تعجب سے اٹھ گئے۔

"تم آرمی میں تھے۔۔۔۔۔" انہوں نے بے یقینی سے پوچھا

"میں سمجھ سکتا ہوں۔۔۔۔ اچھا پاپا۔۔۔۔ میں چلتا ہوں۔۔۔۔ دیر ہو جائے گی۔۔۔۔"

شاویز نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"ہاں چلو۔۔۔۔ میں تمہیں ایئر پورٹ تک چھوڑ آتا ہوں۔۔۔۔" دلاور صاحب اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے چلنے لگے لیکن شاویز وہی رکارہا۔ اس کے تاثرات سپاٹ ہو گئے۔

"اسی لیے میں آپ سب کو اپنے جانے کا نہیں بتا رہا تھا۔۔۔۔ مجھے آپ کا یہ تکلف کرنا اچھا نہیں لگتا پاپا۔۔۔۔ ڈرائیور چھوڑ آئے گا نا۔۔۔۔" شاویز برامان گیا۔

"اچھا چلو۔۔۔۔ آؤ سب سے مل کر جاو۔۔۔۔" دلاور صاحب نے اس کا موڈ بگڑتے دیکھا تو تیزی سے دفاعی انداز میں اسے سب کے جانب متوجہ کیا۔

وہ آگے آیا اور عارفہ کے والدین سے ملا ان سے رخصت لی۔ ان کے پیچھے کھڑی عارفہ پر ایک سرد نظر ڈال کر وہ ماما کے جانب بڑھا۔ ماما نے اسے ساتھ لگا کر پیار کیا اور اپنا خیال رکھنے کی ہدایت دی۔ صائم بھی اس سے گلے ملا اور میں تمہیں بہت مس کروں گا؛ کہہ کر اپنے جذبات ظاہر کئے۔ جب کہ سحر کسی بھی جذبات سے عاری دور سے خدا حافظ کہہ گئی۔

شاویز واپس مڑا اور پاپا سے دوبارہ گلے مل کر اپنے بیگز ملازم کو تھمائے۔ ملازم سے بات کرتے ہوئے اس نے خود کو دیکھتی عارفہ کو آنکھوں کے اشارے سے باہر آنے کا کہا۔ اور لاونج سے باہر نکل گیا۔

اس کے بلانے پر عارفہ چھنپ سی گئی پھر سب کو گفتگو میں مشغول ہوتے دیکھا تو خود معذرت کرتی باہر چلی گئی۔

"اوووا اچھا۔۔۔۔۔" شاویز نے جعلی خفگی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"سیریسلی۔۔۔۔۔ مجھے اس بات کا قطعی علم نہیں تھا۔۔۔۔۔ یہ ساری پلاننگ سحر نے اکیلے کی تھی۔۔۔۔۔" عارفہ کی آواز بھر آنے لگی۔ شاویز کے سخت تاثرات نرمی میں بدل گئے۔

"ہمممم۔۔۔۔۔ چلو مان لیا۔۔۔۔۔ اب رشتہ ہو گیا ہے تو۔۔۔۔۔ میرے نام کی قید مبارک ہو۔۔۔۔۔" شاویز نے سرد سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ عارفہ نے کوئی جواب نہیں دیا وہ اداس کھڑی رہی۔ شاویز اس کے پہلو سے گزر کر جانے لگا۔ دو قدم آگے بڑھ کر شاویز مسکرایا لیکن پھر واپس تاثرات سپاٹ بنا کر اٹھے قدم پیچھے آیا اور عارفہ کے آگے ہلکا سا جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"کچھ اور کہنا ہے۔۔۔۔" اس نے معصوم چہرہ بنا کر کہا۔

"افف یہ ہر بار میری دل کی بات کیسے سمجھ لیتا ہے۔۔۔" عارفہ نے بے چارگی سے دل میں سوچا۔

"تم واپس آو گے نا۔۔۔" اس نے متفکر انداز میں پوچھا۔

شاویز اب کی بار پورا مسکرایا۔ وہ سیدھا ہوا اور نرمی سے عارفہ کے رخسار پر ہاتھ رکھا۔

"انشاء اللہ ضرور آو گا۔۔۔۔" اس نے پیار سے کہا۔ عارفہ کو اس کی نظروں میں پیار، فکر، اپنائیت، کے ملے جلے تاثرات نظر آرہے تھے۔ اس نے ہلکے سے عارفہ کا گال تھپتھپایا اور جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔

عارفہ نے پیچھے مڑتے ہوئے اپنے گال پر شاویز کے ہاتھ کے جگہ پر ہاتھ رکھ کر اس کا لمس محسوس کیا۔ اس کے دل کی ساری کلفت مٹ گئی۔ اسے وہ یونیورسٹی والا شاویز لگا۔ اپنے آپ ہی عارفہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے دل میں شاویز کے لیے محبت پھر سے جوش مارنے لگی۔ جاتے جاتے بھی شاویز نے گیٹ سے نکلتے ہوئے ہاتھ ہوا میں لہرا کر بائے کہا اور باہر نکل گیا۔

عارفہ خوشی سے سرشار ہوتی اندر کو لپکی۔

لاؤنج میں امی اور ابو جی جانے کے لئے رخصت لیں رہے تھے۔ عارفہ سحر کے پاس آئی اور گلے مل کر ہلکی سرگوشی کی۔

صادق سر کی آنکھیں چمک اٹھی اور آگے آکر شاویز کو گلے سے لگایا۔

"شاویز۔۔۔۔۔ کیسا ہے۔۔۔۔۔ کتنے عرصہ بعد آئے ہو۔۔۔۔۔ اور اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہو۔۔۔۔۔ کیا ایجنسی والے خیال نہیں رکھتے۔۔۔۔۔ وقت پر تنخواہ نہیں ملتی۔۔۔۔۔" صادق صاحب نے اسے بازوؤں سے تھام رکھا تھا اور سر تا پیر اس کا جائزہ لے رہیں تھے۔

"یہ ایجنسی کی وجہ سے نہیں۔۔۔۔۔ گولی لگنے کی وجہ سے کمزور ہوا ہوں۔۔۔۔۔" شاویز نے دو انگلیاں سیدھی کر کے اور انگوٹھے کو موڑے گن کی شکل میں اپنے دائیں کندھے پر ہاتھ اور انگلیوں سے دستک دی۔

"ریلیکس۔۔۔۔ آرام سے صادی بھائی۔۔۔۔ میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔۔۔۔ گولی سے تو نہیں مرا۔۔۔۔ آپ کے غضب سے ضرور مر جاؤں گا۔۔۔۔" شاویز نے معصومیت سے آنکھیں جھپکاتے سینے پر ہاتھ رکھ کر خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی۔

صادق صاحب نے مارنے ہاتھ ہوا میں اٹھایا۔

"منہ توڑ دوں گا دوبارہ ایسی بات کی تو۔۔۔۔" انہوں نے دبے دبے غصے میں کہا اور اسے پھر سے گلے لگایا۔

شاویز نرمی سے مسکرایا اور 48 سالہ صادق سر کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"لیکن ہوا کیا تھا۔۔۔۔" صادق سر کی آواز میں افسردگی در آئی تھی۔

رات کے قریب دو بجے جب باقی سب اپنے بیڈرومز میں چلے گئے تب صادق صاحب اور شاویز پورچ کی سیڑھیوں پر پودوں کے سامنے اپنے مخصوص جگہ پر بیٹھے تھے۔ ان دنوں بلوچستان میں شدید سردی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"اوو فففففف۔۔۔۔۔ یہ کوئٹہ کی ٹھنڈ۔۔۔۔۔" شاویز نے ہاتھ میں ہوا پھونک کر آپس میں مسلے۔

صادق صاحب خوش دلی سے شاویز کو دیکھ رہے تھے۔

"کیا بات ہے۔۔۔۔۔ خوش لگ رہے ہو۔۔۔" صادق صاحب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

شادویز آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیئے۔ شام کے بہ نسبت نفیس حالت میں ان کی جانب مڑا۔

"مجھے میرے پاپا مل گئے ہیں۔۔۔۔ ان کی فیملی نے مجھے اپنا بھی لیا ہے۔۔۔۔ ان کی وائف بہت اچھی خاتون ہے۔۔۔۔ بلکل میرے ماں جیسی۔۔۔۔" خوش مزاجی سے شادویز نے شروع سے آخر تک صادق صاحب کو پاپا کے سچائی معلوم ہونے سے لے کر اپنے شوٹ ہونے تک سارا قصہ سنایا۔ وہ خوشی سے کھل اٹھے۔

"بہت بہت خوشی ہوئی۔۔۔۔ اللہ اپنے نیک بندوں کے ساتھ کبھی ناجائز نہیں کرتے۔۔۔۔۔ آخر تمہیں اپنے پاپا مل گئے۔۔۔۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"اب تو تمہارا دل تسلی ہو گیا ہو گا۔۔۔۔۔" ان کے پوچھنے پر شاویز نے جوش سے سر اثابت میں ہلایا۔

"تو کب ملو ارہے ہو اپنی فیملی سے۔۔۔۔۔" صادق سر نے مستحکم بھرے انداز میں کہا۔

"بہت جلد۔۔۔" شاویز نے جوشیلے انداز میں جواب دیا۔

"ویسے۔۔۔۔۔ میری ایک female سٹوڈنٹ ہے۔۔۔۔۔ بہت اچھی ہے۔۔۔۔۔ مجھے

تمہارے لیے بہت پسند آئی ہے۔۔۔۔۔ تم کہو تو تمہیں اس سے متعارف کرواتا

ہوں۔۔۔۔۔" صادق صاحب نے شرارتی انداز میں آبرو اچکا کر مسکراتے ہوئے اسے آنکھ

مار کر اشارہ کیا۔

"ہاہا۔۔۔۔۔ صادی بھائی۔۔۔۔۔ میری بات پکی ہو گئی ہے۔۔۔۔۔" شاویز نے محظوظ ہوتے ہوئے سر جھٹکا۔ پھر اپنے موبائل میں کل کی لی گئی عارفہ کے ساتھ کی تصاویر دکھائی۔

صادق صاحب پہلے تو خوش ہوئے اسے مبارکباد پیش کی پھر ان کے آبرو تن گئے۔

"اکیلے اکیلے شوٹ ہو گئے۔۔۔۔۔ اکیلے ہی فیملی بھی بنالی ہے۔۔۔۔۔ اکیلے بات بھی پکی کروالی ہے۔۔۔۔۔ تو اب میرے پاس کیوں آئے ہو۔۔۔۔۔" صادق صاحب برا مان گئے تھے۔

شاویز ہنستا ہوا ان کے قریب ہوا اور ان کے گرد بازو مائل کئے۔

"آپ کے ساتھ اپنی خوشیاں بانٹنے۔۔۔۔۔ آپ کے بغیر میری ہر خوشی ادھوری ہے۔۔۔۔۔"

شاویز جھلاتے ہوئے انہیں منانے لگا۔ صادق صاحب مسکرا دیئے۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔۔۔" صادق صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی۔

شاویز نے دعا تسلیم کرتے ہوئے اپنے جیب سے فلیٹ کی چابی نکالی۔

"آپ کی امانت بھائی۔۔۔" اس نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے چابی ان کو پیش کی۔

صادق صاحب سپاٹ انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

"اسے تم اپنی بات پکی کا تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔۔۔ اب سے وہ فلیٹ تمہارا۔۔۔" صادق

صاحب اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔

"میں اپنے اسی ایجنٹ کی نوکری سے مطمئن ہوں۔۔۔۔۔ فوج کے نوجوان تو روبہ رو آنے والے دشمنوں کو ختم کرتے ہیں۔۔۔۔۔ پر میں تو ملک میں ہی چپے غداروں کو پکڑواتا ہوں۔۔۔۔۔ آپ کا اور میرا مقصد تو وطن کی حفاظت کرنا ہی ہے نا۔۔۔۔۔ وہ تو اس جاب سے بھی میں اچھی طرح سرانجام دے رہا ہوں۔۔۔۔۔ فلحال اسی پیشے سے منسلک رہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔" شاویز نے صادق سر کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

صادق صاحب نے شاویز کی پسند کا احترام کرتے ہوئے مزید بحث نہیں کی۔ رات گہری ہونے لگی تو وہ دونوں شب بخیر کہتے سونے کے لیے چلے گئے۔



ایک ہفتے تک شاویز وہی رہا۔ صادق صاحب کے پروموشن پارٹی میں بہت سے پرانے چہرے نظر آئے۔ اس کے کئی کولیگ نے اس پارٹی میں شرکت کی تھی۔ کبیر اب کافی سدھر گیا تھا۔ اس کی آرمی میں سلیکشن بھی ہو گئی تھی اور وہ میجر کے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔



واپسی پر شاویز کراچی پہنچ کر سب سے پہلے بلال حمید کے گھر گیا۔

ملازم نے اسے درانگ روم میں بیٹھایا۔ شاویز تیز نظروں سے آس پاس دیکھنے لگا تھا جب بلال صاحب اندر آتے دیکھائی دیئے۔

ان کے درانگ روم میں داخل ہوتے ہی شاویز معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"میرا پورا نام ہے۔۔۔۔۔ مسٹر۔۔۔۔۔ شاویز دلاور خان۔۔۔۔۔" اپنے نام کی تصحیح کراتے

ہوئے شاویز کی آواز ڈٹ گئی تھی۔ آنکھوں میں سختی در آئی تھی۔

بلال حمید اس کی کھا جانے والی نظر دیکھ کر گھبرا گئے۔

"تم جانتے تھے نا۔۔۔۔۔ تم اچھے سے جانتے تھے دلاور پرویز خان میرے والد ہے۔۔۔۔۔"

پھر بھی چار سال پہلے جب میں تم سے پوچھنے آیا تھا۔۔۔۔۔ تم نے مجھے سچائی نہیں بتائی۔۔۔۔۔

تم نے مجھے گمراہ ہی رہنے دیا۔۔۔۔۔ بلکہ تم نے مجھے مزید بھڑکا دیا۔۔۔۔۔ تم نے مجھے

میرے ہی باپ کا دشمن بنا دیا۔۔۔۔۔" شاویز کا طیش زور پکڑنے لگا۔ بلال صاحب گڑبڑا گئے۔

"میری۔۔۔۔۔ میری بات۔۔۔۔۔ سسس۔۔۔۔۔ سنو۔۔۔۔۔ i can explain۔۔۔۔۔"

بلال صاحب نے متذبذب ہو کر وضاحت دینا چاہی۔

"explan what!---- ہااااا۔۔۔" شاویز بھیڑے کے مانند اس پر جھڑپ پڑا اور بلال حمید کے کوٹ کا کالر دبوچ لیا۔ وہ سہم سے گئے۔

"کیا explain کرو گے تم۔۔۔۔۔ کیسے میرے باپ کو غلط مخبری کی۔۔۔۔۔ کیسے میری ماں کو (molest ایذا رسانی) کرنا چاہا۔۔۔۔۔ کیسے ان دونوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔۔۔۔۔ ہااااا بولو۔۔۔۔۔ کیسے انہیں الگ کر دیا۔۔۔۔۔ کیا کیا explain کرو گے تم۔۔۔۔۔" اس نے حلق کے بل چلا کر کہا۔

اس کے غرانے سے بلال صاحب کے ملازم اور چوکیدار وہاں بھاگ کر آئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر شاویز کو بلال صاحب سے دور کرنا چاہا پر شاویز اپنے پورے تاب سے بلال حمید پر برس رہا تھا۔

اس نے بازو پورے زور سے پرے جھڑکے تو چوکیدار اور ملازم لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑے۔

"یہ میرے پاپا سے دوستی میں فریب کرنے کے لیے۔۔۔" شاویز نے مٹھی بند کر کے ایک زوردار ضرب بلال حمید کو رسید کیا۔ وہ لھڑکرا گیا۔

"یہ میری ماں کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کرنے کے لیے۔۔۔۔۔" دوسرا ضرب لگا تو بلال فرش پر گر پڑے۔ چوکیدار اور ملازم نے کراہتے ہوئے شاویز کو پکڑا لیکن شاویز کسی کی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے لاتے گھوسے مار کر انہیں پھر سے پیچھے کیا۔ اتنے میں بلال صاحب خود کو سنبھالتے ہوئے ڈرائنگ روم سے باہر نکلے اور گرتے پڑتے لاؤنج میں آ گئے۔ شاویز ان کے پیچھے وہاں آیا۔ انہیں کندھے سے پکڑ کر ان کا رخ اپنے جانب کیا اور ان کے منہ پر ایک اور ضرب دے مارا۔ بلال حمید کے ناک سے خون رسنے لگا تھا۔

"اور یہ میرے جذبات سے کھیلنے کے لیے۔۔۔۔۔ میرے ہاتھوں میرے پاپا کو تکلیف پہنچانے کے لیے۔۔۔۔۔" بلال صاحب کی ناک سے خون رسنے لگا وہ فرش پر گر پڑے تھے۔ لاؤنج میں برپا شور سے بلال صاحب کے بوڑھے والدین اور بیوی بچے ہڑبڑا کر کمروں سے باہر آگئے۔ بلال صاحب کے والدین اور فیملی کو دیکھ کر شاوینز انہیں مارنا رک گیا۔

"آئندہ میرے پاپا یا ان کی فیملی کو کسی بھی ذریعے سے نقصان پہنچانے کا سوچا بھی۔۔۔۔۔ تو کلمہ پڑھ کر رکھنا۔۔۔۔۔ کیونکہ اگلی دفعہ میں ملا۔۔۔۔۔ تو موقع نہیں ملے گا۔۔۔۔۔ وہ حال کر دوں گا کہ تمہاری روح بھی کانپ جائے گی۔۔۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔۔۔۔۔

زرتاج اور دلاور کے شاہ سوار کا وعدہ۔۔۔۔۔" شاوینز نے موت کے فرشتہ کی طرح انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتے ہوئے دھمکایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا روانہ ہو گیا۔ بلال صاحب بچوں کی مدد سے

اٹھ بیٹھے اور ہانپتے ہوئے اس سپہ سالار بہادر نوجوان کو جاتے دیکھنے لگے۔ ان کا بیٹا طیش میں آکر شاویز کی جانب جانے لگا لیکن بلال صاحب نے روک لیا۔

"جانے دو۔۔۔۔۔ اس کے سر پر خون سوار ہے۔۔۔۔۔ جانے دو اسے۔۔۔۔۔" انہوں نے کراہتے ہوئے کہا اور بیٹے کے سہارے سے کمرے میں جانے لگے۔



شادی کے دن قریب آتے ہی دلاور صاحب کے گھرتیا ریاں بھی عروج پر تھیں۔ سحر نے بڑھ چڑھ کر شادی کے انتظامات میں حصہ لیا۔ وہ روز عارفہ کے ساتھ شاپنگ پر جاتی۔ کارڈ کے ڈیزائن سے لے کر شادی ہال کی سجاوٹ تک سب اس نے خود پسند کیا تھا۔

ایک دن سب لاؤنج میں بیٹھے شاپنگ کر تبصرہ کر رہے تھے جب شاوینز کچھ کاغذات لے کر اندر داخل ہوا اور پاپا کے ساتھ صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ تب ہی چوکیدار اور ملازم کوئی بڑا سا پیکنگ اندر کر رہے تھے۔ عابدہ بیگم سحر اور صائمہ تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

شاویز نے صائم کے آگے وہ دستاویزات کئے۔

"یہ کیا ہے۔۔۔" صائم نے تعجب سے باہر دیکھا۔ پایا بھی اسی جانب متوجہ تھے۔ ماما اور سحر شاینگ سمیٹنے میں لگ گئی تھی۔

"پہلے یہ پیپر سائن کرو۔۔۔۔۔ پھر جا کر خود دیکھ لینا۔۔۔۔۔" شاویز نے صائم کو مخاطب کیا تو وہ تیزی سے سائن کر کے اٹھا اور پورچ میں بھاگا۔

اس کے پیچھے دلاور صاحب بھی اٹھ کر لاؤنج کے دورازے تک آئے۔

صائم نے پلاسٹک کی پیکنگ کھولی تو اس کی آنکھیں چندیا گئی۔ وہ نت نئی سپورٹس بانک تھی۔ جدید ماڈل کی بانک دیکھ کر صائم چہک اٹھا۔ خوشی سے ہر زاویے سے بانک کا جائزہ لینے لگا۔

"شاویز۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے شاویز کو اپنے ساتھ کھڑے ہوتے پا کر اسے مخاطب کیا۔

"یس پاپا۔۔۔۔۔" پاپا اور شاویز دونوں ہی صائم کو دیکھ رہے تھے۔

"کونسا بینک لوٹا ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ تمہاری جتنی بھی انکم ہو۔۔۔۔۔ یا جتنی بھی بچت کر رکھی ہو۔۔۔۔۔ اتنی تو بالکل نہیں ہو سکتی کہ تم یہ بزنس فورڈ کر سکو۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے اپنی نظریں شاویز پر جمالی تاکہ وہ کوئی کہانی نہ سنا سکے۔

شاویز پاپا کو خود کو گھور تاپا کر متذبذب ہو کر ان کی جانب مڑا۔

"مطلب آپ سچ سننا چاہتے ہیں۔۔۔" شاویز نے تصدیق چاہی تو پاپا نے اسی انداز میں سر اثبات میں ہلایا۔

"میں نے صادق سر کا گفٹ کردہ فلیٹ بھیج دیا۔" شاویز نے معصومیت سے بال کھجاتے ہوئے کہا۔

اسی اثناء میں صائم تیزی سے آکر شاویز کے گلے لگ گیا۔

"تھینکیو۔۔۔۔۔ تھینکیو سوچ شاویز بھائی۔۔۔۔۔" اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ پھر پاپا کو دیکھا جو بے تاثر تھے۔ صائم کو اپنی ندامت کا احساس ہوا تو تاثرات سنجیدہ بنائے۔

"شاویز بھائی۔۔۔۔۔ میں اتنا مہنگا گفٹ نہیں لے سکتا۔۔۔۔۔ آپ سے۔۔۔۔۔" صائم پھیکی مسکراہٹ بنائے وضاحت دینے لگا تھا پر شاویز نے روک لیا۔

"صائم۔۔۔۔۔ اسے میری طرف سے تمہارا ایکسیڈنٹ کروانے کا۔۔۔۔۔ تمہاری بابت توڑنے کا مدافع سمجھ کر رکھ لو۔۔۔۔۔ پاپا کو میں سنبھالتا ہوں۔۔۔۔۔ تم جا کر نیو بابتک پر گھوم کر

آو۔۔۔"شاویز نے خوشگوار مزاجی سے چابی اسے تھمائی اور پلکیں جھپکا کر حوصلہ افزائی کی۔ وہ پھر سے مسکراتا ہوا اس کی ہاتھ سے چابی لے کر بانک پر جا بیٹھا۔

"شاویز۔۔۔۔۔ فلیٹ کس کو sale کیا ہے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے مضبوط اعصابی سے پوچھا۔

"اُمم مُمم، مُمم مُمم۔۔۔۔۔ پاپا۔۔۔۔۔ ریلکس۔۔۔۔۔ جانے دیں" شاویز نے لا پرواہی سے سر جھٹکا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دلاور صاحب وہی کھڑے پر سوچ انداز میں اسے جاتے دیکھتے رہے پھر موبائل نکال کر ایک کال ملائی۔



خوشی کا وہ سماء آن پہنچا تھا۔ بڑے بڑے نامور شخصیات شاویز کی شادی میں مدعو کیے گئے تھے۔ شہر کے سب سے اعلیٰ شان ہال میں اس کی شادی کی تقریب منعقد کی گئی تھی۔

شاویز کی شادی میں شریک ہونے صادق صاحب اور ان کی فیملی بھی خاص طور پر آئی ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ ریحان سر اور اس کے بہت سے اکیڈمی کے کولیگ نے اپنی شرکت سے محفل کی زینت بڑھائی۔

پس منظر میں دل نشین میوزک کے موجودگی نے شام کو اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ اور اس میں چارچاند تب لگا جب عارفہ دلہن بنی اسٹیج کی جانب آنے لگی جہاں شاویز بلیک کلر کی شیروانی زیب تن کئے مسکراتے ہوئے اسے آتے دیکھ رہا تھا۔

سحر عارفہ کی سہیلی کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ اس کے لہنگے کا دامن صحیح کرتے ہوئے چل رہی تھی۔ جامنی رنگ کا فراک پہنے ہوئے لمبے بال کھلے چھوڑے ہلکا میک اپ کے نفیس سی ڈائمنڈ جیولری پہنے سحر اتنی حسین لگ رہی تھی کہ ایک پل کے لیے مہمانوں کے بیچ موجود جاوید کی بھی نظر اس پر آکر رک گئی تھی۔

اسٹیج تک آتے ہوئے عارفہ کی امی کی آنکھیں بھر آگئی تھیں۔ اپنی بیٹی کو دلہن بنی دیکھ کر ان سے جذبات قابو نہیں ہو پارہے تھے۔ عارفہ کے بھائی بھابی بھی اس محفل کی رونق بننے آئے ہوئے تھے۔

"یہ زرتاج کا ہے۔۔۔۔۔ اسے دلاور نے منہ دکھائی میں دیا تھا۔۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے چھوٹی سی ڈبی سے ایک سونے کی چین نکال کر عارفہ کے آگے کیا۔ وہ چین دیکھ کر دلاور صاحب کو ماضی کے بہت سے لمحات یاد آگئے تھے۔ وہ لب میٹھے افسردگی سے مسکرائے۔

"اپنے آخری وقت پر اس نے مجھے دیا اور کہا۔۔۔۔۔ میں اسے بھیج دوں۔۔۔۔۔ اور اس رقم سے شاویز کی کفالت کروں۔۔۔۔۔ لیکن مجھ سے یہ بھیجا نہیں گیا۔۔۔۔۔ میں نے آج تک اسے اپنے پاس سنبھال کر رکھا تھا۔۔۔۔۔ سو چاہب شاویز کی شادی ہوگی۔۔۔۔۔ تو اس کی ماں کے نشانی کے طور پر اس کی بیوی کو بطور تحفہ دے دوں گی۔۔۔۔۔" زبیدہ خالہ نے کہتے ساتھ ہی وہ چین عارفہ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

عارفہ کی آنکھیں آبدیدہ ہونے لگی۔ اس نے لب کاٹتے ہوئے رخ موڑ کر ساتھ کھڑے شاویرز کو دیکھا۔ وہ سیاٹ تاثرات بنائے سامنے دیکھ رہا تھا۔

"شاویز اوپر سے جتنا سخت لگتا ہے۔۔۔۔۔ اندر سے اتنا ہی نرم ہے۔۔۔۔۔ بہت بااخلاص بچہ ہے۔۔۔۔۔ اسے ہمیشہ خوش رکھنا۔۔۔۔۔" ایک مرتبہ پھر عارفہ کو پیار کر کے خالہ آگے بڑھ گئی۔

سب سے آخر میں دلاور صاحب ان کے پاس آئے اور شاویز کے ہاتھ میں ایک عدد چابی رکھی۔ شاویز نے حیرت سے اس چابی کو دیکھا اور پھر شریر انداز میں آبرو اچکا کر جتانے والے انداز میں مسکراتے ہوئے پایا کو۔

"پاپا۔۔۔۔۔" شاویز نے تنے ہوئے اعصاب سے مخاطب کیا۔

"یس بیٹا۔۔۔" دلاور صاحب اس کے ساتھ آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

"آپ کو کیسے پتا چلا۔۔۔ میں نے فلیٹ کس کو بھیجا ہے۔۔۔" شاویز نے جعلی خفگی سے کہا۔ وہ چابی اسی فلیٹ کی تھی جو صادق صاحب نے اسے گفٹ کیا تھا اور جسے شاویز نے صائم کو بانک دلانے کی خاطر بھیج دیا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے۔۔۔ یہ آرمی ایجنٹ والا دماغ تمہیں کہاں سے ملا ہے ہمممم۔۔۔" دلاور صاحب نے گردن اکھڑا کر کہا۔ شاویز خاموش نظروں سے انہیں دیکھے گیا۔

"اب اس تحفے میں صادق صاحب کے شفقت کے ساتھ ساتھ میرا پیار بھی شامل ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔۔۔" دلاور صاحب نے قدرے سختی سے تنبیہ کیا تو شاویز

Visit For More Novels : www.urduovelbank.com Page 780
E-mail pdfnovelbank@gmail.com WhatsApp [03061756508](https://wa.me/03061756508)

"کیا بات ہے میڈم۔۔۔۔ بڑی دلہن بنی بیٹھی ہو۔۔۔۔" سحر نے عارفہ کو چھیڑتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ عارفہ کے سودفعہ پوچھنے پر بھی اس نے نہیں بتایا بس اپنے ساتھ پردے کے پیچے ساکت کھڑا کیا۔

شاویز جب صائم اور جاوید کے چھیڑنے سے تنگ ہو کر بچتے بچاتے کمرے کے اندر داخل ہوا تو اسے بیڈ خالی ملا۔ اس نے قریب آکر بیڈ کا جائزہ لیا تو وہ بالکل بنا ہوا تھا جیسے کوئی بیٹھا ہی نہ ہو۔ عارفہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے واشروم کے دروازے پر دستک دی۔ تب ہی اسے پردے کے پیچے کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ وہ اپنے ایجنٹ کے سے انداز میں محتاط چلتا ہوا قریب گیا اور ایک جھٹکے سے پردا ہٹایا۔ پردا ہٹانے کے ساتھ ہی سحر نے بھو و و کر کے اس پر حملہ کیا۔ شاویز ڈراتا تو نہیں لیکن اچانک حملے سے قدرے پیچے ہو گیا۔ سحر اور عارفہ محض ہنسے جا رہی تھی۔ شاویز نے تند تاثرات بنا کر عارفہ کی کلائی دبوچ لی تو وہ سہم گئی۔ سحر اپنی ہنسی پر قابو

کرتے ہوئے خود کو ان میاں بیوی سے انجان دکھاتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ شاویز نے اسی طرح ہاتھ پکڑے عارفہ کو اپنے قریب کیا۔ اس کی سانس رکنے لگی دھڑکن تیز ہو گئی۔ پھر شاویز نے اپنا چہرہ اس پر جھکا دیا۔ عارفہ نے سانس روکے شرماتے ہوئے آنکھیں بند کی لیکن تب ہی اسے اپنے ہاتھ پر شاویز کی گرفت آزاد ہوتی محسوس ہوئی وہ واپس پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے گڑبڑا کر آنکھیں کھولی۔

"شاویز۔۔۔۔۔" عارفہ نے شاک کے عالم میں اسے پکارا۔

"ہو گیا مزاق۔۔۔۔۔ مل گیا سکون۔۔۔" شاویز نے اپنی شیر وانی کے بٹن کھولتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

"لیکن شاویز۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ سحر۔۔۔۔۔" عارفہ نے آگے آتے ہوئے

وضاحت دینا چاہی لیکن شاویز نے ٹوک دیا۔

"وہی رہو۔۔۔۔۔" شاویز نے تندہی سے کہا تو عارفہ مضطرب سی ہو کر وہی رک گئی۔ اس کا دل

ڈگمگا رہا تھا۔ اسے شدت سے رونا آرہا تھا۔

شاویز نے شیروانی اتاری۔ بیڈ پر اپنے حصہ سے پھول کی پتیاں جھاڑ کر اسی طرح برہنہ باڈی

لیئے چت لیٹ گیا۔ اور آنکھوں پر بازو رکھ دیا۔

"شاویز۔۔۔۔۔" عارفہ نے اب کی بار معصومیت سے پکارا۔

"مجھے سونا ہے۔۔۔۔۔ ڈسٹرب مت کرو۔۔۔۔۔" جواب اب بھی کرہٹ بھرا ملا۔ عارفہ مایوسی سے آنکھوں پر بازو رکھے شاویز کو دیکھتے ہوئے دل گرفتگی سے وہی بیٹھ گئی۔



رات کے آخری پہر شاویز کی آنکھیں کسی کی سسکیوں سے کھلی۔ عنودگی کے حالت میں آنکھیں مسلتے ہوئے اس نے دیکھا تو وہ کروٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سامنے بیڈ کا حصہ ابھی بھی خالی تھا۔ وہ یک دم سیدھا ہوا۔

"میں سچ میں سو گیا تھا۔۔۔" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے سوچا۔ وہ صرف عارفہ کو تنگ کرنے کے ارادے سے لیٹا تھا لیکن اس کی سچ میں آنکھ لگ گئی تھی۔ شاویز اٹھ کر بیٹھا اس نے دیکھا عارفہ وہی کھڑکی کے پاس فرش پر گھٹنوں کے گرد بازو مائل کئے ہوئے اسی دلہن کے لباس میں ابھی تک بیٹھی تھی۔ گھنٹوں میں سر چھپائے بار بار گیلی سانس اندر کھینچ کر وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ شاویز اٹھ کر آیا اور اس کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھا۔ پھر عارفہ کے ہاتھ پر تھپتھپایا۔ عارفہ نے سر اٹھا کر بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا تو شاویز دل دہل گیا۔

"کیا ہوا۔۔۔۔۔ ایسے روکیوں رہی ہو۔۔۔۔۔" شاویز نے ہر حد کو شش کرتے اپنے تاثرات
سنجیدہ رکھے۔

"شادی کی رات ہی جو شوہر۔۔۔ اپنی بیوی کو دتکار دے۔۔۔ وہ روئے نہیں تو اور کیا کریں۔۔۔" عارفہ نے منہ بھسورتے ہوئے کہا۔

Visit For More Novels : www.urduovelbank.com Page 786
E-mail pdfnovelbank@gmail.com WhatsApp [03061756508](https://wa.me/03061756508)

آواز میں کہا۔ اس کا دل بھر اگیا تھا۔

شاویز خاموشی سے اسے سننا گیا۔

"میں سو گیا تھا۔۔۔۔۔ تو تم بھی آکر سو جاتی۔۔۔۔۔" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"خود ہی تو یہی رہنے کا کہا تھا۔۔۔" عارفہ نے بے رخی سے جواب دیا

"اچھا۔۔۔ اتنی تابیدار ہو میری۔۔۔" شاویز نے محظوظ ہوتے ہوئے آبرو اچکائے۔

عارفہ بالکل مذاق کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے تنے آبرو سے شاویز کو گھورا تو وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔

"اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔سوری۔۔۔ابھی آکر سو جاو۔۔۔باقی کا غصہ صبح کر لینا۔۔۔"

شاویز نے معصومیت سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے التجائی انداز میں دیکھتے ہوئے کھڑا کیا۔ عارفہ اسی لہنگے کے ساتھ ہی آکر لیٹ گئی۔ وہ اتنا تھک گئی تھی کہ سر تکیے پر رکھتے ہی اسے نیند نے جکڑ لیا اور وہ سو گئی۔

شاویز تب تک ڈریسنگ روم میں جا کر ٹی شرٹ اور ٹراؤزر پہن کر واپس آیا۔ عارفہ کو سویا ہوا پاپا کو وہ بغیر آواز کئے بیڈ پر نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔ شاویز رات کی تاریکی میں صرف نائٹ لیمپ کے روشنی میں عارفہ کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"ٹھیک تو کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔ میں ہر مرتبہ بے وجہ اسے رلا دیتا ہوں۔۔۔" شاویز نے دل ہی دل اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

شاویز پچھتاوے میں ڈوب گیا۔ اس کا دل کیا وہ عارفہ کو اپنی بانہوں میں لے لیں لیکن ساری رات رلانے کے بعد وہ اب اس کے سکون میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر اسی طرح اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اپنے جذبات قابو کر تا بیڈ سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا کمرے سے باہر نکل آیا۔

ایک گھنٹے تک گھر کے لان میں ورزش کر کے وہ فجر کی اذانوں کے ساتھ واپس کمرے میں آیا۔ واشروم جا کر وضو کیا اور نماز ادا کرنے کھڑا ہو گیا۔ نماز ادا کر کے دعا میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس کے دل میں عجیب تسکین تھا۔ وہ اپنے موجودہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے لگا۔ اگر شاویز سے

اس کی ماں چھین گئی تھی۔ اس کا بچپن مشکل میں رہا تھا۔ پھر اب اسے اتنا چاہنے والے پایا ماما
 بھائی بہن حتیٰ کہ بیوی جیسے رشتے مل گئے تھے۔ وہ کافی دیر اسی انداز میں بیٹھا اللہ کے حضور
 مشکور ہوتا رہا پھر آکر بیڈ پر لیٹ گیا۔ عارفہ اب بھی عوض سو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے
 شاویز کب سو گیا تھا اسے پتہ نہ چلا۔



اگلادن معمول کا شروع ہوا۔ گھر میں ولیمے کے فنکشن کی تیاریاں جاری تھیں۔ جس وقت شاویز
 فریش ہو کر کمرے سے باہر آیا دن پورا چڑھ چکا تھا۔ عارفہ تیار ہونے سحر کے ساتھ پالر جا چکی
 تھی۔ عابدہ بیگم نے مصروف انداز میں شاویز کو ناشتے کے ٹیبل کر مطلع کیا اور ساتھ ہی اسے
 آج کے فنکشن میں پہنے جانے والا تھری پیس سوٹ دیا۔



ولیمے کا فنکشن بھی اسی شان و شوکت سے منایا گیا۔ اس تقریب میں عارفہ نے سلور کلر کا گاؤن پہنا تھا اور شاویز نے رائل بلیو کلر کا تھری پیس سوٹ۔ دونوں دلہاد لہن حسین شخصیت کے ساتھ محفل میں چار چاند لگا رہے تھے۔

جب تقریب اپنے اختتام کو پہنچا اور مہمان چلے گئے صرف فیملی کے افراد جانا باقی رہ گئے تھے جس میں اس کی فیملی، عارفہ کی فیملی، اور جاوید کی فیملی شامل تھی؛ شاویز میدان میں اتر اور اعلانیہ صورت میں ہاتھ اٹھائے۔

"ویل۔۔۔۔۔ فیمیلز۔۔۔۔۔ ایک چھوٹا سا celebration میری طرف سے باقی

ہے۔۔۔۔۔"شاویز نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ سب تعجبی انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شاویز نے دو انگلیاں ہونٹوں میں دبا کر زوردار سیٹی ماری تو دو ویٹر ایک بڑے سے ٹرائی پر چار منزلہ کیک ہال کے اندر لا رہے تھے۔ کیک برف جیسا سفید تھا اور اس پر سرخ رنگ کے گلاب کے مانند پھول بنائے گئے تھے۔ کیک دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ شاویز آگے ہوا اور ٹرائی کا ہینڈل پکڑ کر اسے سحر کے آگے کیا۔ سحر نے آبرو اٹھائے ہوئے اسے دیکھا۔

"Happy birthday سحر۔۔۔۔۔" شاویز نے خوش دلی سے سحر کو سا لگرہ کی مبارکباد کہی۔

سب ایک ساتھ چہک گئے۔

"اوووہااa

"شاویز کی شادی کے مصروفیت میں تو تمہاری سا لگرہ یاد ہی نہیں رہی تھی۔۔۔" دلا اور صاحب نے مدافعتی انداز میں کہا اور سحر کے پاس آئے اسے سینے سے لگا کر دعائیں دی۔

"سا لگرہ بہت مبارک ہو میری princess۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ تمہیں صحت اور خوشیوں بھری لمبی زندگی دے۔۔۔" انہوں نے دعادی پھر عابدہ بیگم نے بھی اسے خود سے لگایا۔

"چلو چلو۔۔۔۔۔ ایک کاٹتے ہیں۔۔۔" صائم نے خوشی خوشی کہتے ہوئے ٹرائی پر رکھی

چھری اٹھائی اور سحر کا ہاتھ تھاما۔

سحر اور صائم میں ایک سال کا فرق تھا۔ وہ دونوں ہمیشہ اپنی سالگرہ ساتھ مناتے اور اسی انداز میں ساتھ ہی کیک کاٹتے۔

سب کیک کے گرد کھڑے ہو گئے تھے اور تالیاں بجا کر سالگرہ کی گیت گاتے ہوئے سحر کے کیک کاٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

سحر نے صائم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا لیکن کیک کاٹتے ہوئے ایک احساس کی وجہ سے وہ رک گئی۔ سب اس کے حرکات دیکھتے ہوئے گیت گانا بھی رک گئے۔ سحر پہلے سپاٹ تاثرات بنائے ہوئے چند قدم پیچے کھڑے شاویز کے پاس آئی کچھ لمحے تندہی سے اسے گھورنے کے بعد مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور ساتھ لیے واپس کیک تک آئی۔ اب اس کے ایک طرف صائم تھا اور دوسری جانب شاویز۔ تینوں نے ایک ساتھ مل کر کیک کاٹا۔ دلاور صاحب کی

تالیوں کی گونج سب سے نمایاں تھی۔ سحر کے دل میں شاویز کے لیے بنتی جگہ دیکھ کر انہیں سب سے زیادہ خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

کیک کا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑے باری باری سب کو کیک کھلاتے ہوئے اور مبارکباد وصول کرتے ہوئے چلتے چلتے سحر جب جاوید کے سامنے آئی تو چھنپ سی گئی۔

سب کی موجودگی سے متذبذب ہوتے ہوئے جاوید نے سحر کے ہاتھ سے کیک کھایا اور سنجیدہ انداز میں سالگرہ کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

سحر کی چھوٹی سی سالگرہ منا کر سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔



شاویز کمرے میں آیا تو عارفہ پہلے ہی چیخ کر کے بال کھولے میک اپ دھوئے بیڈ پر بیٹھی اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ ایک جھوٹی نظر شاویز پر ڈال کر وہ پھر سے اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے شاویز سمجھ گیا وہ ابھی تک غصہ ہے۔ اپنی مسکراہٹ دبائے ہوئے شاویز نارمل انداز میں ڈریسنگ روم میں گیا اور چیخ کر کے نائٹ دریس پہن لیا۔

عارفہ نے اپنے کپڑے اور جیولری الماری میں رکھ کر پلابند کیا تو شاویز ہاتھ باندھے دوسرے حصے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ عارفہ پھر سے اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگی تھی پر شاویز نے جھٹ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ناراض ہو۔۔۔" شاویز نے معصومیت سے آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے پوچھا۔

دیا

شاویز نے مسکراتے ہوئے عارفہ کے کمر کے گرد بازو مائل کر دیئے۔ عارفہ کسمپاسی گئی۔ اسے شاویز سے اس محبت بھرے انداز کی امید نہیں تھی۔

"بہت پیار کرتی ہو مجھ سے۔۔۔۔" شتاویز نے اس کے کندھے پر چہرہ ٹکا کر نرمی سے پوچھا۔

عارفہ کا غصہ مانویانی کی مانند بہہ گیا تھا۔ اس نے شاویز کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ لیئے تھے۔

"میں تو کرتی ہوں۔۔۔۔ پر تم نہیں کرتے نا۔۔۔" عارفہ نے ناامید ہوتے ہوئے کہا۔

اس کا جواب سن کر شادویز نے اپنا چہرہ اٹھایا پھر اسی طرح کمر سے ہی گھما کر عارفہ کا رخ اپنے جانب کیا۔

"ابھی تک کا تو نہیں پتا۔۔۔۔۔ لیکن اب تمہارے علاوہ کسی اور سے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔۔۔۔۔" کہتے ساتھ شاویز پیار سے عارفہ کو دیکھتے ہوئے اس کی لبوں پر جھک گیا۔ عارفہ کے جسم میں کرنٹ سادوڑ گیا۔ اس نے آنکھیں مینچھ لی اور شاویز کی شرٹ مٹھی میں جکڑ لیا۔ کچھ دیر بعد شاویز کے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے الگ ہوئے تو عارفہ کی سانس چڑھ گئی تھی۔ وہ شرم سے سرخ پڑنے لگی۔ اس نے خود کو شاویز کی بازوؤں سے آزاد کرنا چاہا پر شاویز کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

"کیا ہوا مسنز شاویز۔۔۔۔۔ کل میں چھوڑ کر سو گیا تھا تو غصہ آ گیا تھا۔۔۔۔۔ اور اب خود ہٹ رہی ہو۔۔۔۔۔" شاویز نے محظوظ ہوتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

عارفہ کے پاس شاویز کی دل فریب باتوں کا جواب نہیں تھا وہ شرماتے ہوئے نظریں جھکا گئی
 لیکن آج شاویز پر اس کے شرمانے کا کوئی اثر نہیں ہونا تھا۔ اس نے جھک کر عارفہ کو بانہوں
 میں اٹھالیا۔ عارفہ نے اس کے گردن کے گرد بازو مائل کر دیئے۔ اس کے ہونٹوں پر
 مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ شاویز اسی انداز میں اسے اٹھائے ہوئے بیڈ تک آیا اور آرام سے پہلے
 عارفہ کو نیچے لیٹایا پھر خود اس کی بانہوں میں سماء گیا۔



رات کے کسی پہر کروٹ بدلتے ہوئے عارفہ کی آنکھ کھلی۔ شاویز انگلیوں کو باہم پھنسائے سر
 کے نیچے رکھے ہوئے جاگ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سامنے دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ عارفہ کہنی کے
 بل اٹھی اور شاویز کو مخاطب کیا۔

"کیا ہوا شاویز۔۔۔۔۔ نیند نہیں آرہی۔۔۔۔۔" عارفہ نے تعجب سے پوچھا۔ پھر آگے ہو کر شاویز کے سینے پر ہاتھ رکھا اور اپنے ہاتھ کے پشت پر چہرا اٹکا کر اسے دیکھنے لگے۔

شاویز نے لمبی سانس لیتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ سر کے نیچے سے نکال کر عارفہ کے کندھے کے گرد مائل کیا۔

"مجھے نیند نہیں آتی۔۔۔۔۔ میں بہت کم سوتا ہوں۔۔۔۔۔" شاویز نے مایوسی سے کہا۔ عارفہ اس کی شریک حیات تھی۔ اس کی بیوی۔ شاویز اس سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا نہ جھوٹ بولنا چاہتا تھا۔

"وہ کیوں۔۔۔۔۔" عارفہ کو اس کے جواب سے پہلے سے بھی زیادہ حیرت ہوئی۔

"وہ اس لیے۔۔۔۔۔ کیونکہ مجھے انسونیا ہے۔۔۔۔۔" شاویز نے بے بسی سے شانے اچکائے۔

عارفہ کا حیرانگی سے منہ کھل گیا۔

"کب سے۔۔۔۔۔" اسے اپنے ہینڈ سم شوہر کی بے بسی پر افسوس ہوا۔

"ہمممم۔۔۔۔۔ 6 سال سے۔۔۔۔۔" شاویز نے سوچنے کے انداز میں آنکھیں چھوٹی کر کے انسونیا کی مدت بتائی۔

"تو کسی ڈاکٹر کو دکھایا۔۔۔۔۔" عارفہ نے نرمی سے پوچھا۔

شاویز اسے اپنے سینے سے ہٹاتے ہوئے نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہاں دکھایا تھا۔۔۔ کہتے ہیں۔۔۔ ٹینشن سے ہے۔۔۔ میں ٹینشن لینا چھوڑ دوں گا تو یہ بھی ختم ہو جائے گا۔۔۔" شاویز نے پھیکا مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔۔۔ اب کس بات کی ٹینشن۔۔۔" عارفہ نے معصومیت سے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"سب کچھ کھودینی کی ٹینشن۔۔۔ کبھی کبھی ڈر لگتا ہے۔۔۔ کہی یہ سب میرے خوابوں جیسا کوئی خواب نہ ہو۔۔۔ ادھر میری آنکھ کھلی۔۔۔ اور سب کچھ غائب۔۔۔" شاویز نے اپنی دلی کیفیت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

عارفہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ اور بلفرض ہو بھی جائے۔۔۔ کبھی ایسا موقع آئے کہ سب تمہیں چھوڑ دے۔۔۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔۔۔ چاہے حالت کیسے بھی ہو۔۔۔۔۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔" عارفہ نے پر امید انداز میں اسے تسلی دی۔

شاوینا سے دیکھ کر مسکرایا اور پھر شرارتی لہجہ بنایا۔

"اچھا۔۔۔۔ اتنا پیار کرتی ہو مجھ سے۔۔۔۔" اس نے چھیڑنے کے انداز میں پوچھا۔

عارفہ اس کا انداز سمجھ گئی پر خود کو نارمل رکھنے اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

مزید ایک ہفتہ تک زندگی خوشحال چلتی رہی پھر ایک ضروری میشن کی خاطر اسے کچھ دن ڈی آئی خان جانا پڑا۔

عارفہ کا شادی کے اتنے کم دنوں بعد شائیز کے دوسرے شہر جانے سے دل اداس ہو گیا تھا۔
 لیکن دلاور صاحب ہو عابدہ بیگم ہو یا سحر اور صائم سب کے ساتھ اس کا اچھے سے ٹائم پاس
 ہو جاتا۔ ایک دو دن وہ اپنے میکے بھی رہنے گئی۔ شائیز سے اس کی صبح اٹھ کر اور رات سونے
 سے پہلے لازمی کال پر بات ہو جایا کرتی۔



شائیز ڈیرہ اسماعیل خان ایک پارٹی کے چیئرمین کی تفتیش کرنے آیا تھا۔ عمران خٹک اپنے
 علاقے کا بہت پہنچا ہوا لیڈر تھا۔ روبہ روتو وہ بہت پارسا اور پاکیزہ لیڈر بنتا لیکن پس منظر اس کے
 خلیاف کئی ساری خفیہ وارداتوں کے ریکارڈ درج کئے گئے تھے۔ اور اب آخر اس کی فائل آرمی

شاویز لگاتار عمران خٹک پر معلومات جمع کر کے اپنے ایجنسی کو پہنچانے میں لگا تھا جب ایک دن اسے اپنے پیچے دو آدمی کافی دیر سے چلتے محسوس ہوئے۔ شاویز نے محتاط انداز میں جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتے خود کو انجان ظاہر کیا۔ کچھ فاصلہ چل کر اس نے اپنے دونوں سائیڈ پر بھی آدمیوں کو چلتے پایا تب وہ الرٹ ہو گیا۔ وہ دفاعی وار کرنے مڑا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ سامنے والے آدمی نے اس پر گن تھان رکھی تھی۔ اسی اثناء پیچے سے چارو آدمیوں نے اسے جکڑ لیا۔ ان میں سے ایک نے تیزی سے کمر میں چھپائی اس کی گن نکال کر لے لی۔ پھر موبائل اور ہاتھ میں پہنی گھڑی بھی نکال لی۔

"کوئی ہوشیاری نہیں۔۔۔۔۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو۔۔۔۔۔" گن تھانے آدمی نے ڈٹے
آواز میں اسے دھمکایا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس ساتھی نے آگے آکر شاویز کے چہرے
پر کالا تھیلہ پہنا دیا تاکہ وہ راستہ نہ دیکھ سکے کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ شاویز بغیر مزمت
کئے خاموشی سے ان آدمیوں کے گھیرے میں کھڑا رہا۔ ان 6 سے 8 آدمیوں کے پاس اسلحہ
تھے جبکہ شاویز اکیلا اور بغیر اسلحہ کے۔ شاویز کو ان کا مقابلہ کرنے میں دقت محسوس ہو رہی
تھی۔ دو آدمیوں نے اسے گھسیٹتے ہوئے گاڑی میں بیٹھا دیا۔

ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد شاویز کو گاڑی سے اتار دیا گیا۔ اس کے چہرے پر کالا تھیلا اب بھی موجود تھا۔ ایک آدمی نے اس کے ہاتھ پیچے کر کے زنجیروں میں جکڑ دیئے۔ پھر اسی طرح بازوؤں سے پکڑ کر اسے سیڑھیاں اترنے کا کہا اور ایک تہہ خانے میں دھکے دے کر پٹخ دیا۔ شاویز کے چونکہ ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور چہرے پر کالا تھیلا تھا اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا وہ لھڑکرا کر فرش پر جا بیٹھا۔

اسے اپنے سامنے بھاری قدموں کی آواز آتی محسوس ہوئی۔ اس کے اغواکاروں میں سے ایک نے اس کے چہرے سے تھیلا اتار پھینکا۔ اچانک روشنی پڑنے سے شاویز کی آنکھیں چندیا گئی۔ وہ پلکیں جھپکاتا ہوا اس پاس کمرے کا اور وہاں موجود اسلحہ دار گروہ کا جائزہ لینے لگا۔

"تو اس بچے کو لگایا ہے آرمی نے ہمارے تفتیش کرنے۔۔۔۔۔" شاویز کے سماعتوں میں رعب دار ڈٹی آواز پڑی۔ وہ ہٹاکٹالمباچوڑاڈھیر عمر آدمی بڑی بڑی سفید مونچھوں کو تاودیتا ہوا شاویز کے قریب آیا۔

"کون ہے آپ لوگ۔۔۔۔۔ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔۔۔۔۔" شاویز اس تنا آوار عمران خٹک کو اور اس کے بد معاشوں کو پہچان تو گیا تھا لیکن خود کو انجان ظاہر کرنے معصوم بن رہا تھا۔

کہاں رکھی ہے۔۔۔۔۔" ان بد معاشوں کے سربراہ نے آگے آکر پہلے شاویز کے منہ پر ضرب لگایا اور پھر اس کا جبرٹ مضبوطی سے پکڑے ہوئے اس پر چلایا۔

شاویز کے آبرو تن گئے لیکن اس کے ہاتھ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس نے پیروں کے بل خود کو سیدھا کیا اور ایک لات علی کو دے ماری وہ ڈگمگا کر دور جا گرا۔ طیش میں آکر دوسرے ساتھی نے شاویز کے پیٹھ پر اسلحہ سے ضرب دیا اور باقیوں کو اس کے پیر بھی باندھنے کا کہا۔ وہ سب تیزی سے شاویز کو جکڑے اس کے پیروں پر زنجیریں لپیٹنے لگے۔ شاویز اپنے شاہ سوار کے انداز میں اپنے آپ کو ان سے دور کرنے لگا لیکن اس کی محنت بیکار تھی۔ ہاتھ پیر بندھے ہونے کے باعث وہ ان آدمیوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔

"علی۔۔۔۔۔ ہم کو ہمارا فائل چاہیئے۔۔۔۔۔ اس کو اتنا مارو کہ اس کی چھڑی اتر جائے پر ہمارے فائل کی معلومات نکلوا کر رہو۔۔۔۔۔" عمران خٹک اپنے ڈٹے آواز میں داڑھی مونچھوں کو ناو دیتے حکم صادر کر کے چلے گئے۔

شاویز سے اس کا موبائل۔ اس کی گھڑی۔ اس کی گن پہلے ہی وہ لوگ لیں چکے تھے۔ اس وقت وہ مزید اس کی تلاشی کر کے اس کے پاس موجود آہنی آلات نکال رہے تھے حتہ کہ اس کے جوتے بھی اتار دیئے۔ اس کے بدن پر صرف قمیض اور شلوار رہنے دیا تا کہ وہ کسی بھی خفیہ طریقے سے اپنے ایجنسی کو مطلع نہ کر سکے۔

"صاف صاف بتادیں۔۔۔۔۔ فائل کدھر چھپائی ہے۔۔۔۔۔" علی ایک مرتبہ پھر اس کے پاس آ کر غرایا تھا۔

شاویز نے تیز نظریں اس پر جمائی۔

"جان سے بھی مار دو۔۔۔۔ تب بھی نہیں بتاؤں گا۔۔۔" شاویز نے تند و تیز آواز میں دانت پیستے ہوئے کہا۔

اس کا جواب سن کر علی کا پارا آسمان پر چڑھ گیا اس نے ہاتھ کی مٹھی بنا کر شاویز کے منہ پر ضرب لگایا۔

شاویز کا موازنہ بگڑ گیا لیکن خود کو گر پڑنے سے بچا لیا تھا۔ اس کے جبرے میں شدید ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی۔ ضبط کرتے ہوئے اس نے ہونٹوں پر رستاخون زبان پھیر کر صاف کیا اور دوسری جانب رخ کر کے تھوک دیا۔ اسے حقارت سے گھورتے ہوئے علی اور اس کے ساتھی کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی شاویز کے دماغ نے دوڑنا شروع کیا۔ عقابی نظریں ہر چیز پر دوڑاتے ہوئے سماعتوں کو تیز رکھے ہوئے۔ چھت پر چلنے پھیرنے کی آوازیں سن کر اس نے جانچ لیا کہ وہ کسی تہہ خانے میں ہے۔ اس کمرے سے نکلنے کا وہی ایک راستہ ہے جس سے ابھی علی باہر گیا ہے۔ کمرے کے وسطی دیوار پر کونے میں ایک چھوٹا سا روشن دان تھا۔ اس میں سے باہر سے آتی آوازیں سن کر شاویز نے یہ بھی معلوم کیا کہ وہاں صرف یہی 7 یا 6 لوگ نہیں ہے بلکہ بد معاشوں کا پورا گروہ ہے۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے بغیر کسی ہتھیار کے اس کا وہاں سے نکلنا ممکن ہے۔ اب جب کوئی اندر آئے گا تو شاویز کو اس کا اسلحہ اچکنا ہوگا؛ سوچتے ہوئے اس نے پھر سے ہاتھوں کو حرکت دینا شروع کیا تاکہ کچھ تو زنجیروں کی مضبوطی آزاد ہو سکے۔

شاویز نے اتنا زور لگایا کہ اس کی کلاسیاں تک گھس گئی ان سے خون بہنے لگا لیکن زنجیروں کی مضبوطی کم نہ ہو سکی۔ پھر بھی شاویز نے ہمت نہیں ہاری وہ کوئی اور ترقیب سوچنے لگا۔

خود کو آزاد کروانے کے ترغیبات سوچنے کے ساتھ ساتھ وہ شروع سے آخری لمحے تک کی ساری کاروائی یاد کرنے لگا۔ آخر غلطی کہاں پر ہوئی۔ کس جگہ چوک ہو گئی جو وہ منظر عام پر آگیا۔ جو وہ اپنے چار سالوں کے کیریئر میں پہلی مرتبہ پکڑا گیا؛ یہ سوال اسے مزید پریشان کر رہا تھا۔



رات بارہ بجے تک بھی جب شاویز کی کال نہیں آئی تو عارفہ پریشان ہو گئی۔ وہ کمرے میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہی تھی۔ اس نے خود سے نمبر ملایا تو نمبر بند آ رہا تھا۔ اس کا مزید دل ڈوبنے لگا۔ اسے دسو سے ہونے لگے۔ اس نے سوچا جا کر سب کو بتادیں لیکن چونکہ آدھی رات ہو رہی تھی اس لیے اس نے صبح ہونے تک صبر کیا۔

"کیا بات ہے۔۔۔۔۔ پریشان لگ رہی ہو۔۔۔۔۔" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

عارفہ کا دل بھرا گیا۔ اس کا دل کیا وہ ان سے لپٹ کر رو پڑے۔

"پاپا۔۔۔۔۔ شاویز کارات سے نمبر نہیں مل رہا۔۔۔۔۔" عارفہ نے ہچکچاتے ہوئے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"ہاں تو۔۔۔۔۔ مصروف ہو گا۔۔۔۔۔ تم جانتی تو ہو اس کے کام کی نوعیت۔۔۔۔۔ اکثر و بیشتر ایسے کیس میں وہ لوگ اپنا موبائل بند کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ تاکہ پکڑے نہ جائے۔۔۔۔۔ یہ ان کے جاب کا حصہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔" پاپا شفقت سے اپنی بہو کو سمجھانے لگے۔

"پریشان مت ہو۔۔۔۔۔ جیسی وہ فارغ ہو گا ضرور کال کرے گا۔۔۔۔۔" اسے تسلی دیتے ہوئے پاپا نے عارفہ کے کندھے کو تھپتھپایا۔

عارفہ ان کا لحاظ کرتے ہوئے پھیکا مسکرائی اور سر اثابت میں ہلایا۔

نسبت آج علی کے تاثرات پہلے سے زیادہ سخت تھے۔ اس نے آتے ہی شاوینز کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور اس کا رخ اپنے جانب بلند کیا۔

"دیکھ۔۔۔۔ ہم تجھے ساری زندگی ادھر نہیں رکھ سکتا۔۔۔۔ جلدی بتا فائل کدھر ہے۔۔۔۔ کہاں رکھا ہے۔۔۔۔" علی اپنے پٹھانی لہجے میں شاویز پر غرایا۔

وہ پھر بھی لب میخچھے رہا تو علی نے شاویز کے پیٹھ پر لات مار کر اسے اوندھے منہ گرا دیا۔ اپنے ساتھی سے ہنٹر لے کر وہ شاویز کے پٹھوں اور کندھوں پر ضربیں لگانے لگا۔ ضرب اتنی زوردار ہوتی کہ شاویز سانس روکے دانت جمائے ہوئے آنکھیں سختی سے میخچھے درد برداشت کرنے لگا۔ مارتے مارتے علی تھک گیا لیکن شاویز کے زبان سے اففف تک نہیں نکلی۔ شاویز کی سفید قمیض جگہ جگہ سے پھٹ گئی اور خون سے تر ہونے لگی۔

شاویز کراہتے ہوئے لمبی سانس لیتے ہوئے خود کو نارمل کرنے جتن کرنے لگا۔

"لالا۔۔۔۔۔ وہ یانی مانگ رہا ہے۔۔۔۔۔"

ان میں سے ایک چھوٹے قد آدمی نے علی کو متوجہ کیا۔

علی نے کال کاٹی اور ہاتھ اٹھا کر اس چھوٹے قد آمی کو کہنی دکھائی۔ وہ سہم کر پیچے ہو گیا۔

"تمہارے ماما کا لڑکا ہے۔۔۔۔۔ جو اس پر رحم آرہا ہے۔۔۔۔۔ چل نکل۔۔۔۔۔ پانی مانگ رہا

ہے۔۔۔۔۔" علی نے ڈانٹ کر اسے جھڑکا اور کرہٹ بھرے لہجے میں اس کا جملہ دوہرایا۔ وہ

آدمی چھنپ سا گیا اور کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

شاویز یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ ان میں سے کس کے اندر کچھ انسانیت باقی ہے اور اس کے فریاد پر

کوئی عمل دکھائے گا۔ اب شاویز کا ٹارگٹ وہ چھوٹا قد آدمی تھا۔ شاویز اسے اپنے باتوں میں

پھسلا کر کچھ مدد لے سکتا تھا۔ لیکن اس کے سامنے بھی علی نام کا پہاڑ آکھڑا ہو گیا تھا۔ پہلے شاویز

کو علی کو سامنے سے ہٹانا تھا جو کہ ناممکن کے مترادف تھا۔



یونیورسٹی میں بھی عارفہ اداس ہی رہی تھی۔ گھر لوٹنے کے بعد وہ لپچ کئے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شاویز کا نمبر ابھی بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا ٹینشن سے برا حال ہونے لگا۔ وہی دلاور صاحب کو بھی اب کھٹک محسوس ہونے لگی تھی۔

ڈنڑ کے وقت عارفہ میز پر آ کر تو بیٹھ گئی لیکن کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"عارفہ۔۔۔۔ شاوینز سے رابطہ ہوا۔۔۔" دلاور صاحب نے متفکر انداز میں پوچھا تو عارفہ نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"پاپا۔۔۔ آپ شاویز کے ایجنسی والوں سے پوچھ لیں۔۔۔ ہو سکتا ہے ان پاس شاویز سے رابطہ کرنے کا کوئی اور طریقہ کار موجود ہو۔۔۔ وہ اپنے آفسر سے اتنی دیر بے خبر تو نہیں رہے گے نا۔۔۔" صائم نے چاول نکالتے ہوئے تجویز دی۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔۔۔۔ میں صبح ہی ان سے پتا کرتا ہوں۔۔۔" پاپا نے فیصلہ کیا اور اپنے کھانے کی جانب متوجہ ہوئے۔



دو گھنٹے بعد علی پھر سے شاویز کے سر پر موجود تھا۔

"جتنا تم چپ رہے گا۔۔۔۔ اتنا ہم تم کو تکلیف دیگا۔۔۔۔ بتا دے۔۔۔۔" علی نے ایک مرتبہ پھر غراتے ہوئے اسے دھمکی دی۔

"نہیں۔۔۔۔۔ سلطان نے کہا ہے نا۔۔۔۔۔ خٹک صاحب کے دستاویزات کہاں ہے یہ صرف اسے معلوم ہے۔۔۔۔۔ اس کا منہ جلادیا تو سمجھو سب ہاتھ سے نکل گیا۔۔۔۔۔"

دوسرے ساتھی نے پہلے ساتھی کے تیزاب کی بوتل پکڑے ہاتھ کو تھام کر کہا۔

سلطان کا نام سن کر درد کی شدت سے نڈھال پڑتے شاویز کے جسم میں کرنٹ سادوڑ گیا۔ اس کی تعجب سے آبرو پھیل گئے۔ سلطان اسی کا ایک ہم منصب تھا۔ وہ اسی کے ادارے سے منسلک لڑکا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں آرمی میں آنے والا ہر نوجوان اپنے کام میں ایماندار اور اپنے وطن کے ساتھ مخلص ہو۔ اب ہر کوئی صادق سر کے بھائی یا شاویز جیسا تو نہیں ہوتا جو وطن کی حفاظت میں اپنی جان لگا دیں۔ کچھ ایسے غدار بھی ہوتے ہیں جنہیں اپنے آپ سے آگے کوئی اور نظر نہیں آتا۔ سلطان بھی انہی دغا بازوں میں سے ایک تھا۔ اس نے عمران خٹک سے

بھاری رقم لے کر پہلے خود اس کی فائل تک رسائی کرنا چاہی لیکن جب خود ناکام رہا تو عمران خٹک کو شاویز کی مخبری کر دی۔

تو سلطان نے میری مخبری کی ہے ان کو؛ سوچتے ہوئے شاویز کے بدن میں آگ لگ گئی وہ خود کو آزاد کرانے دھاڑنے لگا۔ اس پر اتنی دہشت سوار ہو گئی تھی کہ ابھی اگر سلطان اس کے سامنے ہوتا تو وہ اسے نوچ ڈالتا۔

علی نے شاویز کو آپے سے باہر ہوتا دیکھ کر اس کے منہ پر گھٹنے سے ضرب دے ماری۔ شاویز کا ہونٹ کٹ گیا اس سے دھار کی صورت خون بہہ کر اس کی قمیض کو سامنے کے حصے سے بھگورہا تھا۔

"وہ تاریں تو لا کر دو۔۔۔۔۔ اس کا ابھی ہوش ٹھکانے لاتا ہوں۔۔۔۔۔" علی نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت دی۔

شاویز روہانسی ہو گیا۔ وہ کھسکتے ہوئے علی سے دور ہونے لگا۔ علی بجلی کے تاروں آپس میں
چنگارتے ہوئے شاویز کو جھٹکے سے ڈراتا اس کے قریب آیا۔

"کیوں۔۔۔۔۔ فائل کا بتائے گا کہ نہیں۔۔۔۔۔" علی نے استخز یہ ہنستے ہوئے کہا۔

"لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ"۔۔۔۔۔ "شاوینز نے کلمہ پڑھا۔

"میرا محافظ میرا اللہ ہے۔۔۔۔۔ جب تک اس کی رضا نہ ہو۔۔۔۔۔ تم مجھ سے کچھ نہیں بلوا سکتے۔۔۔۔۔" شاویز نے اللہ کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

علی نے اس کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر سپاٹ انداز میں اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے علی کے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے شاویز کو آگے دکھایا۔ علی نے بے رحم انداز میں بجلی کی تار

شاویز کی جسم سے لگادی۔ وہ کرنٹ کی ضد میں آکر جھلکانے لگا۔ ایک زوردار بجلی کا جھٹکا دے کر علی نے تار پیچے کیا تو شاویز کراہتے ہوئے لمبی سانس لینے لگا۔ اس پر لرزش طاری ہو گئی تھی۔ چند سانس لے کر علی نے پھر اسے جھٹکا دیا۔ شاویز کو لگا اس کے جسم سے کوئی روح کھینچ کر کانٹوں پر گھسیٹ رہا ہے۔ دوسرا جھٹکا مل کر شاویز منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

"بزدل آدمی۔۔۔۔۔ بغیر انسان۔۔۔۔۔ مجھے مجبور کر کے۔۔۔۔۔ میرے ہاتھ پیر باندھ کر وار کر رہا ہے۔۔۔۔۔ ہمت ہے تو مجھے آزاد کر اور پھر میرا مقابلہ کر۔۔۔۔۔" شاویز نے کرنٹ لگنے کی وجہ سے کپکپاتے ہوئے دانت پیستے علی کو چیلنج کیا۔

"ہاہا۔۔۔۔۔ اتنا بے وقوف نہیں ہے ہم۔۔۔۔۔ تمہاری باتوں میں آجائے۔۔۔۔۔" کہتے
ساتھ ہی علی نے ایک اور کرنٹ دیا تو شاویز کی سانس رکنے لگی وہ نڈھال ہوتا ہوا بے ہوش
ہو گیا۔



دلاور صاحب کی فیملی ایک مرتبہ پھر آزمائش میں پڑ گئی تھی۔ آج دو دن ہونے کو تھے شاویز کی
کوئی خبر نہیں تھی۔

صائم سحر عارفہ تینوں گھر پر تھے یونیورسٹی جانے کا کسی کو ہوش ہی نہ تھا۔ صائم اور سحر کے
نزدیک شاویز نے سگے بھائی کے مانند جگہ بنالی تھی۔ وہ اس کی حفاظت کی دعائیں کرتے پریشان
بیٹھے تھے۔ عابدہ بیگم کے قریب بھی شاویز اپنے بیٹے سے کم نہ تھا وہ تو صبح سے وظائف پڑھ

پھونک کر اللہ سے شایز کی خیریت مانگ رہی تھی اور عارفہ کی توجان پر بن آئی تھی۔ اتنی مشکلات کے بعد اسے اس کی محبت ملی تھی اور اب پندرہ دن بعد ہی ساتھ چھوٹ جانے کے دورا ہے پر آن پہنچا تھا۔ صبح سے اس کی امی بھی ان کے ہاں موجود اپنی بیٹی کو سنبھالنے لگی تھی جس کی اب تک ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اتری تھی۔ وہی اصغر صاحب اسلام آباد میں بیٹھے کال پر عارفہ کو دلا سے دیتے رہے اسے حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتے رہیں۔

دلا اور صاحب صبح کے نکلے دوپہر کو گھر آئے۔ ان کے چند قدم پیچے جاوید بھی بے دم قدموں سے لاؤنج میں داخل ہوا۔

عابدہ بیگم دلا اور صاحب کو مایوسی سے صوفے پر بیٹھ کر ہاتھ مسلتے دیکھ کر مزید پریشان ہو گئی۔ انہوں نے دلا اور صاحب کے بجائے جاوید کو مخاطب کیا۔

"کیا ہوا جاوید۔۔۔ آپ دونوں شاولیز کے ایجنسی گئے تھے نا۔۔۔ کیا کہا انہوں نے۔۔۔۔۔
شاولیز کی کوئی خبر۔۔۔" عابدہ بیگم چل کر جاوید کے پاس آئی۔

جاوید نے لمبی سانس خارج کرتے ہوئے سب پر ایک نظر ڈالی۔ سب اسی کے طرف متوجہ تھے۔

"آئی۔۔۔ ایجنسی والوں کا بھی دودن سے شاولیز سے رابطہ نہیں ہو پایا ہے۔۔۔۔۔ جو ان کا خفیہ چپ شاولیز کے گھڑی میں لگا تھا۔۔۔۔۔ وہ بھی پہنچ سے دور بتا رہا ہے۔۔۔۔۔" جاوید نے مدھم آواز میں درپیش صورت حال سے واقف کرنا شروع کیا۔

"انہیں یہ خدشہ ہے کہ۔۔۔۔۔ شاید شاولیز کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔۔۔۔۔" جاوید نے بے بسی سے لب کاٹتے ہوئے کہا۔

پر ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی امی اور سحر اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے سنبھالنے لگے۔ اس کی کہی باتوں پر جاوید بھی خاموشی اختیار کر گیا۔ اس اندیشے کا اس کے پاس بھی کوئی جواب نہ تھا۔

دلاور صاحب نے فلحال خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ وہ اپنے اندر کے ٹوٹتے باپ کو جوڑے رکھنے کی کشمکش میں مبتلا تھے۔



شاوین نے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کی بوچھاڑ ہوتے پائی تو وہ ایک جھٹکے سے ہوش میں آیا۔ علی نے بالٹی بھر پانی اس پر انڈیل دیا تھا۔ خالی بالٹی اس نے دیوار پر پٹخ دی۔

شاویز نے اپنی نگرانی کے لیے کھڑے اس چھوٹے قد آدمی اور اس کے ساتھی کو معصومیت سے دیکھا۔

"لالا۔۔۔ ایک بار ہم کو اپنے گھر پر فون کرنے دو۔۔۔" شاویز نے معصومیت سے افسردہ انداز میں کہا۔

وہ دونوں چپ رہے۔ شاویز نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ وہ کھسکتا ہوا گھٹنوں کے بل اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ پیرا بھی بندھے ہوئے تھا۔ شیو کافی بڑھ چکی تھی۔ کپڑے پھٹے ہوئے۔ چہرہ بوسیدہ حال۔ 3 تین دن سے بھوکا پیاسا رہنے سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"بھائی جان۔۔۔ میرے گھر والے بہت پریشان ہونگے۔۔۔ تھوڑی دیر میں ویسے بھی آپ مجھے مار دو گے۔۔۔ تو اسے میری آخری خواہش سمجھ کر پورا کر دو۔۔۔" شاویز نے نقلی آسنو آنکھوں میں لاتے ہوئے پھر سے درخواست کی۔

"اے چپ کر۔۔۔ زیادہ بولا تو یہ ساری گولیاں تیرے اندر اتار دوں گا۔۔۔" اس بڑے آدمی نے ہاتھ میں پکڑا اسلحہ دکھاتے ہوئے تند و تیز آواز میں اسے جھڑک کر خاموش کرادیا۔



رات کے وقت روشن دان سے چاند کی کچھ روشنی اندر آرہی تھی۔ شاویز اوندھے منہ لیٹا بے بسی سے اس روشنی کو دیکھنے لگا۔ اسے اپنی ماں پھر پاپا کی سب سے زیادہ یاد آرہی تھی اور ان کے بعد اپنی soulmate عارفہ کی۔ اس کے مہندی لگے ہاتھ۔ اس کا ہنسنا۔ اس کا چہکننا۔ وہ اس کے سونے تک عارفہ کا اس کے ساتھ جاگے رہنا۔ اس کی پسند نہ پسند کا خیال رکھنا۔ اس کی فکر

کرتے رہنا۔ اس کے سارے کام کرنا۔ اس سے اتنی محبت کرنا۔ اتنے کم دنوں میں بھی عارفہ نے شاولیز کا دل جیت لیا تھا۔ وہ اس کی وفادار اور تابیدار بیوی ہونے کے سارے فرائض بہت اچھے سے سرانجام دے رہی تھی۔ اس وقت عارفہ کی ایک ایک ادایا د کر کے شاولیز پھیکا مسکرایا۔

پتا نہیں وہ کل تک زندہ بچے گا یا نہیں لیکن اگر وہ بچ گیا اور اپنے گھر والوں تک پہنچ گیا تو وہ عارفہ کو بانہوں میں لے کر اس سے اپنی محبت کا اظہار ضرور کر دے گا۔ وہ اسے بتا دے گا کہ وہ اس سے بے پناہ پیار کرتا ہے؛ سوچتے ہوئے شاولیز کے دل میں امید سی جاگی۔ نڈھال حالت میں بھی اس نے ہلنے کے کوشش کی لیکن اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا اس نے درد کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں۔



وہی دوسری جانب عارفہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس گم سم سی بیٹھی باہر چاند اور تاروں کو دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں ان لوگوں نے شاویز کے ساتھ کیا کیا ہو گا۔۔۔۔۔ وہ کس حال میں ہو گا۔۔۔۔۔ کبھی زیادہ مارا نہ ہو۔۔۔۔۔" رنگارنگ سوچوں سے اس کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ مایوسی سے وہ اٹھی۔ واشروم گئی اور وضو کیا۔ دوپٹہ سر پر اوڑھا اور مصلحہ بچھا کر نوافل ادا کئے۔ دعا میں ہاتھ اٹھانے تک اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے تھے۔

"اے اللہ۔۔۔۔۔ جب دنیا میں انسان کے پاس ہر راستہ بند ہو جائے۔۔۔۔۔ تب بھی ایک در ہمیشہ کھلا ملتا ہے۔۔۔۔۔ اور وہ تیرا در ہے میرے رب۔۔۔۔۔ تو رحیم ہے تو کریم ہے۔۔۔۔۔ شاویز تو تیرا نیک بندہ ہے۔۔۔۔۔ اس نے ہمیشہ دنیاوی کاموں کے ساتھ ساتھ تیری عبادت بھی پورے لگن سے کی ہے۔۔۔۔۔ چاہے اس پر جیسے بھی حالات آئے ہو۔۔۔۔۔"

اس نے کبھی تیرا دامن نہیں چھوڑا۔۔۔۔۔ اپنے اس نیک بندے کے خاطر مجھ گنہگار بندی کی دعا سن لے۔۔۔۔۔ میرے شوہر کو میرے سر پر سلامت رکھ۔۔۔۔۔ وہ جہاں بھی ہو۔۔۔۔۔ اس کی حفاظت میں تیرے حوالے چھوڑتی ہوں۔۔۔۔۔ تو ہی اس کا کارساز بن جا۔۔۔۔۔ تو ہی اس کی مدد فرما۔۔۔۔۔ بے شک تو اپنے نیک بندوں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔۔۔۔۔" عارفہ نے روتے ہوئے درود پڑھتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔

یہی حالت دلاور صاحب کی بھی تھی۔ وہ بھی اپنے سٹڈی روم میں مصلحے پر بیٹھے اپنے جوان بیٹھے کی زندگی کی فریاد کر رہے تھے۔



چار دن بعد شاویز کو دو گھونٹ پانی پلایا گیا جو اس نے ایک ہی سانس میں پی لیا۔ اس نے سرد آہ بھری اور علی کے بے تاثر چہرے کو دیکھنے لگا۔

"اب بھی نہیں بتائے گا۔۔۔۔۔" اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

شاویز نے استخزیہ مسکرا کر سر نفی میں ہلایا۔ اب کی بار علی کے آبرو تو تن گئے لیکن اس نے آگے آکر شاویز پر وار نہیں کیا۔ اس نے موبائل جیب سے نکالا اور ایک نمبر ملا یا۔ کال اٹھانے پر خٹک صاحب نے سب سے پہلے یہی سوال پوچھا۔

"نہیں سر۔۔۔۔۔ سب کچھ آزما لیا۔۔۔۔۔" سالاکچھ نہیں بتا رہا۔۔۔۔۔" علی نے حقارت سے شاویز کو گھورتے ہوئے کال پر جواب دیا پھر وہ عمران خٹک کی بات سننے کچھ دیر خاموش ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے سر۔۔۔۔۔" سر کو جنبش دیتے ہوئے موبائل رکھا پھر دوسرے جیب سے ایک انجیکشن اور سیرنج نکالی۔ وہ انجیکشن دیکھ کر شاویز کی آنکھیں پھیل گئی۔ وہ جانتا تھا انجیکشن کس چیز کا ہے لیکن وہ علی کو روکنے سے قاصر تھا۔

"مجھے میرے گھر والوں سے بات کرنی ہے۔۔۔۔۔ ایک دفعہ کال کرنے دو۔۔۔۔۔"

پلیز۔۔۔۔۔ میری اپنے پاپا سے بات کر او۔۔۔۔۔" شاویز نے ہمت کر کے پھر سے ریکویسٹ کی۔

"ابھے سالے چپ۔۔۔۔۔ ایک اور دفعہ بولا۔۔۔۔۔ تو تمہارے گھر پر بم حملہ کروا کر تمہارا پورا خاندان مٹا دوں گا۔۔۔۔۔" علی نے گالی دیتے ہوئے اسے جھڑکا اور پھر شاویز کو اٹھا کر بیٹھایا اور پیچھے آکر اس کے بازو میں انجیکشن لگا دی۔ شاویز نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

"تم بتا دیتا تو ہم کو ایسا نہیں کرنا پڑتا۔۔۔۔۔ بہت طاقتور ہے نا تم۔۔۔۔۔ اب ہم دیکھتا ہے۔۔۔۔۔ اس زہر سے کیسا بچتا ہے۔۔۔۔۔" علی نے ہنستے ہوئے طنز کیا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔

شاویز کو پانچ منٹ کے اندر اپنا سر بھاری ہوتا محسوس ہوا۔ اتنے دنوں سے بھوکے پیاسے تشدد
سہتے وہ پہلے ہی برے حال میں تھا اور اب یہ زہریلا انجیکشن۔ اسے متلی ہونے لگی وہ کھانستے
ہوئے تڑپ اٹھا۔ اسے اپنے آنکھوں کے آگے اندھیرا ہوتا محسوس ہوا۔

"لالا پلینز۔۔۔۔۔ اب تو مجھے کال کرنے دو۔۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔۔ اب تو زہر بھی انجیکٹ کر دیا ہے۔۔۔۔۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک آدھ گھنٹہ ہی زندہ رہ پاؤں گا۔۔۔۔۔" شاویز نے بھرائی آواز میں التجا کی۔ اس کی سانس رک رک کر آنے لگی۔

"کم از کم۔۔۔۔ میں اپنے باپ کو اپنی وصیت ہی بتا دوں۔۔۔۔ اتنا تو رحم کرو۔۔۔۔ آخر
تم بھی کسی کے بیٹے ہو۔۔۔۔ کسی کے بھائی ہو۔۔۔۔ کسی کے شوہر ہو گے۔۔۔۔ کسی کے باپ
ہو گے۔۔۔" شاویز نے معصومیت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے نقلی آسنور خسار پر بہائے۔
اس کے آنسو بھلے ہی اداکاری کے تھے لیکن اسے اصل میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

"لالا۔۔۔ اتنا رو رہا ہے۔۔۔ فون دے دو۔۔۔ کل سے منت سماجت کر رہا ہے۔۔۔"

چھوٹے قد آدمی کو کچھ رحم آیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو ڈرتے ہوئے مخاطب کیا۔

"پاگل ہے کیا۔۔۔۔۔ علی لالا کو پتا چلا۔۔۔۔۔ گولی مار دیگا۔۔۔۔۔" ساتھی نے ہنہ کرتے ہوئے دوسرے کو ڈانٹا۔

"میں علی کو نہیں بتاؤں گا۔۔۔۔۔ خیر ہے بھائی۔۔۔۔۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔۔۔۔۔ صرف ایک
 کال۔۔۔۔۔ مرنے والے کی آخری خواہش پوری کر دو۔۔۔۔۔ ثواب ملے گا
 پلیز ززززز۔۔۔۔۔" شاویز اب بلند آواز دھاڑے مار کر رونے لگا۔ اس کی ساری توانائی ختم
 ہو گئی تھی اس سے اداکاری بھی ٹھیک سے نہیں کی جا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ جلدی بات کرنا۔۔۔۔۔" اس آدمی کی رضامندی پر شاویز کی آنکھیں
 خوشی سے چمک اٹھی۔

"نمبر بتاؤ۔۔۔۔۔" وہ شاویز کے پاس آیا اور اس کے بتائے نمبر کو ملانے لگا پھر فون سپکیر پر کر کے
 اس کے پہلو میں رکھ دیا۔

شاویز نے ہلکا سا زور ایک طرف کر کے خود کو موبائل کے سامنے گرا دیا۔ اس کی تیز نظریں
 مسلسل سکرین پر جمی ہوئی تھی۔

"ہیلوپاپا۔۔۔" مخالف سمت کال اٹھائے جانے پر اس نے فوراً سے بات کی اور ساتھ ساتھ کھانسنے لگا۔ یہ اس کا کوڈورڈ طریقہ تھا کال پر موجود شخص کو محتاط کرنے کہ اس کے پاس کوئی موجود ہے۔

"پاپااااا۔۔۔۔۔ مجھے عمران خٹک کے بد معاشوں نے اغوا کر لیا پاپا۔۔۔۔۔" شاویز نے منہ بنائے روتے ہوئے۔

"میں تو ڈیر اسماعیل خان آیا تھا۔۔۔۔۔ پر وہاں ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔۔۔۔۔ اور وہاں کے بازار سے دو گھنٹے دور یہاں اس کال کو ٹھڑی میں قید کر دیا ہے۔۔۔۔۔" شاویز رونے کی اداکاری کرتے باتوں باتوں میں دوسری طرف معلومات فراہم کرنے لگا۔

اس نے پاپا کو کال کرنے کے بہانے سے اپنے ایجنسی کے ہیڈ کوارٹرز کے مین دفتر میں کال ملائی تھی۔ شاویز کی آواز سن کر ہی وہ لوگ کاروائی پر جٹ گئے۔ تیز تیز آلات پر ہاتھ چلاتے ہوئے ایک آفسر اس کی کال ٹریس کرنے لگا۔ دوسرے نے ڈیر اسماعیل خان اور لاہور میں موجود

اپنے برانچوں میں شاویز کی کال ٹرانسفر کر دی تھی۔ وہاں کے کارکنان پولیس کو اطلاع دینے لگے۔

شاویز گیلی سانس اندر کھینچ کر پھر سے گویا ہوا۔

"پاپا یہ لوگ بہت خطرناک ہے۔۔۔۔۔ مجھے بہت مارا ہے۔۔۔۔۔ بہت تشدد کیا ہے مجھ

پر۔۔۔۔۔ بجلی کے شاک بھی دیئے۔۔۔۔۔ بھوکا پیاسا زنجیروں میں باندھ کر رکھا

ہے۔۔۔۔۔" شاویز نے بھرائی آواز میں اپنی آپ بیتی سنائی۔

"اور آج تو مجھے NC177 بھی انجیکٹ کر دیا ہے۔۔۔۔۔ میں مر جاؤں گا۔۔۔۔۔ مجھے بچالو

پاپا ااااا۔۔۔۔۔" شاویز موبائل اسکرین پر کال کا دورانیہ دیکھے جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا لوکیشن ٹریس

کرنے کے لیے کم از کم اسے تین منٹ تک کال جاری رکھنی تھی۔

میں ایجنسی کے بتائے معلومات کے مطابق ڈی آئی خان کے آرمی آفسران اور پولیس کی دو سے تین گاڑیاں لوکیشن کا تعاقب کرنے روانہ ہو گئے۔ وہی لاہور کے برانچ نے سب ہسپتالوں میں ایمر جنسی نافذ کر دی تاکہ شاویز کا بروقت اعلان ہو سکے۔

شاویز کی سانس رکنے لگی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی بقیہ معلومات بیان کرنے لگا۔

"ان سب کے پاس بہت بڑے بڑے اسلحہ ہے۔۔۔۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔۔۔۔ مجھے یہاں سے لے جائے۔۔۔۔ عمران خٹک کی فائل میں نے اپنے IS33 والے فولڈر میں رکھی ہے۔۔۔۔ آپ وہ انہیں لا کر دے دو اور مجھے بچالو۔۔۔۔" آرمی ایجنسی میں بھرتی ہونے والے ہر جوان کو ایک خفیہ آئی ڈی کوڈ دیا جاتا ہے جس سے وہ بغیر اپنا اصلی نام استعمال کئے بھی پہچانا جاتا ہے۔ شاویز نے باتوں باتوں میں سلطان کا خفیہ کوڈ بتایا تو کال سننے والے آفسران دنگ رہ گئے۔ انہوں نے تعجبی انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ان میں سے ہیڈ

آفسر نے دوسرے ساتھی کو ہاتھوں سے سلطان کو اپنے حراست میں لینے کا اشارہ کیا۔ وہ سر کو خم دے کر سلطان کو گرفتار کرنے باہر کو لپکا۔

ساری ضروری معلومات شروع میں بتا کر اب شاوینز تکلیف سے جو نچتا ادھر ادھر کی باتیں کر کے کال کا دورانِ نبیہ بڑھاتا جا رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا پاپا۔۔۔۔ میں نے آپ کو ہمیشہ پریشان کیا ہے۔۔۔۔ اپنی سوتیلی ماں سے بھی برا رویہ رکھا۔۔۔ اور سوتیلے بھائی بہن کو تو مارنے پر آگیا تھا۔۔۔ کتنا برا ہوں میں۔۔۔۔ لیکن مجھے ابھی نہیں مرنا۔۔۔ میری صرف پندرہ دن پہلے شادی ہوئی ہے یار۔۔۔۔ میں اب تک ٹھیک سے اپنی بیوی سے پیار کا اظہار بھی نہیں کر پایا۔۔۔" شاویز کی مایوس کن باتیں سن کر علی کے ساتھیوں کو شاویز کی بے بسی پر ترس آنے لگا۔

شاویز نے اپنی گفتگو اسی انداز میں جاری رکھی۔

"آپ ٹھیک کہتے تھے۔۔۔۔ میں آرمی کے لائق ہی نہیں ہوں۔۔۔۔ ایک کام بھی ٹھیک سے نہیں کر پایا۔۔۔۔ دیکھو پکڑا گیا۔۔۔۔ اور اب اتنی اذیتیں جھیلنی پڑ رہی ہے۔۔۔۔ آہ ہہہہہ۔۔۔۔" بات کرتے کرتے شاویز سچ میں کراہ اٹھا۔

دفتر میں بیٹھے اس کی کال ریکارڈ کرتے آفسر کی چلتی انگلیاں رک گئی۔ انہیں شاویز پر بہت افسوس ہو رہا تھا لیکن وہ اسے کوئی بھی جواب دینے سے پابند تھے۔ ذہن سے منفی خیالات جھٹک کر انہوں نے پھر سے تیز تیز ہاتھ چلانا شروع کیا۔ وہ مسلسل اپنے ڈی آئی خان والے عملا سے رابطے میں تھے اور وہ شہر کے حدود سے نکل گئے تھے۔ جیسے ہی لوکیشن ٹریس ہوتا انہوں نے حملہ کر دینا تھا۔

شاویز نے ایک جھوٹی نظر سامنے کھڑے آدمیوں پر ڈالی وہ بے حس کھڑے اس کی فریاد سن رہے تھے۔ شاویز کو روتے ہوئے بھی ان بے وقوفوں پر افسوس بھری ہنسی آنے لگی۔

"پاپااااا۔۔۔۔۔ آپ میری سوتیلی ماں سے کہنا۔۔۔۔۔ مجھے اپنا بیٹا سمجھ کر معاف کر دیں۔۔۔۔۔ اور آپ کو مجھے بچانے بھیج دیں۔۔۔۔۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔۔۔۔۔ مجھے یہاں سے لے جائے۔۔۔۔۔" شاویز نے بلند آواز رونا شروع کیا تو ایک آدمی آگے آیا اور فون اٹھانے لگا۔ شاویز نے تیزی سے اسکرین پر دورانہ دیکھا تو تین منٹ سے کچھ سیکنڈ زیادہ بتا رہا تھا۔ شاویز نے شکر کا سانس لیا۔ کم از کم اس نے وقت پر اپنے ایجنسی پر اپنی اغوا کی معلومات دے دی تھی۔



زہر کا اثر تھوڑا تھوڑا کر کے شاییز کے جسم کو بے حس کرتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ وہ دیوار سے سر ٹکا کر بیٹھا تھا جب اسے روشن دان سے شور کی، جھڑپ کی، گولیاں چلنے کی آوازیں آنی شروع ہوئی۔ تھوڑی دیر میں بھاری بھر کم بوٹوں کی آواز آئی۔ کچھ پولیس اہلکار سیڑھیاں اتر کر دروازہ توڑنے لگے تھے۔ تین چار پانچ مرتبہ بھی زور لگا کر جب دروازہ نہیں ٹوٹا تو گولی چلا کر لاک توڑ دیا۔ دو اہلکار بھاگتے ہوئے شاییز کے پاس آکر اس کے ہاتھ پیر کھولنے لگے۔ ان کے پیچھے ڈی آئی خان والے ایجنسی آفسران بھی تہہ خانے میں در آئے۔ ان کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا جس نے بروقت شاییز کو anti venom ویکسین لگایا تاکہ زہر کا اثر رک جائے۔

شاییز کی حالت پھر بھی غیر ہونے لگی تھی۔ اسے بار بار متلی ہونے لگی لیکن معدہ خالی ہونے کے باعث الٹی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کا سر چکرار ہا تھا۔ پولیس اہلکاروں نے شاییز کے بازو اپنے

کندھوں پر ڈال کر اسے سہارا دیتے تھے خانے سے باہر لے جانے لگے۔ باہر متواتر پولیس اور علی کے گروہ کے مابین جنگ چل رہی تھی۔ اسی طرح شاویز کو تھامے ہوئے۔ جنگ سے بچتے بچاتے ایمبولنس میں لے گئے۔

ایک میدانی علاقے میں ایمبولنس روک کر شاویز کو سپیشل ہیلی کاپٹر کے ذریعے سیدھے لاہور لے جایا گیا۔ وہاں اس کے اپنے ایجنسی آفسران اور ڈاکٹرز کی ٹیم اس کی منتظر تھی۔ شاویز کو اسپیشل سیکورٹی کے دائرے میں ہسپتال میں داخل کروایا گیا۔



دلاور صاحب بے دلی سے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے جب ان کا موبائل بجنے لگا۔ انہوں نے جھٹ سے کال اٹھالی اور بغور جاوید کی بات سننے لگے۔ جاوید فل وقت ایک ضروری کارروائی میں مصروف تھا اس لیے خود آنے سے قاصر تھا۔

جاوید کی ہدایات سننے کے ساتھ ہی دلاور صاحب اٹھے اور آفس کا کام ڈاکر کے ہاتھوں سونپ کر گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔



عارفہ اپنا دھیان بٹانے عابدہ بیگم کے ہمراہ کچن میں لگی تھی۔ سحر کتاب گود میں رکھے لیکچر یاد کر رہی تھی اور صائم کوئی اسائنمنٹ لکھ رہا تھا جب دلاور صاحب گھر میں داخل ہوئے اور

سیدھے بیڈروم میں چلے گئے۔ انہیں اس طرح بے وقت گھر آتے دیکھ کر سب پریشان ہو گئے۔ وہ سب اپنے اپنے کام چھوڑ کر قصہ معلوم کرنے ان کے پیچھے لپکے۔

"عابدہ جلدی میرا سفری بیگ تیار کر کے دو۔۔۔۔" انہوں نے عابدہ بیگم کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ہدایت دی

"پاپا آپ ایسے ہڑبڑی میں کہاں جا رہے ہیں۔۔۔۔۔" سحر نے متفکر انداز میں پوچھا۔ عابدہ بیگم ان کے ساتھ بیگ پیک کروانے میں مدد کرنے لگ گئی تھی۔

"ایجنسی والوں نے شاویز کو ڈھونڈ لیا ہے۔۔۔۔" انہوں نے مصروف انداز میں خوشی سے چمکتے ہوئے خبر سنائے۔ یہ خبر سن کر سب کے چہرے کھل اٹھے۔

"پاپا میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔۔۔۔" صائم نے پیشکش کی۔

"نہیں میرے پیچھے گھر پر بھی کسی مرد کا ہونا ضروری ہے۔۔۔۔۔ تم یہی رکو۔۔۔۔۔" دلا اور صاحب نے ٹریول ایجنٹ کو کال کر کے ایمر جسٹنی فلائٹ میں اپنی سیٹ بک کرواتے ہوئے صائم کو ہدایت دی۔

"لیکن آپ کو بھی تو کسی کی ضرورت ہوگی۔۔۔۔۔ اکیلے کیسے کریں گے سب۔۔۔۔۔ جاوید بھی تو نہیں ہے آپ کے ساتھ۔۔۔۔۔" عابدہ بیگم نے اپنے شوہر کا بازو تھام کر پریشانی ظاہر کی۔

"پاپا کے ساتھ میں جاؤں گی۔۔۔۔۔ پاپا بس پانچ منٹ۔۔۔۔۔ میں اپنا بیگ لے کر آتی ہوں۔۔۔۔۔" سحر نے جھٹ سے درپیش مسائل کا حل تلاش کرتے ہوئے اعلان کیا اور پاپا کا رد عمل سنے بغیر اپنے کمرے کے جانب بھاگی۔

"پاپا میں بھی ساتھ چلوں۔۔۔۔۔" عارفہ کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اڑ کر شاویز کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ اس نے ارادہ بنانے سے پہلے سر کے روپ میں مہربان باپ سے اجازت چاہی۔

"میں تمہاری کنڈیشن سمجھ سکتا ہوں بیٹی۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ وہاں بہت سخت سیکیورٹی کا انتظام کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے نہیں پتا۔۔۔۔۔ جانے کتنے پڑاؤ پار کرنے کے بعد ہمیں شاویز سے ملنے دیں۔۔۔۔۔ ایسے صورت حال سے تمہارا گھر پر رہنا مناسب ہے۔۔۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔۔۔۔۔ جتنی جلدی ہو سکے میں تمہارے شاویز کو تمہارے پاس لے آؤں گا۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے معصوم عارفہ کے کندھے کو تھپکتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر سمجھایا۔

عارفہ نے ان کی باتوں سے تسلی ہوتے ہوئے سر کو جنبش دیتے ہوئے ہامی بھری۔



شاویز جس وقت ہسپتال میں داخل ہوا شدید سر درد سے اس کا برا حال تھا۔ وہ سر پکڑے تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ ڈاکٹر کی ٹیم اس کے جسم پر الگ الگ مشینیں وابستہ کر رہے تھے۔ دونوں بازوؤں میں ڈرپ کی نالیاں جوڑ دی تھیں۔ ICU کے کمرے کے باہر پولیس اور آرمی آفسران کی بھاری نفری موجود تھی۔

ڈیڑھ گھنٹہ ہوائی سفر کر کے اور پھر آدھے گھنٹے تک اپنے اور شاویز کے رشتے کی تصدیق کروا کے دلاور صاحب اور سحر تیز تیز چلتے وہاں پہنچے۔ وہاں موجود نفری میں سے ایک آفسر کو دلاور صاحب پہچان گئے تھے۔ وہ وہی تھے جن سے وہ تین دن پہلے کراچی کے ہیڈ کوارٹر میں ملے تھے۔

ابھی دلاور صاحب ان اڈھیر عمر صاحب سے شاویز کی عیادت کر رہے تھے جب ڈاکٹر ان کے پاس آئے اور علاج کی بابت ان سے بات کرنے لگے۔

"سر۔۔۔۔۔ ہمارے معائنے کے مطابق مسٹر شاویز کئی سالوں سے مانگرین کے درد سے جو بچھتے رہے ہیں۔۔۔۔۔ جس سے ان کے دماغ کے نچلے حصے میں چھوٹا سائٹو مر بن گیا تھا۔۔۔۔۔ اب انہیں کئی دفعہ الیکٹرک شاک دینے کے باعث وہ ٹیو مر پریشتر سے پھٹ گیا ہے۔۔۔۔۔" ڈاکٹر نے پروفیشنل انداز میں معلومات فراہم کرنا شروع کیا۔

"مسٹر شاویز کا فوری طور پر (cerebral مغز) آپریشن کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔ ورنہ ان کی کسی بھی وقت موت واقع ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔" ڈاکٹر نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

دلاور صاحب کا دل دہل گیا۔ سحر نے خوف سے پایا کا بازو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

"ہاں تو کروائیے آپریشن۔۔۔۔۔ کس چیز کا انتظار ہے۔۔۔۔۔" دلاور صاحب نے روہانسی ہو کر جواب دیا۔

"مسٹر دلاور پلیرز ریلکس۔۔۔۔۔ آفسر شاویز ہماری ذمہ داری ہے۔۔۔۔۔ ان کی بیسٹ ٹریمنٹ کروانا ہمارے ذمہ ہے۔۔۔۔۔ آپ پلیرز صبر سے کام لیں۔۔۔۔۔" ایجنسی آفسر نے سپاٹ انداز میں کہا۔

"ارے ارے۔۔۔ میرا بیٹا موت کے منہ میں کھڑا ہے۔۔۔ اور آپ کہہ رہے ہیں صبر سے کام لوں۔۔۔" دلا اور صاحب کی آواز بلند ہو گئی۔ ان کا لہجہ بے لچک اور سخت ہو گیا۔

"پاپا۔۔۔ انہیں اپنے طریقے سے کام کرنے دیں۔۔۔" سحر نے سب کا دھیان پاپا پر مرکوز ہوتے دیکھا تو انہیں دلاسا دینے لگی نرمی سے سمجھانے لگی۔

"آفسر۔۔۔۔ آپ سب کو جیسا مناسب لگے۔۔۔۔ آپ ویسا کریں۔۔۔۔ ہمیں بس شاوریز زندہ اور صحیح سلامت چاہیئے۔۔۔" سحر نے سنجیدہ انداز میں قدرے نرمی سے کہا۔

Don't worry! ---- آفسر شاویز کی زندگی ہمارے لیے بھی بہت قیمتی ہے۔۔۔۔۔ we
are on his full service (ہم ان کے پورے خدمت میں ہے)۔۔۔۔۔ "سحر کو تسکین
دیتے ہوئے وہ آفسر آگے بڑھ گئے۔

دلاور صاحب ابھی بھی مضطرب تھے۔ انہیں کسی کے بھی باتوں سے تسلی نہیں مل رہی تھی۔ انہوں نے اچانک ایک خیال آنے سے صادق صاحب کو کال ملائی۔ انہوں نے سوچا آرمی کے کام آخر صادق صاحب سے بہتر کون سمجھ سکتے ہونگے۔

صادق صاحب نے خوش دلی سے دلاور صاحب کی کال اٹھائی اور گرم جوشی سے سب کا حال احوال پوچھا۔ دلاور صاحب نے انہیں شاویز کو درپیش مشکلات سے آگاہ کیا تو وہ شاک ہو گئے۔ انہوں نے دلاور صاحب کو تسلی دیتے ہوئے فوراً وہاں آنے کی یقین دہانی کروائی۔



سحر متواتر عارفہ اور صائم سے رابطے میں تھی۔ اس نے انہیں یہی کہا کہ شاویز کمزوری اور جھڑپ میں لگی معمولی زخموں کے باعث ہسپتال میں داخل کروایا گیا ہے۔ اس نے شاویز کے آپریشن کی بات راز رکھی تاکہ گھر پر وہ سب مزید پریشان نہ ہو۔

سحر اور دلاور صاحب کو الگ سے انتظار گاہ میں بیٹھایا گیا تھا جب صادق صاحب تیزی سے پہلی فلائٹ سے وہاں پہنچے تھے۔ وہ دلاور صاحب سے مل کر آرمی آفسران سے بات کرنے گئے۔ ان سے شاویز کے مطابق پوچھ کر وہ واپس دلاور صاحب کے پاس آئے۔

"میری بات ہو گئی ہے۔۔۔ تھوڑی دیر میں شاویز کا آپریشن شروع کر دیں گے۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ بس دعا کریں۔۔۔ آپریشن کامیاب رہے۔۔۔۔۔ یہ بہت حساس

آپریشن ہوتا ہے۔۔۔" صادق صاحب نے دلاور صاحب کے کندھے کو تھپتھپا کر تسلی دی۔

سحر کو ان کی موجودگی سے بہت حوصلہ ملا اس نے تسکین سے مسکراتے ہوئے سر کو خم دیا۔

"پتا نہیں۔۔۔۔۔ اس بھری جوانی میں اور کتنی تکلیفوں سے گزرنا پڑے گا شاویز کو۔۔۔۔۔"

دلاور صاحب اپنے بیٹے کی تکلیفوں کو دیکھ کر افسردہ ہو گئے۔ وہ لمبی سانس لیتے ہوئے صوفے پر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ سحر انہیں سنبھالنے ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"اللہ اپنے بندوں کو کبھی جان سے تو کبھی مال سے آزماتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ بھی شاویز کی ایک آزمائش ہی ہے۔۔۔۔۔ انشاء اللہ وہ پوری دلیری سے اسے بھی پار کر لے گا۔۔۔۔۔"

صادق صاحب شاویز کی بہادری کی مثال دیتے خوش مزاجی سے مسکرائے۔



شاویز بے حس و حرکت آپریشن تھیٹر کے بستر پر آنکھیں موندھے لیٹا تھا۔ چند ماہ پہلے وہ محبت پدر کے لیے آپریشن تھیٹر میں آیا تھا اور آج محب وطن کے سلسلے میں۔

آرمی آفسران کا آپریشن کے لیے منظوری دینے کے فوراً بعد ڈاکٹر زاپنی تیاری میں جھٹ گئے۔

شاویز کے بال شیو کر کے اسے اوندھے منہ لیٹا دیا گیا اور گردن کے اوپر مغز کے حصے پر آپریشن کا آغاز ہوا۔



پانچ گھنٹے آپریشن جاری رکھنے کے بعد ڈاکٹر ماسک اتارتا ہوا تھا کاہار اباہر آیا۔ صادق صاحب اور دلاور صاحب مردوں کے جمکٹے میں در آئے اور ان کی بات سننے لگے جبکہ سحر ان سب سے دور پایا کے حرکات و سکنات بغور مشاہدہ کر رہی تھی۔ جب پایا کے چہرے پر سکون در آتا تھا اور وہ ہاتھ اٹھا کر اللہ کے حضور شکر ادا کرنے لگے تو سحر سمجھ گئی آپریشن کامیاب رہا ہے۔ اس نے سکون کی سانس لی۔

اگلے دو دن تک شاویز کو انڈر آبزرویشن رکھا گیا تھا اس لیے کسی کو بھی ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب ڈاکٹر اس کی سنبھلتی حالت سے مطمئن ہو گئے تو اس کی فیملی کو صرف دور سے دیکھنے کی اجازت دی گئی۔ اس کا سر پورا پیٹوں میں بندھا ہوا تھا۔ سینے پر الگ الگ مشینوں کے تار لگے تھے اور ہاتھوں میں ڈرپ کی نالیاں۔ پیٹھ پر ہاتھوں پر پٹھوں پر بھی پٹیاں لگی تھیں لیکن وہ چادر اوڑھے رکھنے سے نمایاں نظر نہیں آرہی تھی۔

دور سے ایسے لگتا مانو وہ گہری نیند سو رہا ہو لیکن وہ بے ہوش تھا۔ ابھی اس کے دماغ کو کام شروع کرنے میں وقت درکار تھا۔

تین دن تک سحر عارفہ کو بہانے بنا کر ٹالتی رہی تھی لیکن اس دن عارفہ بار بار شاویز سے کال پر
ہی بات کرنے کی ضد کر رہی تھی تب مجبوراً سحر کو اسے حقیقت بتانا پڑا۔ سحر نے شیشے کے پار
ویڈیو کال پر شاویز اسے دکھایا۔

شاویز کو پٹیوں میں۔ مشینوں میں۔ دوائیوں کے نالیوں میں گھیرے دیکھ عارفہ بری طرح دہل گئی تھی۔ لیکن روتے ہوئے اس نے یہ شکر کیا کہ اس کا شوہر زندہ تو ہے ہاتھ پیر صحیح سلامت تو ہے۔

وہ کال پر عارفہ کو دلا سہ دے رہی تھی جب صادق صاحب وہاں آئے۔ سحر نے کال کاٹ کر موبائل نیچے کر دیا۔ آج انہیں واپس جانا تھا۔ وہ مزید نہیں رک سکتے تھے اس لیے وہ آخری مرتبہ شاویز کو دیکھنے آئے تھے۔



جاوید ایک ہفتے تک اپنے ضروری کیس سے فارغ ہوا تھا۔ اس نے دلاور صاحب کو کال کر کے وہاں آنے کی پیشکش کی لیکن دلاور صاحب نے اسے منع کر دیا۔ وہ لوگ خود کل صبح کراچی روانہ ہونے والے تھے۔

دلاور صاحب نے وہاں کے ڈاکٹر ز اور آفسران کو یقین دہانی کروائی تھی کہ گھر پران کی پوری فیملی اور شاویز کی بیوی سب مل کر اس کا اچھے سے خیال رکھے گے۔ اس کے ٹھیک ہونے تک

پوری ذمہ داری سے خاطر داری کریں گے۔ ان کے یقین دہانی پر بھروسہ کر کے ڈاکٹر ز نے شاویز کو اگلے دن ڈسچارج کر دیا۔ دلاور صاحب مخصوص طریقے سے اسے زیادہ حرکت دیئے بغیر اسپیشل ایمبولینس کے ذریعے ہائے روڈ گھر لیں آئے۔

ابھی شاویز کے دماغ کے آپریشن کو ایک ہی ہفتہ ہوا تھا۔ اسے ہسپتال سے رخصت تو کر دیا گیا تھا لیکن ہلنے چلنے زیادہ بات کرنے سوچنے کام کا بوجھ لینے سے سختی سے منع کیا گیا تھا۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو جاوید اور عارفہ کے والدین بھی وہاں موجود تھے۔ اسے بیڈ پر نیم دراز ہو کر لیٹایا گیا۔ عارفہ سب سے پیچھے کھڑی تھی۔ اپنے امی ابو جی پاپا ماما جاوید صائم سحر کی موجودگی میں وہ شاویز سے ملنے سے کترار ہی تھی۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھنے کے بعد اسے آرام کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے وہ سب باہر نکل گئے۔ شاویز تب تک بالکل خاموش رہا تھا۔ سب کے

نکلنے کے بعد کمرے میں عارفہ کے علاوہ اب کوئی نہ تھا۔ شاویز نے پلکیں جھپکا کر اسے اپنے پاس بلایا تو وہ تیزی سے اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ شاویز نے ہلکا آگے ہو کر اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

"میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں عارفہ۔۔۔۔۔ i love u so much۔۔۔۔۔ قید میں مجھے ہر وقت سب سے زیادہ تمہاری یاد آتی رہی ہے۔۔۔۔۔ ترس رہا تھا تم سے ملنے کے لئے۔۔۔۔۔ تمہیں اپنے سینے سے لگانے کے لیے۔۔۔۔۔" شاویز نے ایک ہی سانس میں پھرتی سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

عارفہ نے اس کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے آنکھیں بند کی اور اس لمحے کو دل میں بسانے لگی۔ اپنے شوہر کے زبانی محبت کا اظہار سن کر اس کے لبوں پر قدرتی طور پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"جانتی ہوں۔۔۔۔۔ تم نہ بھی کہو۔۔۔۔۔ تب بھی سمجھ سکتی ہوں۔۔۔۔۔ میرا بھی حال اس سے کم نہ تھا۔۔۔۔۔ ایک ایک لمحہ گن رہی تھی کہ کب تم واپس آؤ گے۔۔۔۔۔ اور میں تمہیں خود سے لگاؤں گی۔۔۔۔۔" عارفہ نے اس سے الگ ہو کر احتیاط سے اس کا سر تکیہ پر رکھ دیا۔

شاویز چیت لیٹے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم ٹھیک ٹھاک میرے پاس واپس آ گئے ہو۔۔۔۔" عارفہ نے اللہ کے حضور مشکور ہوتے ہوئے کہا۔

وہ شاویز کے زیادہ بات کرنے کے حق میں نہیں تھی اس لیے اسے آرام کرنے کی تلقین کرتے ہوئے وہ اس کے لیے سوپ بنانے باہر آگئی۔ شاویز کو اتنے دنوں میں پہلی مرتبہ سکون ملا وہ آنکھیں بند کر کے آرام سے سو گیا۔

دلاور صاحب نے ہسپتالوں جیسے اس کے کمرے میں ایک گھنٹی کا بٹن رکھ دیا تھا تاکہ اگر کوئی اس کے پاس موجود نہ ہو اور اسے کسی کو بلانا پڑے تو وہ بٹن دبا دیا کریں جس سے وہ تمام لوگ آگاہ ہو جائے گے۔



مزید ایک ہفتہ گزارنے کے بعد شاویز کی زندگی معمول پر آگئی۔ وہ اٹھنا سونا خود کرنے لگا تھا۔

ایک شام وہ آئینہ کے سامنے برہنہ باڈی کھڑے اپنے کندھوں پر دوائی لگانے کی کوشش کر رہا تھا جہاں ہنٹر کے نشانات پڑے تھے۔ وہ کبھی ہاتھ اوپر سے تو کبھی نیچے سے پیٹھ کی جانب کرتا لیکن اس کا ہاتھ مندرجہ جگہ پر نہیں پہنچ رہا تھا۔ اتنے میں عارفہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے پاس آکر پیٹھ پر دوائی لگا دینے کی پیشکش کی۔

"میں لگا دیتی ہوں۔۔۔۔" عارفہ نے اس کے ہاتھ سے دوائی لیتے ہوئے کہا۔

شاویز بیڈ کے کنارے رخ پھیرے بیٹھا۔ عارفہ ہلکے ہاتھ سے اس کے زخم پر دوا لگا رہی تھی۔ اس کے زخم دیکھ کر عارفہ کا دل بھر آگیا۔ وہ بے آواز رونے لگی۔ شاویز کو اس کی سسکیاں محسوس ہوئی تو رخ اس کے طرف موڑا اور اسے تھام کر اپنے پاس بیٹھایا۔

"تم یہ جاب نہیں چھوڑ سکتے۔۔۔" عارفہ نے اس کے ہاتھ تھام کر معصومیت سے کہا۔

"بلکل نہیں۔۔۔۔۔ جیسے تم۔۔۔۔۔ جیسے میری فیملی میری زندگی کا حصہ ہے۔۔۔۔۔ ویسی یہ جاب بھی میری زندگی کا حصہ ہے۔۔۔۔۔ مجھے اپنی جاب بہت عزیز ہے۔۔۔" شاویز نے ڈٹے انداز میں فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ عارفہ منہ بھسورتے ہوئے اٹھی اور اس کی پیٹھ اپنے جانب کر کے بقیہ حصے پر دوائی لگانے لگی۔ شاویز اس کی خفگی پر پھیکا مسکرا دیا۔



رات کے آخری پہر عارفہ نے کروٹ بدلتے ہوئے عنودگی میں ہاتھ بڑھایا تو بیڈ کا دوسرا حصہ خالی ملا۔ شاویز اپنے بیڈ پر نہیں تھا۔ ایک جھٹکے سے عارفہ نے آنکھیں کھولی۔ اٹھ کر بیٹھی اور نظریں گھما کر دیکھا۔ شاویز کمرے کے وسط میں کھڑا فجر کی نماز ادا کر رہا تھا۔ پٹی بندھے سر پر اس نے لمبی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کچھ پل اسے خاموشی سے اللہ کے حضور سجدہ کرتے دیکھا۔ پھر عارفہ اپنے بال باندھتے ہوئے اٹھی اور وضو کرنے واشر و م چلی گئی۔

جب وہ گیلے منہ ہاتھ کمرے میں واپس آئی تو شاویز نماز مکمل کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا۔ عارفہ نے اس کے دو قدم پیچھے دوسرا مصلحہ بچھایا۔ چادر چہرے کے گرد اوڑھی اور نماز پڑھنے لگی۔

شاویز کنکھیوں سے اس کے حرکات دیکھ رہا تھا۔ اپنے شریک حیات کو اپنے نقش قدم پر چلتے پا کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اسی انداز میں بیٹھا رہا جب تک کہ عارفہ نے نماز

پوری ادا کی اور دعا کر کے ہاتھ چہرے پر پھیرے۔ وہ اٹھ کر اپنا چادر اتارنے لگی تھی کہ شاویز نے آگے آکر اسے کندھوں سے تھام کر اس کے پیشانی پر بوسہ دیا۔

شوہر نیک اور پارسا ہو تو بیوی کو بھی نیک بنادیتا ہے۔

اس دن کے بعد عارفہ اور شاویز کم از کم فجر اور عشاء کی نماز ساتھ ساتھ کھڑے ہو کر ادا کرنے لگے۔



اس دوران سب اپنے اپنے حصہ کے وقت شاویز کی خدمت میں لگے ہوتے۔ ڈاکٹرز سے بھی وہ پابندی سے اپنا چیک اپ کرواتا رہا۔

اس کے سر کی پٹی اتر چکی تھی اور آپریشن کا زخم محلول ہونے لگا تھا۔ شاویز کو کبھی کبھی اپنے اسٹائل سے بنائے لمبے بال بہت یاد آتے۔ لیکن زندگی اسی کا تو نام ہے۔ انسان کو اپنے اگلے لمحے تک کی خبر نہیں ہوتی۔ کبھی ایسے حالات آ جاتے ہیں جس کا انسان نے تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔

صادق سر اور اس کے اپنے ایجنسی آفسران متواتر اس سے ٹیلیفونک رابطے میں تھے۔ دو ہفتوں کے بعد وہ خود سے اٹھ بیٹھ سکتا تھا۔ پھر بھی پاپا نے اسے زیادہ تر کمرے میں ہی آرام کرتے رہنے کی تائید کی ہوئی تھی۔

ایک شام وہ بیڈ پر ہی نیم دراز ہو کر بیٹھا اپنے لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا۔ سحر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ شاویز کو اپنے کسی فائل کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے

گھنٹی کا بٹن دبایا۔ عارفہ تیزی سے گیلے ہاتھ جھاڑتی کمرے میں آئی اور شاویز کا بتایا فائل شیلف سے نکال کر دیا۔

دوسری مرتبہ پھر ایسی ہوا تو سحر کے آبرو تن گئے۔ تیسری دفعہ بھی اس کے ہوتے ہوئے جب شاویز نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو سحر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ صوفے پر سے اٹھی اور پیر پٹختے ہوئے شاویز کے سامنے آئی۔

"مجھ سے کوئی مسئلہ ہے تمہیں۔۔۔۔۔ نہیں مجھ میں کانٹے لگے ہیں کیا۔۔۔۔۔ جب میں سامنے ہی بیٹھی ہوں تو بار بار بیل کیوں بجارہے ہو۔۔۔۔۔ مجھ سے کام کہنے میں پیسے لگ رہے ہیں تمہارے۔۔۔۔۔ یا میں نظر نہیں آرہی۔۔۔۔۔" سحر نے کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے اسے جھڑکا۔

ایک وہ دن تھا جب سحر شاویز کا اپنے سامنے رہنا بھی گوارا نہیں کر رہی تھی اور ایک آج کا دن ہے جہاں سحر کو شاویز کے نظر انداز کرنے پر برا لگ رہا تھا۔ پیار اور شفقت سے پرائے بھی

اپنے بن جاتے ہیں پھر ان دونوں میں جو ایک چیز مشترک تھی وہ دلاور پرویز خان کا خون تھا۔
ان کی رحم دلی تھی۔ ان کی اپنائیت تھی۔

"نہیں۔۔۔ مجھے لگا تم پڑھائی میں مصروف ہو۔۔۔۔ اس لیے تکلف دینا مناسب نہیں سمجھا۔۔۔" شاویز نے معصومیت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے اپنا دفاع کیا۔

سحر نے منہ بناتے ہوئے بیل کا بٹن اس کے پہلو سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"اب جب تک میں یہاں بیٹھی ہوں۔۔۔۔۔ خبردار بٹن کو ہاتھ بھی لگایا۔۔۔۔۔" سحر نے

ڈانٹتے ہوئے کہا۔

شاویز نے محظوظ ہوتے ہوئے سر جھٹکا اور لیپ ٹاپ بند کر کے سائیڈ پر رکھا۔

"سحر۔۔۔۔۔" شاویز نے مسکراہٹ دبائے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

اس کے پکارنے پر سحر نے بغور اسے دیکھا اور اس کے حکم کی تکمیل کرنے سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"جاوید کیسا ہے۔۔۔۔۔ کہاں ہے وہ۔۔۔۔۔ کئی دنوں سے ملنے بھی نہیں آیا۔۔۔۔۔" شاویز نے

انجان بنتے اسے چھیڑا۔

جاوید کا نام سن کر سحر کے تاثرات بدل گئے۔ وہ نظریں جھکا کر گود میں رکھے بند کتاب کو دیکھنے

لگی۔ اس کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

"مجھے کیا پتا کہاں ہے۔۔۔۔۔ تم خود پوچھ لو اُن سے۔۔۔۔۔" سحر نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"ہمممم۔۔۔ ان سے۔۔۔" اس نے دونوں لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا تو سحر چھنپ سی گئی۔ ہڑبڑا کر اٹھی اور باہر جانے لگی۔

"میں دیکھتی ہوں یہ عارفہ کہاں رہ گئی۔۔۔۔۔" تیزی سے کہتے ہوئے وہ شاویز سے نظریں ملائے بغیر گھنٹی کا بٹن اس کے پہلو میں رکھ کر دروازے کے پار نکل گئی۔ شاویز اس کے شرمانے کے انداز سے مسرور ہوتا واپس اپنے کام کے جانب متوجہ ہو گیا۔



چار ماہ تک سب کی بھرپور دیکھ بھال سے شاویز پوری طرح ٹھیک ہو چکا تھا۔ اس نے جاب پر جانا بھی بحال کر دیا تھا اور اس کے فوجیوں جیسے ایک اینج جتنے چھوٹے بال بھی اُگ آئے تھے۔

ایک دن عارفہ اور سحر ماسٹرز کے فرسٹ سمسٹر کے آخری پیپر سے گھر لوٹی تو لاؤنج میں چہل پہل کی آوازیں آتی سنائی دی۔ دونوں نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بظاہر عارفہ خود کو انجان دکھاتے ہوئے سحر کے پیچھے چلنے لگی۔ سحر حیرت بھری نظروں سے لاؤنج میں داخل ہوئی تو ایک دم رابعہ اس کے سامنے آگئی۔

"سرپرستز۔۔۔" رابعہ نے چہکتے ہوئے کہا۔

سحر رابعہ کو دیکھ کر شاک سی ہو گئی اور خوش دلی سے اسے گلے سے لگایا۔

"رابعہ۔۔۔۔۔ کیسی ہو۔۔۔۔۔" سحر نے خوشگوار حیرت سے اسے سرتاپر دیکھا۔

"میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو۔۔۔۔" رابعہ گرم جوشی سے اپنا احوال بتاتے ہوئے عارفہ سے ملنے لگی۔

"میں تو تم سے ناراض ہوں۔۔۔ میرے بھائی کی شادی میں کیوں نہیں آئی۔۔۔" سحر نے جعلی خفگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"سوری۔۔۔ بچوں کے ساتھ مصروف تھی۔۔۔ پر اب اپنے بھائی کی شادی کرانے آگئی ہوں۔۔۔" رابعہ نے مدافعتی انداز میں کہا۔ بھائی کی شادی کا لفظ سن کر سحر کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس نے کنکھیوں سے جاوید کو دیکھا وہ دوسرے جانب رخ موڑے بیٹھا شاوینز اور صائم سے گفتگو کر رہا تھا۔

"ااااووو۔۔۔۔۔ مطلب جاوید بھائی کی شادی۔۔۔۔۔" عارفہ نے شرارتی انداز میں سحر کو دیکھتے ہوئے رابعہ کا جملہ دوہرایا۔

"اور نہیں تو کیا۔۔۔۔۔ میں بھائی سے تین سال چھوٹی ہوں۔۔۔۔۔ پھر بھی شادی ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ دو بچے بھی ہیں۔۔۔۔۔ اور یہ ابھی تک سنگل بیٹھے ہے۔۔۔۔۔ اب تو اچھے خاصے سیٹل بھی ہو گئے ہے۔۔۔۔۔ اس دفعہ میں آئی ہوں تو شادی کر اکر ہی جاؤں گی ان کی۔۔۔۔۔" رابعہ سحر کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ لیئے سب کے بیچ لائی۔ سحر اور عارفہ نے سب کو سلام کیا اور حال احوال دریافت کیا۔

"سحر تم بھی دیکھو۔۔۔۔۔ انکل آنٹی نے جاوید کے لیے کچھ لڑکیاں پسند کر رکھی ہے۔۔۔۔۔ ہم سب ان میں سے ایک لڑکی فائنل کرنے کے بابت ہی اکھٹا ہوئے ہیں۔۔۔۔۔" شتاویز نے سنجیدہ انداز میں ارسلان انکل اور تہمینہ آنٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا مگر سحر کے مانو دل پر انگارے برسنے لگے۔ وہ متذبذب سی ہو کر ماما کے پاس بیٹھی۔ جاوید اس کے آمنے سامنے صوفے پر بیٹھا مسلسل اسے نظر انداز کتے ہوئے تھا۔ سحر کو بے چینی ہونے لگی۔

"واو آنٹی۔۔۔ یہ والی تو بہت خوبصورت ہے۔۔۔" عارفہ نے ایک تصویر دیکھتے ہوئے تعریف کر دی۔

"ہاں خوبصورت تو ہے۔۔۔۔۔ لیکن قد چھوٹا ہے۔۔۔۔۔ میرے جاوید کے ساتھ سوٹ نہیں کریں گی۔۔۔۔۔" تہمینہ آنٹی نے بھی تبصرے میں اضافہ کیا۔

عارفہ نے وہ تصویر سحر کے جانب بڑھائی لیکن اس نے بنا دیکھے ہی آگے ماما کو پاس کر دی۔
اس کی نظریں صرف جاوید پر ٹکی تھیں۔

"اتنے غیر جذباتی کیسے ہو سکتے ہے آپ۔۔۔۔۔ کیوں آپ کو میرے دل میں 11 سال سے
اپنی محبت نظر نہیں آتی جاوید۔۔۔۔۔" سحر نے دل میں شکوہ کیا۔

جاوید عوض مسکراتا ہوا لڑکیوں کی تصویریں دیکھتے سب کے تبصروں کی طرف متوجہ تھا۔

تہمینہ آنٹی نے پکارا تو سحر اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھ گئی۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور اس کے گرد بازو مائل کیا۔

"مجھے تو ہمارے جاوید کے لیے یہ لڑکی بہت پسند ہے۔۔۔۔۔ کیوں جی۔۔۔۔۔" انہوں نے سحر پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے میاں کو مخاطب کیا۔

"ہاں بھئی۔۔۔۔۔ یہ تو مجھے بھی پسند ہے۔۔۔۔۔" ارسلان صاحب نے بیگم کے ہاں میں ہاں ملائی۔

سحر کے تاثرات بدل گئے۔ وہ تعجب سے انہیں دیکھنے لگی۔

"اس لڑکی پر تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔۔۔" رابعہ نے خوشی سے اپنے حصے کا اضافہ کیا۔

سحر کا دل دھڑکنے لگا اسے ماحول تجسس بھرا لگنے لگا۔

"کیوں جاوید۔۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔" تہمینہ آنٹی نے جاوید کو مخاطب کیا۔ کب سے جا کر اب جاوید نے سحر کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں سے سحر بلبش کرنے لگی۔

جاوید نے کچھ کہنے کے بجائے آنکھوں کے اشارے سے اپنے والدین کو ہامی بھری۔

"دلاور صاحب۔۔۔۔ پھر آپ اپنی بیٹی ہمیں دینے کے لیے تیار ہے کیا۔۔۔۔" ارسلان صاحب کہتے ہوئے صوفے پر سے اٹھ گئے۔ ان کی پیروی کرتے ہوئے باقی سب نے بھی اپنی نشستیں چھوڑ دیں۔

"بیٹیاں تو پیدا ہوتے ہی۔۔۔۔ اپنا نصیب ساتھ لاتی ہے۔۔۔۔" دلاور صاحب چل سحر

کے پاس آئے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"سحر کے اس گھر سے جانے کا سب سے زیادہ دکھ مجھے ہی ہو گا۔۔۔۔ لیکن اس کا اپنا گھر بستا

دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی بھی مجھے ہی ہو گی۔" پاپا کی جذباتی باتیں سن کر سحر آبدیدہ ہو گئی۔

آنسو بہہ جانے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ سر جھکا کر آنکھوں کے بھگے کنارے

صاف کرنے لگی۔

"اور پھر جاوید تو لاکھوں میں ایک ہے۔۔۔۔ اسے اپنی بیٹی سو پننا میری خوش قسمتی

ہو گی۔۔۔۔" دلاور صاحب نے ہاتھ ہوا میں اٹھا کر جاوید کے جانب کیا تو وہ تیزی سے ان کے

پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر پاپا نے جاوید کا کندھا تھپتھپایا۔ جاوید شرمانے لگا۔ آج تک وہ اس فیملی

سے فیملی فرینڈ یا پولیس اہلکار کے نسبت سے ملتا آ رہا تھا۔ آج اس کا اس گھر سے نیا رشتہ جڑ رہا تھا۔

"تو پھر رشتہ مبارک ہو دلا اور صاحب۔۔۔۔۔" ارسلان صاحب آگے آئے اور دلا اور صاحب کے گلے ملے۔ وہی دوسری جانب عابدہ بیگم اور تہمینہ بیگم بھی آغوش گیر ہو کر مبارکباد پیش کرنے لگی۔ رابعہ اور عارفہ سحر کو شرماتے مسکراتی دیکھنے لگی اور آنکھ مار کر مبارکباد پیش کی۔

شاویز سب کے درمیان آیا اور ہاتھ ہوا میں بلند کر کے اعلانیہ صورت کنکارا۔

"تو پھر جھٹ پھٹ۔۔۔۔۔ ایک چھوٹی سی منگنی بھی کروادیں۔۔۔" اس نے شرارت بھری دلچسپی سے کہا۔

سحر تو گڑ بڑا گئی لیکن باقی سب خوشی سے چہک اٹھے۔

Visit For More Novels : www.urdunovelbank.com Page 893
E-mail pdfnovelbank@gmail.com WhatsApp [03061756508](https://wa.me/03061756508)

"تمہیں کیا لگا۔۔۔۔۔ سر پر انز منگنی کروانا صرف تمہیں آتا ہے۔۔۔۔۔ میں نے کہا تھا نا۔۔۔۔۔ صبر کر little sister۔۔۔۔۔ میری باری ابھی رہتی ہے۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔

پھنسا دیا نا۔۔۔" شاویز نے شرارتی انداز میں آبرو اچکا کر جتایا۔

سحر کے پیشانی پر بل نمودار ہوئے۔

"ویسے۔۔۔ اگر تمہیں جاوید نہیں پسند تو مجھے بتادو۔۔۔۔ میں یہ منگنی رکوادوں گا۔۔۔"

اس نے سحر کے گرد چکر کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیا کر لو گے۔۔۔۔۔ پاپا کے فیصلے کے خلاف جاو گے۔۔۔۔۔" سحر نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"ہمممم نہیں۔۔۔۔۔ وہ تو نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ پرہاں۔۔۔۔۔ تمہارا کہی اور رشتہ ہونے تک۔۔۔۔۔ جاوید کو غائب کر ادوں گا۔۔۔۔۔" گھومتے ہوئے شاوینز سحر کے بالکل سامنے آگیا۔ عارفہ کچھ فاصلے پر کھڑی ان بھائی بہن کی نوک جوک سے مسرور ہو رہی تھی۔

"اوہیلو مسٹر۔۔۔۔۔ خبردار میرے جاوید کو کچھ کیا تو۔۔۔۔۔" سحر نے انگلی اٹھا کر سختی سے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

شاوینز کے آبرو پھیل گئے۔

"میرے جاوید۔۔۔۔۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں ہلکا سا جھک کر کمر پر ہاتھ باندھ کر سحر کے الفاظ دوہرائے۔

سحر کو احساسِ ندامت ہوا تو نظریں جھکا گئی۔

عارفہ ہنستے ہوئے آگے آئی اور شاویز کے کندھے پر کہنی رکھی۔

"مائی ڈیر husband ---- آپ نے ان محترمہ کو پھنسا یا نہیں ہے ---- بلکہ ان کا کام آسان کر دیا ---- پچھلے گیارہ سال سے یہ اس انتظار میں تھی ---- کہ کب جاوید کو اس کی محبت کا احساس ہو گا اور وہ اسے پروپوز کریں گا ----" عارفہ نے سحر کاراز افشاں کرتے ہوئے بتایا۔ سحر دانت پیستے ہوئے اسے آنکھیں دکھانے لگی۔

"جانتا ہوں ---- ہمیشہ خوش رہنا ----" شاویز نے معصومیت سے سحر کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

"ویسے تو جاوید بہت سمجھ دار ہے ---- لیکن کبھی اگر تنگ کیا ---- تو ڈائریکٹ مجھے آکر بتانا ---- تب تو اسے لازمی غائب کرادوں گا ----" شاویز نے ہنستے ہوئے مزید شرارت

"مما۔۔۔۔۔ رنگ میرے پاس ہے۔۔۔۔۔ میں ابھی لایا۔۔۔۔۔" شاویز نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"شاویز نے ہیرے جیسا لڑکا چننا ہے ہماری شہزادی کے لیے۔۔۔۔۔" عابدہ بیگم نے سحر کی نظر اتارتے ہوئے جاوید کی تعریف کی پھر عارفہ کو ہدایت دے کر باہر نکل گئی۔ ممما کی بات نے سحر کو سوچ میں ڈال دیا تھا۔ اس کی پریشانی محسوس کر کے عارفہ اس کے ڈوپٹے کا پہلو ٹکاتے ہوئے ہلکے آواز میں وضاحت دینے لگی۔

"شاویز نے پاپا اور ممما کو تمہارے جاوید کے لیے جذبات سے آگاہ کیا۔۔۔۔۔ پھر جاوید اور ان کی فیملی کو بھی اس رشتے کے لیے شاویز نے قائل کیا۔۔۔۔۔ رابعہ کو لانے سے لیکر انجان

لڑکیوں کی تصاویر دکھانے تک اور پھر آنٹی کا تمہیں انتخاب کرنے تک۔۔۔۔۔ ساری اداکاری کی پلاننگ شاویز کی تھی۔۔۔۔۔" عارفہ نے نرمی سے اسے سچائی بتائی۔

"شاویز نے ہمیں تمہیں یہ بات بتانے سے منع کیا تھا کہ یہ سب اس کا آئیڈیا ہے۔۔۔۔۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔۔۔۔۔ کہ تم یہ سب اس کا احسان سمجھو۔۔۔۔۔" اس کے بازو کو تھام کر عارفہ کمرے سے باہر بڑھنے لگی۔ سحر کے دل میں شاویز کے لیے محبت اور احترام میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

دروازے کے پار سب سے پہلے سحر کو شاویز دکھا۔ وہ آنکھوں میں محبت۔ عزت۔ اپنائیت۔ مشکور ہونے کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہارے خواہش پوری کرنے کے لیے مجھے تھینکس بعد میں کہہ دینا۔۔۔" شاویز سحر کے دیکھنے کا انداز سمجھ گیا تھا۔ سحر نے ہنہ کرتے سر کو جنبش دیتے ہوئے رخ پھیر لیا اور لاؤنج کی طرف روانہ ہو گئی۔



سحر کو آتے دیکھ کر سب اس کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔
سحر بلش کرتی ہلکا مسکراتی نظریں جھکائے شاویز اور عارفہ کے ہمراہ چلتی سب کے پیچ آئی اور جاوید کے ساتھ بڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔
پاپا اور ماما خوش دلی سے اپنی پری کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماء رہے تھے۔

تہمینہ آنٹی نے جاوید کو سحر کو انگھوٹی پہنانے کے لیے دی۔ جاوید نے مستحکم بھرے انداز میں سحر کا ہاتھ تھامنے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ سحر نے متذبذب سی ہو کر اپنا ہاتھ آگے کیا۔ جب جاوید نے اس کا ہاتھ پھاما اور انگھوٹی پہنانے لگا تو سحر کا دل دھڑکنے لگا اس کا ہاتھ کانپنے لگا تھا لیکن جاوید کے گرفت میں ہونے کے باعث لرزش نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کے بہ نسبت جاوید نے با اعتماد انداز میں فوراً اسے ہاتھ آگے کیا اور سحر نے اسے انگھوٹی پہنا دی۔ ماحول تالیوں سے گونج اٹھا۔ اب ایک ایک کر سب ان دونوں کو مٹھائی کھلانے لگے۔ شاویز اور صائم اپنے موبائل میں تصویریں لیتے ہوئے اس لمحے کو یادگار بنانے لگے تھے۔

آخر میں شاویز آیا اور جاوید کے ساتھ بیٹھ کر اسے مٹھائی کھلانے لگا۔ آدھا گلاب جامن اسے کھلا کر اس نے بقیہ حصہ اپنے منہ میں ڈالا۔

"سنا ہے دلہے کا جھوٹا کھانے سے۔۔۔۔۔ جلدی شادی ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔" اس کی شرارت بھری نظریں دوسرے سائیڈ پر کھڑی عارفہ پر مرکوز تھی۔ عارفہ سپاٹ تاثرات بنائے شاویز کو گھورنے لگی۔

"تو کیا آپ کا دوسری شادی کرنے کا ارادہ ہے جناب۔۔۔۔۔" جاوید نے اس کے اشارے کی تصحیح کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

شاویز اسی شریر انداز میں جاوید کے جانب متوجہ ہوا۔

"آئیڈیا برا بھی تو نہیں ہے۔۔۔۔۔ سحر اس گھر سے چلی جائے گی۔۔۔۔۔ تو عارفہ اکیلی ہو جائے گی۔۔۔۔۔ اکیلے اتنا بڑا گھر کیسے سنبھالے گی۔۔۔۔۔ اچھا ہے نا۔۔۔۔۔ اس کا ہاتھ بٹانے کوئی اور بھی ہو۔۔۔۔۔" شاویز جیسے پلاننگ کرتے ہوئے سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

عارفہ کو غصہ آنے لگا وہ منہ بھسورتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

شاوینز اور جاوید آپس میں ہنسنے لگے۔ سحر کو اپنی بیسٹ فرینڈ پر ایسا تبصرہ اچھا نہیں لگا اس نے تنے ہوئے اعصاب سے اسے دیکھا۔

"ناراض کر دینا۔۔۔۔۔ کیا ضرورت تھی ایسا بولنے کی۔۔۔۔۔" سحر نے برا منا کر کہا۔

"ایسی چھوٹی موٹی نوک جوک سے میاں بیوی کا پیار بڑھتا ہے۔۔۔۔۔" جواب جاوید کی جانب سے ملا۔

سحر بد لے میں چپ ہو گئی۔ وہ اب تک جاوید کے ساتھ اتنا فری نہیں ہو سکی تھی کہ ایسے کھل کر بات کر سکے۔



جاوید اور ان کے گھر والوں کو رخصت کرتے وقت بھی عارفہ مسلسل شاویز کو نظر انداز کر رہی تھی۔ شاویز محظوظ ہوتے ہوئے مسکراہٹ دبائے ہوئے کھڑا تھا۔ اسے عارفہ کو تنگ کرنے میں مزا آرہا تھا۔

کمرے میں آنے تک بھی عارفہ کاموڈ بگڑا ہوا تھا۔ وہ سارے کام مکمل کر کے آدھی رات کمرے میں آئی تو شاویز وہاں نہیں تھا۔ عارفہ حیرانگی سے اس پاس دیکھنے لگی تھی لیکن پیچے سے اچانک کسی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی۔ عارفہ نے ہڑبڑا کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر محسوس کیا تو شاویز کو پا کر خوفزدہ نہیں ہوئی۔

شاویز نے عارفہ کے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے گود میں اٹھالیا۔

"شاویز۔۔۔۔۔ کہاں لے جا رہے ہو۔۔۔" عارفہ نے متفکر انداز میں پوچھا۔

"My highness!۔۔۔۔۔ تھوڑا صبر رکھو۔۔۔۔۔ خود پتا چل جائے گا۔۔۔۔۔" شاویز اسے گود میں اٹھائے ہی کمرے سے باہر لے آیا اور لاؤنج کو عبور کرتا ہوا اپنی کار میں بیٹھا دیا۔

عارفہ نے مضطرب سی ہو کر پھر سے پوچھنا چاہا پر شاویز نے ٹوک دیا۔

ریسٹورینٹ کی طرف جانے کے بجائے وہ لفٹ کے اندر داخل ہوا۔ اگر اس وقت وہ دونوں

میاں بیوی نہ ہوتے تو عارفہ بہت گھبرا جاتی اور اس کے ساتھ جانے سے منع کر دیتی۔ لیکن اس وقت وہ اپنے سر پناہ اپنے محافظ کے ساتھ ہی تھی

دوسرے منزل پر وہ ایک کمرے کے سامنے آئے۔ شاویز نے جیب سے ایک عدد کارڈ نکالا اور دروازے کے درز میں دیا تو دروازہ کھلتا گیا۔

پہلے شاویز اندر گیا اور لائٹ آن کی۔ عارفہ نے اپنے قدموں سے لیکر کمرے کے آخری حصہ تک گلاب کی پیتیاں بچھی پائی۔ جگہ جگہ خوشبودار موم بتیاں سجائی گئی تھیں۔ بیڈ پر بہت سے سرخ کلر کے ہارٹ والے غبارے پھیلائے ہوئے تھے۔ عارفہ نے سینڈل وہی اتاری اور محفوظ ہوتے ہوئے ننگے پیر گلاب کے پتیوں پر چلنے لگی۔ کمرے کے بیچ تک آکر اس نے ایڑیوں کے بل گھوم کر پورے کمرے کی سجاوٹ دیکھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھکھلا رہا تھا۔

شاویز نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر ہلکے سپیڈ سے چھت پر لگا پھنکا آن کیا تو کچھ پتیاں عارفہ پر
گرنے لگی۔ وہ ہاتھ ہوا میں بلند کر کے آنکھیں موندھے گول گول گھومنے لگی۔ محبت کے
احساس سے وہ جھوم گئی تھی۔

"شاویز یہ سب کس لیے۔۔۔" عارفہ نے چمکتے ہوئے پوچھا۔ نہ آج اس کی سا لگرہ تھی نہ شاویز کی نہ ہی شادی کی سا لگرہ نہ کوئی اور خاص دن

"بس یوں ہی۔۔۔۔۔ دل کر رہا تھا۔۔۔۔۔ یاد ہے پہلی بار اس ہوٹل میں ہم انجان ہوتے ہوئے ڈیٹ پر آئے تھے۔۔۔۔۔ اور آج سچ مچ کے کپل بن کر آئے ہیں۔۔۔۔۔" شاویز نرمی سے کہتا ہوا اس کے پاس آیا اور پیچھے سے عارفہ کے گرد بازو مائل کرتے ہوئے کہا۔ عارفہ نے شاویز کے رومینٹک انداز سے مسرور ہوتے ہوئے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ دیا۔

عارفہ نے مسکراتے ہوئے ان لمحوں کو یاد کیا۔ شاویز نے اسی طرح بانہوں میں لیئے ہوئے عارفہ کے بال پیچے کر کے اس کے گردن پر بوسہ دیا۔ عارفہ نے سانس روک کر آنکھیں بند کی۔ پھر شاویز نے اس کا رخ اپنے جانب کیا۔

"تمہاری جگہ میری زندگی میں کوئی نہیں لے سکتا۔۔۔" شاویز نے اپنی شام والی حرکت کی وضاحت دی۔

"تم میری اکلوتی اور سب سے عزیز بیوی ہو۔۔۔۔۔ اور تاحیات رہو گی۔۔۔۔۔" اس نے اپنے پیار کی یقین دہانی کروائی۔

عارفہ اس کے محبت سے سرشار ہوتے۔ اس کے رومینٹک انداز سے مسرور ہوتے اس سے لپٹ گئی۔ شاویز نے پورا اسے اپنے حصار میں لے لیا اور اس کے ایک ایک نقش چومنے لگا۔



6 ##### ماہ بعد #####

پانچ سال سے اپنے ایجنسی کے لیے خدمات سرانجام دے کر شاویز کی پروموشن ہو گئی۔ وہ
کیپٹن کے عہدے پر آگیا۔ اسے سرکار کے جانب سے کراچی کینٹ میں گھر اور گاڑی دی گئی۔
اس نے گاڑی تو منظور کر لی البتہ فلحال اپنے فیملی کے ساتھ ہی رہنا چاہا۔



"کیسے ہو سلطان۔۔۔۔" شاویز نے ڈٹے آواز میں اسے مخاطب کیا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ہونے والی فریگی تبدیلیوں میں اس کی آواز کا رعب دار ہونا بھی شامل تھا۔ سلطان نے اس کے سوال کو بے رخی سے نظر انداز کر دیا۔

شاویز نے پھیکا مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔ اسے سلطان کے جہالت پر افسوس ہونے لگا۔

"کیا مل گیا ایسا کر کے۔۔۔۔ میں بچ گیا۔۔۔۔ عمران خٹک پر کروائی بھی چل رہی

ہے۔۔۔۔۔ نقصان کس کا ہوا۔۔۔۔۔ تمہارا اپنا۔۔۔۔۔ میری توپروموشن ہو گئی۔۔۔۔۔

قید میں تم پھنس گئے۔۔۔۔۔" اب کی بار شاویز کا لہجہ نرم اور دوستانہ تھا۔

"وہ مثال تو سنی ہوگی۔۔۔ جو دوسروں کے لیے کھڑا کو دتا ہے۔۔۔۔۔ خود اسی میں گر جاتا

ہے۔۔۔۔۔چندر قم کے لیے تم نے اپنا پورا کیرئیر تباہ کر دیا۔۔۔" شاویز کے ہمدردی سے بے

مروتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلطان رخ دیوار کی جانب کر کے بیٹھا تھا۔ جواب دینے کے موڈ

میں وہ اب بھی نہیں تھا۔

"خیر۔۔۔ میں دعا کروں گا۔۔۔ تمہاری قید آسان گزرے۔۔۔ اور تمہاری فیملی تمہیں
شہید سمجھ کر صبر کر لیں۔۔۔" شاویز سرد سانس خارج کی اور دروازے کا پھٹ بند کر کے
آگے روانہ ہو گیا۔



دورے سے شاویز اپنے فلیٹ آگیا تھا۔ اس فلیٹ کو اب شاویز اپنے چھوٹے آفس کے طور پر
استعمال کیا کرتا۔ جب اسے کسی ضروری کیس پر فرصت سے کام کرنا ہوتا۔ وہ فلیٹ آجایا
کرتا۔ کبھی کبھار جب عارفہ میکے گئی ہوتی وہ رات بھی فلیٹ میں رہ جاتا۔



عارفہ اس کے فارغ ہونے کے انتظار میں ادھر ادھر ہوتی رہی۔ اسے شاویز کو ساتھ لیئے سحر اور جاوید کے ساتھ جا کر تصویریں کھنچوانی تھی۔ عارفہ ہاتھ سینے پر باندھے بے دلی سے میڈیا کے جانب دیکھ رہی تھی جب اس کے پاس کوئی آکر کھڑا ہو گیا۔

"چڑیل آخر چمڑ ہی گئی نامیرے دوست پر۔۔۔۔۔" لاریب نے اپنا مخصوص جملہ دوہرایا۔

عارفہ اسے دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔ لاریب سوٹ بوٹ میں ملبوس باوقار بزنس مین لگ رہا تھا۔

"لاریب سبب۔۔۔۔۔ کیسے ہو۔۔۔۔۔ what a pleasant surprise

کہاں تھے۔۔۔۔۔" وہ اس کی موجودگی سے محظوظ ہوتے ہوئے اس کا حال احوال دریافت کر رہی تھی۔

شاویز نے بھی لاریب کو دیکھا تو میڈیا والوں سے معذرت کرتا وہاں آیا اور لاریب کا اچھے سے استقبال کیا۔

"کیپٹن صاحب۔۔۔۔ آپ کی تو بڑی تعریفیں سنی ہے۔۔۔۔" لاریب نے شاویز سے ملتے ہوئے کہا۔

"ویسے تم دونوں کی شادی کا سن کر بہت خوشی ہوئی۔۔۔" اس نے شاویز اور عارفہ کو کپل کے طور دیکھ کر خوش دلی سے کہا۔ پھر وہ تینوں اسی طرح باتیں کرتے شاویز کی فیملی سے ملنے بڑھ گئے۔

رابعہ اور عارفہ نے سہیلی کا کردار نبھاتے ہوئے دودھ پلائی کی رسم میں جاوید کی جیب خالی کر کے رکھ دی تھی۔

رخصتی کے وقت سب نے اشک بار آنکھوں سے سحر کو رخصت کیا۔ صائم ہمیشہ جتنا سحر کے جانے کی خوشی مناتا تھا آج حقیقت کی دوری سے سب سے زیادہ وہ رویا تھا۔



سحر کا رشتہ پکا ہونے کے بعد بھی جاوید سے ایسا خاص رابطہ نہیں رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ دوستانہ بن پاتی۔ اس کا جاوید سے گھبراہٹنا شرمناک بھی برقرار تھا۔ اس وقت وہ مضطرب سی جاوید کے سچے ہوئے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کی دھڑکن اتنی تیز تھی مانو اس کا دل باہر آجائے گا۔

جاوید تہذیب سے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ سحر اپنی لرزش قابو کرنے مٹھیاں سختی سے مینچھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

جاوید اس کے پہلو میں آکر بیٹھا۔ سحر پھر بھی سر جھکائے ہوئے تھی۔ جاوید، سحر کا چہرہ اوپر کرنے کے بجائے خود ہلکا سا نیم دراز ہو کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ سحر نے ایک جھوٹی نظر جاوید کے جانب دیکھا دونوں کی نظریں آپس میں ملی تو سحر بلش کرنے لگی اور رخ پھیر لیا۔ جاوید کھل کر مسکراتا ہوا سیدھا اور سحر کے قریب کھسکا تو اس کی سانس رکنے لگی۔

"آج بھی صرف شرماتی رہو گی یا۔۔۔۔۔ کچھ کہو گی بھی۔۔۔۔۔" جاوید نے اپنے نئی نویلی دلہن کے تیار سراپے کو سرتاپیر دیکھتے ہوئے کہا۔

سحر چھنپ سی گئی۔

"کیا کہو۔۔۔۔۔" سحر جاوید کے رقت سے کنفیوز ہونے لگی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔

"وہی جو اتنے سالوں سے دل میں چھپا کر رکھا ہے۔۔۔۔۔" جاوید نے مدھم آواز میں سرگوشی کی۔ وہ اب ہاتھ بڑھا کر سحر کے چہرے پر آتے لٹوں کو سنوار رہا تھا۔

"تو۔۔۔۔۔ جاوید میری دل کی بات جانتے ہے۔۔۔۔۔ کیا وہ بھی مجھ سے پیار۔۔۔۔۔"

جاوید کی بات پر سحر کو شک سا لگا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

جاوید کی انگلیاں جیسے جیسے سحر کے رخسار پر لگ رہی تھیں سحر کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا تھا۔

"آپ بھی تو کچھ کہہ سکتے ہیں۔۔۔" سحر نے پہلی بار ایک معصومانہ خواہش کی۔

جاوید کچھ لمحے خاموش ہوا اور پھر ایک جھٹکے سے سحر کو بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

اس کے سینے سے لگ کر سحر نے آنکھیں مینجھ لی۔

زبان سے کہنے کے بجائے جاوید اسی طرح گلے لگائے ہوئے ہی سحر کے کندھے پر اپنے پھوروں سے کچھ عبارت بنانے لگا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی انگلی کو I کی شکل میں جنبش دی۔ سحر کسماسی گئی۔ آنکھیں موندھے تیز سانس لیتے اس نے جاوید کے گرد بازو مائل کئے۔ پھر اسی طرح کرتے کرتے جاوید کی پھوریں دوسری عبارت نقش کرنے لگی LOVE - سحر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ ان عبارت کو سمجھ بھی گئی تھی اور محسوس بھی کر سکتی تھی۔ آخر میں YOU اور U کی شکل تکمیل دیتے ساتھ ہی جاوید نے اپنے لب سحر کے کندھے پر لگا دیئے۔ سحر کے لبوں سے ایک سسکی نکلی لیکن فوراً آواز روکنے اپنا نچلا لب دانتوں میں دبا دیا۔ خوشی سے سرشار اس کا دل جھوم رہا تھا۔ جسے اس نے بچپن سے چاہا اس کے دل میں اپنی محبت پا کر۔ اس کے اظہار کے ایسے انھو کے طریقہ کار سے سحر کی زندگی میں خوشیوں کی بہار آگئی تھی۔ جاوید کی حصار میں آکر اس کی محبت سے سرشار ہوتے سحر کا گھبراہٹ

ختم ہو گیا تھا اس کی لرزش تھم گئی تھی۔ اسے اس کی محبت مل گئی تھی۔ قسمت نے جاوید کو زندگی بھر کے لیے اس کا کر دیا تھا۔



صبح جب جاوید کی آنکھ کھلی تو سحر آئینہ کے سامنے کھڑی گیلے بال سکھا رہی تھی۔ جاوید نے اپنی زندگی کی نئی روشن صبح کو خوب خوش دلی سے ویلکم کیا۔ وہ اسی سمت کروٹ پر لیٹا آئینہ میں سحر کے پُر نور چہرے کا عکس دیکھ رہا تھا جب سحر کو اس کی نظریں خود پر جمی محسوس ہوئی۔ وہ متذبذب سی ہو گئی۔

"گڈ مارنگ۔۔۔۔۔" سحر کا بالوں میں چلتے برش کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔

"گڈ مارننگنگ۔۔۔۔" جاوید نے بیڈ پر سے اٹھ کر سستاتے ہوئے کہا۔

سحر کی اس طرف پشت تھی۔ جاوید اس کے قریب آیا اور اس کے گرد بازو مائل کئے۔ سحر نے بلش کرتے ہوئے نظریں نیچی کر لی۔

"تمہیں پتا ہے سحر۔۔۔۔ تمہارا مجھ سے یوں شرمانا۔۔۔۔ تمہاری یہ حیا یہ لاج شرم۔۔۔۔ مجھے ہمیشہ سے تمہارے جانب راغب کرتا رہا ہے۔۔۔۔" جاوید نے نرمی سے اسے اپنے دل کے راز بیان کئے۔

"میری ہمیشہ سے خواہش تھی۔۔۔۔ کبھی میری شادی ہو۔۔۔۔ تو ایسی ہی عاجز لڑکی سے ہو۔۔۔۔" اس نے سحر کو کندھوں سے تھام کر اس کا رخ اپنے جانب کیا۔

"میں چاہتا ہوں۔۔۔۔ تم اپنی یہ عادت برقرار رکھو۔۔۔۔ کیونکہ مجھے بہت پسند ہے۔۔۔۔ میں اس عاجزی پر فدا ہوں۔۔۔۔" جاوید نے اپنی خواہش ظاہر کی جس پر سحر نے ہامی بھرتے

ہوئے سرائیات میں ہلایا۔ جاوید خوشی سے سرشار، مشکور ہوتے ہوئے اس کے پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے فریش ہونے بڑھ گیا۔ سحر محبت اور اپنائیت کے ملے جلے تاثرات سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔



جب بھی سحر کو گھر کی یاد آتی جاوید اسے میکے لے آتا۔ وہ ایک زمہ دار شوہر ہونے کی پوری زمہ داری نبھاتا تھا۔ سحر اور جاوید اب بھی عاجز اور خاموش مزاج کیل تھے اور وہ اسی میں خوش تھے۔

اس دن بھی سحر گھر آئی ہوئی تھی۔ جب شاویز کسی اہم کیس کی وجہ سے پریشان اور سنجیدہ انداز میں گھر میں داخل ہوا۔

شاویز نے پروفیشنل اور پرسنل لائف الگ الگ کر کے رکھی تھی۔ نہ وہ کبھی پروفیشنل پریشانی گھڑلاتا اور نہ پرسنل مسئلہ ہیڈ کوارٹرز لے کر جاتا۔ گھر میں وہ عام آدمی جیسا رہتا اور دفتر میں با اعتماد رعب و دبدبہ کا حامل کیپٹن۔

لاؤنج میں داخل ہوتے جب اس نے سحر کو دیکھا تو مزاج خوشگوار بنا لیئے۔ اس سے اچھے سے ملا پھر کمرے میں جا کر یونیفارم چینج کیا۔ ڈنر کے وقت جاوید بھی سحر کو لینے آ گیا تھا۔ سب کے ساتھ مل کر خوش گپیاں کرتے ہوئے ڈنر کیا۔ شاویز ان کے جانے تک ان کے ساتھ رہا۔



ان دنوں موسم سرما اپنے تاب پر تھی۔ کراچی میں بھی صبح صادق کے وقت ٹھنڈی ہوائیں چلتی۔

عارفہ کو سوتے ہوئے سردی محسوس ہوئی تو کمرے کا آے سی بند کرنے اٹھی لیکن اس نے

شاویز کا بیڈ خالی پایا۔

"یہ کہاں چلا گیا اتنی صبح صبح۔۔۔۔۔" عارفہ نے حیرت سے سوچا۔

پیروں میں چپل پہن کر وہ کندھوں کے گرد گرم شال اوڑھ کر باہر آئی۔ لاؤنج میں جھانکا، کچن میں دیکھا۔ لان میں بھی چکر لگایا لیکن شاوینز کہی نہیں ملا۔ فون کر کے دیکھتی ہوں؛ سوچتے ہوئے وہ متفکر ہو کر واپس کمرے میں جانے لگی تھی کہ اس کی نظر ہوا سے کھلتی بند ہوتی ٹیرس کے دروازے پر پڑی۔

وہ ہنہ کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو شاوینز سامنے راکنگ چیئر پر بیٹھا اسے جھلاتا ہوا مشرق کے جانب دیکھ رہا تھا۔

"تم یہاں بیٹھے ہو۔۔۔ اور میں پورے گھر میں ڈھونڈ رہی ہوں۔۔۔۔ کیا کر رہے ہو اس وقت یہاں۔۔۔" عارفہ نے شاویز کے قریب جا کر منہ بناتے ہوئے کہا۔

شاویز کی نظریں طلوع ہوتے آفتاب پر مرکوز تھیں۔ اس کے چہرے پر تسکین بھری مسکراہٹ تھی۔ اس نے ایک نظر عارفہ کو دیکھا پھر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ بیٹھایا۔

"صبح ہوتے دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔ وہ صبح جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔۔۔۔۔ وہ صبح جس کی خواہش میری ماں نے کی تھی۔۔۔۔۔ لیکن انہیں نصیب نہ ہو سکی۔۔۔۔۔" شاویز نرم لہجے میں آفتاب کو نکلتے دیکھ رہا تھا۔

عارفہ اس کے کندھے پر سر رکھے اسی سمت دیکھنے لگی۔

"وہ صبح۔۔۔۔۔ جو اتنی روشن ہوگی میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔۔۔۔۔ وہ صبح۔۔۔۔۔ جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔" اپنے ماضی کو یاد کر کے وہ پھیکا مسکرایا

"بے شک اللہ انسان کو بہترین سے نوازتا ہے۔۔۔۔۔ یہ ہم انسانوں کی فطرت ہے جو جلد بازی میں رہتے ہیں۔۔۔۔۔ جو ہمارے نصیب میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنے صحیح وقت پر ہمیں مل ہی جاتا ہے۔۔۔۔۔" شاویز لمبی سانس لیتے ہوئے کچھ پل خاموش ہوا۔

"میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں۔۔۔۔۔ جنہوں نے مجھے یہ صبح عطا فرمائی۔۔۔۔۔ جہاں میرے پاس میرے اتنے خاص رشتے ہیں۔۔۔۔۔" وہ اب ایک ایک کر کے اپنی موجودہ نعمتوں کو یاد کرنے لگا اور عارفہ سورج کو دیکھتے، جو پورا طلوع ہو چکا تھا، اسے سن رہی تھی۔

"اتنا پیار کرنے والے پایا ملے گیں۔۔۔۔ سگی ماں جیسی فکر کرنے والی ماما۔۔۔۔ شرارتی
چھوٹا بھائی صائم۔۔۔۔ حساس بہن سحر۔۔۔۔ بااخلاق دوست جاوید۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔"

شاويز اور کہتے ساتھ خاموش ہو گیا۔

آفتاب اب پورا چمک رہا تھا۔ عارفہ نے کچھ پل اس کے گویا ہونے کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں بولا تو سراٹھا کر رخ اس کی جانب کیا۔

ہیں۔۔۔۔۔ پھر انہیں اجر بھی بہترین ہی ملتا ہے۔۔۔۔۔" عارفہ نے شاویز کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اسے تسکین دلائی۔ وہ اس کی بات پر ہامی بھرتے ہوئے سر کو جنبش دیتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"اب تو ایک رشتے کی کمی ہے۔۔۔۔۔ جو مجھے صرف تم دے سکتی ہو۔۔۔" شاویز نے دروازے کے پاس رک کر معصومیت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے اسے دیکھا۔ اس کے نظروں سے عارفہ متذبذب ہونے لگی۔

"کونسا۔۔۔" اس نے حیرت اور فکر مندی سے آبرو ملا کر سوچنے کے انداز میں پوچھا۔

شاویز شریرا انداز میں مسکرایا۔

"باپ بننے کا۔۔۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں ہلکا سا جھک کر اپنی خواہش ظاہر کی تو عارفہ کے آبرو پھیل گئے آنکھیں بڑی ہو گئی۔ وہ بلش کرتے ہوئے رخ پھیر گئی۔

"دوگی یہ رشتہ۔۔۔" شاویز نے اس کے ہاتھ پر دباؤ دے کر تصدیق چاہی تو عارفہ نے شرماتے ہوئے سر اثابت میں ہلایا۔ شاویز نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے سینے سے لگالیا۔



سال بعد ##### 5

32 سالہ جوان میجر شاویز صبح سویرے یونیفارم میں تیار ہوا۔ با اعتماد انداز میں چلتے وہ اپنے کینٹ کے چھوٹے سے نفیس گھر سے باہر آیا تو دونوں جوان فوجی اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ شاویز کو آتے دیکھ کر وہ دونوں نوجوان سیدھے ہوئے اور ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سیلوٹ کیا۔

شاویز ان کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔ بہت سی ماضی کی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ اسے وہ وقت یاد آگیا تھا جب کرنل صادق صاحب کے ساتھ ایسی ہی گاڑی میں جاتے ہوئے اس نے اس دن کی خواہش کی تھی۔

ایک سال پہلے شاویز کیپٹن کے عہدے سے میجر کے عہدے پر آگیا تھا۔ وہ اور عارفہ اپنی چار سالہ چھوٹی بیٹی زرتاشہ کے ساتھ کینٹ میں قیام پذیر تھے۔

شاویز نے اپنی بیٹی کا نام اس لیے زرتاشہ رکھا کیونکہ اسے زرتاشہ نین نقش میں اپنی ماں زرتاج کی مشابہہ لگتی۔ اس کی گہری آنکھیں لمبے گھنے بال زرتاج سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ اسے اپنی بیٹی کے روپ میں زرتاج واپس مل گئی تھی۔

صائم نے ماسٹرز کی ڈگری پوری کر کے پاپا کا ہاتھ بٹانے بزنس کا رخ کیا اس لیے وہ MBA کرنے امریکہ گیا ہوا تھا۔ عارفہ دن میں اپنے کینٹ والے گھر کے کام مکمل کر کے زرتاشہ کو لیے دلاور صاحب کے گھر آجایا کرتی۔ صائم کے بعد زرتاشہ اس فیملی کی چھوٹی بچی تھی اس لیے سب کی عزیز تھی۔ سحر اور جاوید کا بھی دو سالہ بیٹا تھا لیکن وہ تو کبھی کبھار آیا کرتا۔ جبکہ اب اس گھر کی شہزادی ہونے کا لقب زرتاشہ نے اپنے نام کر رکھا تھا۔ عابدہ بیگم اور دلاور صاحب کا اپنی پوتی کے ساتھ بہت ٹائم پاس ہو جاتا۔ دلاور صاحب آفس سے جلدی گھر آجایا کرتے تاکہ زرتاشہ کے ساتھ کھیل سکے۔ زرتاشہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت شرارتی

بھی تھی۔ کبھی کبھی تو عارفہ کے لیے اسے اکیلے سنبھالنا مشکل ہو جایا کرتا لیکن شاویز کے آتے ہی وہ تہذیب سے رہتی تھی۔



عمیوان صدر میں آج سب معزز شخصیات اعزازات سے نوازنے کے بابت اکٹھا کیئے گئے تھے۔ دلاور صاحب اپنی فیملی کے ہمراہ تیسری قطار میں بیٹھے تھے۔ عارفہ بار بار زرتاشہ کو تہذیب سے رہنے کی تلقین کرتی مضبوطی سے گود میں بیٹھائے ہوئے تھی۔ سحر اور جاوید بھی ان کی قطار میں تشریف فرما تھے۔ سحر ویڈیو کال پر صائم کو وہاں کی تقریب دکھا رہی تھی۔ تقریب میں صدر مملکت کے ہاتھوں ملک کے خدمت گزاروں کو اعزاز سے نوازا جا رہا تھا۔

میجر شاولیز کے اس خاص دن کو مزید روشن کرنے ریٹائرڈ بریگیڈئیر صادق صاحب بھی ہال میں موجود تھے۔

شاويز اپنے ساتھی آفسران کے ہمراہ یونیفارم میں تیار فوجیوں کے قطار میں بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔

"اب میں جس نوجوان کو بلانے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ انہوں نے اتنے کم عمری میں ہمارے ملک کے بڑے بڑے غداروں کو پکڑوایا۔۔۔۔۔ ملک کی حفاظت میں اپنی جان تک لگا دیں۔۔۔۔۔ ہمارے ملک کو ایسے ہی دلیر نوجوانوں کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ مجھے خوشی ہیں کہ وہ ہمارے دفاعی سسٹم کا حصہ ہیں۔۔۔۔۔ میری دعا ہیں کہ وہ مزید آگے بڑھے۔۔۔۔۔ اور اسی طرح پوری ایمانداری سے ملک کے لیے خدمات سرانجام دیتے رہے۔۔۔۔۔ میجر شاویز

دلاور۔۔۔" صدر مملکت نے تعریف کی بوچھاڑ کرتے ہوئے شاوینز کا نام پکارا۔ شاوینز مسکراتا ہوا اپنی نشست سے اٹھا۔ یونیفارم کی شکن درست کی۔ اپنی کیپ کا زاویہ برابر کیا اور ہاتھ پہلو میں گرا کر فوجی انداز میں چلتا اسٹیج کے جانب چلنے لگا۔

ہال کی فضاء تالیوں سے گونج اٹھی تھی۔ زرتاشہ بھی مئی کے گود میں بیٹھی اپنے پاپا کے لیے بھر پور تالیاں بجا کر اسے سراہتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔

شاویز اسٹیج پر آیا۔ پیر ہوا میں اٹھاتے ہوئے۔ ہاتھ ہوا میں بلند کر کے پیشانی تک لے جا کر سیلوٹ کر کے صدر مملکت اور ان کے ساتھ موجود آفسران کو احترام پیش کیا۔

صدر صاحب نے اس کا احترام قبول کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا پھر اسے تمغہ امتیاز اور تمغہ جرأت دونوں پیش کئے گئے۔ شاویز سینہ تانے چمکتی آنکھوں سے سراٹھا کر کھڑا تھا۔ صدر مملکت نے اس کے شرٹ پر دونوں تمغے چسپاں کر دیئے۔ شاویز کی آنکھیں بھر

آنے لگی۔ اسے اپنی ماں کی شدید یاد آرہی تھی۔ آخر وہی تو تھی جس کے لیے وہ اس راہ پر آیا تھا۔ صدر صاحب نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس سے پھر مصافحہ کیا تو شاویز نے تیزی سے پلکیں جھپکا کر بھگتی آنکھوں سے آنسو اندر کھینچ لیے۔

خوش دلی سے مسکراتا ہوا وہ واپس مڑا۔ تالیوں کی گونج اب بھی رواں دواں تھی۔ ایک آفسر نے اسے مائنک پر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مائنک پر آیا تو سب خاموش ہو گئے۔ شاویز نے پہلے ایک نظر پورے ہال کو دیکھا۔ دلاور صاحب کی آنکھوں میں تیرتا پانی اسے صاف محسوس ہو رہا تھا۔ صادق صاحب کے لیے بھی یہ کوئی کم خوشی نہ تھی کہ ان کا عزیز بیٹے جیسا جوان آج اپنی کامیابی کو چھو رہا ہے۔ عارفہ تو اپنے شوہر کو اس مقام پر کھڑا دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماء رہی تھی۔

شاویز مائنک اپنے قد کے حساب سے برابر کر کے کنکارا۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہر کام کے جیسے اپنی تقریر کا آغاز اس نے اللہ کے پاک نام سے کیا۔

"سب سے پہلے یہاں موجود سب معزز مہمانوں کو السلام علیکم۔۔۔۔۔" پھر اس نے سب پر

سلامتی بھیجی۔ ہلکی سرگوشی کے انداز میں سب نے اس کے سلام کا جواب دیا۔

"اس وقت اپنے جذبات بیان کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے۔۔۔۔۔ شاید زبان سے

ادا ہونے والے الفاظ۔۔۔۔۔ دل کے احساس کو بیان کرنے کا فی نہ ہو۔۔۔۔۔ "اس نے با اعتماد

لہجے میں تقریر کا آغاز کیا۔

"میری مرحومہ والدہ۔۔۔۔۔ مجھے ہمیشہ شاہ سوار بلایا کرتی تھی۔۔۔۔۔ اس وقت مجھے اس لفظ کے معنی پتا نہیں تھے۔۔۔۔۔ لیکن ان کے زبان سے اپنے لیے یہ لفظ سننا مجھے اچھا لگتا تھا۔۔۔۔۔" وہ باری باری سب کو دیکھتے ہوئے مخاطب تھا

"میرے ارادوں پر کبھی مجھے بھی یقین نہیں تھا۔۔۔۔۔ لیکن میرے کوچ۔۔۔۔۔ میرے سرپرست صادق صاحب کو مجھ پر بھروسہ تھا۔۔۔۔۔" شاویز نے صادق سر کو دیکھتے ہوئے آنکھوں کو جھپکا ان کا شکریہ ادا کیا۔

"کرنے کچھ اور چلا تھا۔۔۔۔۔ ملا کچھ اور۔۔۔۔۔" اس نے اپنے بدلے کو یاد کرتے ہوئے سوچا اور پھر خوشی سے سرشار اپنی فیملی کو دیکھا۔

"بیشک اللہ بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں۔۔۔۔۔ ان کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔۔۔۔۔" وہ سانس لینے کچھ لمحے رکا۔

صدر مملکت اور ہال میں موجود سب ہی اسے بغور سن رہے تھے۔

"شاہ سوار صرف وہ نہیں جو فوجی ہو۔۔۔۔ جو لڑنا جھگڑنا جانتے ہو۔۔۔۔" وہ اب اپنے الفاظ میں شاہ سوار کی تعریف بیان کر رہا تھا۔

"جو بھی دنیا کے حالات کا ڈٹ کا مقابلہ کریں۔۔۔۔ ہر مشکل کو اللہ توکل کر کے پار کر جائے۔۔۔۔ وہ کوئی فوجی ہو یا عام آدمی۔۔۔۔ اپنے آپ میں شاہ سوار ہے۔۔۔ پھر چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔۔۔۔ سب اشرف المخلوقات کو اپنے اندر کے شاہ سوار کو پہچاننا چاہیے۔۔۔۔" وہ میڈیا کے ذریعے نوجوانوں کو ان کے چپے قوت سے روشناس کرا رہا تھا۔

"میری زندگی کے دو ہی اصول ہے۔۔۔۔۔ کام میں ایمانداری اور اس پروردگار عظیم پر
بھروسہ۔۔۔۔۔ یہی ایک کامیاب زندگی کی نسخہ ہے۔۔۔۔۔ میں اپنے سب دعاگو اور

چاہنے والوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔۔۔۔۔ تھینکیو۔۔۔۔۔ آپ سب کا میجر شاویز دلا اور۔" وہ سب کا زیادہ وقت لینے بغیر مختصر سا تقریر دے کر اسٹیج سے اترنے لگا۔ ہال میں ایک مرتبہ پھر سے تالیاں گونجنے لگی۔

اپنے نشست پر جانے کے بجائے وہ پاپا کے پاس آیا ان کے گلے سے لگ گیا۔ پاپا نے مضبوطی سے اسے تھام لیا۔ پھر ایک کے بعد ایک کر کے ماما سے ملا جاوید اور سحر سے بھی مبارک باد وصول کی۔ صائم ویڈیو کال پر اپنے انگریز دوستوں کے ہمراہ بیٹھا آوازیں اور سیٹھیاں مار کر اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ پھر عارفہ سے مل کر وہ دوسری قطار میں گیا اور اڈھیر عمر صادق صاحب کو مضبوطی سے حصار میں لے لیا۔

"ہم جیت گئے صادی بھائی۔" اس نے جوش و خروش سے کہا۔ صادق صاحب نے اس کا کندھا تھپتھپا کر اسے داد دی۔ وہ ابھی ان سے مبارکباد وصول کر رہا تھا جب اس نے پیپا کر کے پکار

سنی۔ زرتاشہ ننھے قدموں سے بھاگتے ہوئے اس کے پاس آرہی تھی۔ شاویز نے جھک کر اپنی ننھی پری کو؛ جو سفید فراک میں بالوں میں سفید کلپس لگائے سچ مچ کی پری لگ رہی تھی، گود میں اٹھالیا۔

"میرے شاہ سوار پایا۔۔۔" زرتاشہ نے اپنے ہینڈ سم میجر پایا کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"میری شاہ سوار بیٹی۔۔۔" شاویز نے معصومیت سے زرتاشہ کے رخسار کو چومتے ہوئے اسے پیار کیا۔

اور اس طرح شاویز نے اپنے سارے بکھرے رشتے اپنی جولی میں سمیٹ لیے تھے۔

ختم شد

جوائن ناول بینک فیس بک گروپ

www.facebook.com/groups/NovelBank

انسٹاگرام پر ناول بینک کو فالو کریں

www.instagram.com/pdfnovelbank